تجھ کو ہم ولی سمجھتے

رحمان مذنب : شخصیت و فن

مُرتّب: ڈاکٹر انور سدید

تجھے ہم ولی سمجھتے

(رحمان مذنب: شخصیت اور فن)

مرتب: ڈاکٹر انور سدید

تجھے ہم ولی سمجھتے
(رحمان مذنب: شخصیت اور فن)
ڈاکٹر انور سدید
رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ، لاہور

کتاب : تجھے ہم ولی سمجھتے (رحمان مذنب: شخصیت اور فن)

مُرتّب : ڈاکٹر انور سدید

زیرِ اہتمام : رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ

۱۸۔غزالی سٹریٹ، مجاہد روڈ، اتحاد کالونی،

علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔۱۸ (پاکستان)

فون: ۷۵۷۰۹۷۲

ای میل۔rehmantrust@hotmail.com

سرورق : محمد طارق مغل

کمپوزنگ : محمد طارق مغل

مطبع : نقوش پریس لاہور

تعداد : ایک ہزار

قیمت :200 روپے

واحد تقسیم کار : نگارشات، میاں چیمبرز

۲۴۔مزنگ روڈ لاہور

فون: 042-7354205,67322892

ای میل۔nigarshat@yahoo.com

انتہائی مخلص، بے غرض اور عظیم ادیب

مولانا صلاح الدین احمد

کے

نام

مندرجات

حصہ اوّل - ذات اور فن

حصہ دوم ۔ مضامین کتابوں پر

حصہ سوم ۔ مضامین ڈراموں پر

حصہ چہارم ۔ انٹرویوز

حصہ پنجم

عرضِ سدید

میں نے رحمان مذنب کا افسانہ ''باسی گلی'' مولانا صلاح الدین احمد کے ممتاز رسالہ ''ادبی دنیا'' میں پڑھا تو مجھے ان پر بہت رشک آیا۔ آپ اسے ''حسد'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان کے افسانے پر مولانا نے ادبی دنیا کے اداریہ میں لکھا تھا، ''رحمان مذنب ہماری بزمِ افسانہ میں پہلی بار شامل ہو رہے ہیں اور دیکھئے کہ اپنی اوّلین شمولیت ہی سے انہوں نے اپنے لئے صدر میں جگہ بنالی ہے۔''

رشک یا حسد کی وجہ یہ تھی کہ 1947ء میں آزادی کے بعد رسالہ ''ہمایوں'' کے مدیر مظہر انصاری مقرر ہوئے تو رحمان مذنب اور یہ ناچیز انور سدید اس پرچے کے معاصر افسانہ نگار تھے لیکن پھر حالات و حوادث کی آندھی ایسی چلی کہ میں افسانے کی دنیا سے غائب ہو کر پاپی پیٹ کے دھندوں میں گم ہو گیا اور رسالہ ''ادبی دنیا'' کے معیار اور مولانا صلاح الدین احمد کی تحسین تک نہ پہنچ سکا۔ دوسری طرف رحمان مذنب ادب کے ریاض میں مصروف رہے اور ''ہمایوں'' کے وسطی دور سے ترقی کرتے ہوئے ''ادبی دنیا'' کے سب سے زرّیں دورِ پنجم کے افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں شامل ہو گئے اور پھر وہ ''اوراق'' کے ممتاز ترین افسانہ نگاروں میں بھی شمار ہوئے جو مولانا کی وفات کے بعد ''ادبی دنیا'' کے ادبی مشن کا علمبردار تھا۔ ادب سے ان کے خلوص نے انہیں مقامِ امتیاز عطا کر دیا۔ مجھے ملال یہ تھا کہ میں ''دو پیسے کی مشقت'' میں ادب کے ریاض سے غافل ہو گیا اور پھر اس صف میں شامل ہی نہ ہو سکا جس کے صدر رحمان مذنب تھے۔

1966ء کے لگ بھگ ڈاکٹر وزیر آغا کی راہنمائی سے ادب کی طرف واپس آیا تو اردو افسانہ مجھ سے مستقل طور پر ناراض ہو چکا تھا۔ بلاشبہ زندگی کے ہر موڑ پر مجھے متعدد کہانیاں بکھری ہوئی نظر آئیں لیکن کوئی کہانی میرا دامن نہ پکڑتی، نہ اظہار کے لئے میرے اندر گھمسان کا رن پیدا کرتی۔ مجھے جوگندر پال یاد آتے جو اکثر کہا کرتے ہیں کہ اچھی کہانی اس وقت کاغذ پر اترتی ہے جب کوئی

واقعہ آپ کے باطن میں کہرام بپا کر دیتا ہے۔ میں اس کہرام سے شاید محروم تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ وزیر آغا صاحب نے مجھے تنقید کی ایک ایسی راہ پر لگا دیا تھا جس میں تخلیقات کا مطالعہ مجھے نئی بصیرت اور معنویت عطا کرتا اور داخلی مفاہیم کی دریافت و بازیافت میں مجھے افسانے کی تخلیق جیسا لطف حاصل ہو جاتا۔ میں نے بلاشبہ اس دور میں بھی "سجدہ سہو" اور "کچی مٹی کا بند" کے عنوانات سے دو افسانے "اوراق" میں لکھے اور یہ پسند بھی کئے گئے اور ان کا ترجمہ رام لال نے ہندی میں اور اشفاق نقوی نے انگریزی میں کیا لیکن سچی بات یہ ہے کہ جب میں اشفاق احمد، رام لال، جوگندر پال، غلام الثقلین نقوی، احمد شریف، جمیلہ ہاشمی، عبدالسلام، بلونت سنگھ، جاویدہ جعفری، سلیم خان گمی، غلام علی چوہدری، رحمان مذنب، ممتاز مفتی، سید امجد الطاف، فرخندہ لودھی، عذرا اصغر، سائرہ ہاشمی، پروین سرور، آغا بابر، محمد منشایاد، اور رشید امجد کو پڑھتا تو احساس ہوتا کہ افسانے کا بھٹکا ہوا یہ راہی بھولے ہوئے راستے پر آ بھی جائے تو اجنبی ہی رہے گا۔ اس لئے میں نے اسے مشورہ دیا کہ اب وہ اپنا راستہ تنقید میں بنا لے تو شاید ادب میں سانس لینے کا جواز نکل آئے۔ تنقید نگاری میرے نزدیک محض نقد و تبصرہ کا فن نہیں بلکہ یہ تخلیق کے وسیلے سے ادب کی داخلی تفہیم اور قاری کی اپنی آگہی کا ایک مؤثر وسیلہ ہے۔ چنانچہ اب میرے اندر سے جو قاری بیدار ہوا، اس نے رحمان مذنب اور ان کے معاصرین کے متعدد نئے زاویئے دیکھنے کا شوق پالا اور تنقید کا یہ شوق اتنا بڑھا کہ وزیر آغا صاحب نے "اوراق" جاری کیا تو "اردو افسانے کے دس سال" کے عنوان سے ایک طویل جائزہ مجھ سے لکھوایا۔ اس مضمون نے بعد میں میرے لئے جائزہ نگاری کی کئی راہیں کشادہ کر دیں اور لطف بے پایاں کے نئے راستے کھول دیئے۔

رحمان مذنب رسالہ "ہمایوں" کے آخری دور میں میرے معاصر تھے، ان کے افسانوں نے میرے ذہن میں ان کا ایک خاص نقش بنا دیا تھا۔ ہرچند وہ "ہاتی گلی" کی خوشبودار عورتوں کے افسانہ نگار تھے لیکن مجھے یوں لگتا تھا کہ ان کے باطن میں ایک معصوم فرشتہ موجود تھا جو اس گندے ماحول کی تمام جزئیات کو دیکھنے، پرکھنے اور ان سے داخلی آگہی کے باوجود معصوم اور پوتر تھا۔ ان سے ملاقات ہوئی تو وہ اس تصویر کا صحیح عکس نظر آئے جو میں نے غائبانہ طور پر اپنے دل میں بنا رکھی تھی۔ وزیر آغا صاحب کے ساتھ کبھی کبھی مجھے بھی سرگودھا سے لاہور آنے کا اتفاق ہوتا تھا۔

وہ سلور گرِل ہوٹل میں کمرہ بک کرانے کے بعد شفیع ڈرائیور کو کہتے:

''ٹکسالی چلو''

ان کے گرد و پیش میں موجود ادیب ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے اور پوچھتے:

''ٹکسالی؟''

آغا صاحب طمانیت سے کہتے ہیں،'' ٹکسالی سے ذرا آگے رحمان مذنب رہتے ہیں، ان سے ''اوراق'' کے لئے افسانہ لینا ہے۔''

میں سنتا تو میرے دل میں رحمان مذنب کی عزت ہزار چند ہو جاتی کہ ان دنوں جو ٹکسالی جاتا تھا، اس پر انگلیاں اٹھتی تھیں۔ آغا صاحب ان سے افسانہ حاصل کرنے کے لئے ٹکسالی تک چلے جاتے تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ رحمان مذنب سے ملاقات ہوتی تو وہ اندر سے جا کر افسانہ تو لے آتے لیکن واپس آ کر کہتے،'' میں آپ کے ساتھ ہی 'سلور گرِل' چلتا ہوں۔''

بہت عرصے کے بعد جب انہوں نے ''اتحاد کالونی'' میں اپنا ذاتی خوبصورت گھر بنالیا تو ایک دن بتانے لگے کہ یہ بات نہیں تھی کہ ان کے سابقہ گھر میں آغا صاحب کو بٹھانے کے لئے ان کے شایانِ شان ڈرائنگ روم نہیں تھا، دراصل میں انہیں ٹکسالی کے ماحول سے جلدی نکال کر واپس سلور گرل کے ماحول میں لانے کا آرزومند ہوتا تھا۔''

مجھے رحمان مذنب کی سادگی اور صاف گوئی اچھی لگی اور پھر جب صابر لودھی اور فرخندہ لودھی نے مجھے ان کے پڑوس میں پانچ مرلے کے ایک ''محل'' میں آباد کر دیا تو میں ان کا ہمسایہ بن گیا۔ غلام الثقلین نقوی کے ساتھ جو صابر لودھی کی گلی میں رہتے تھے ان سے ملاقات روزمرہ کا معمول بن گیا۔ یوں لگتا جیسے ہماری یہ ''ٹرائیو'' آسمانوں پر قائم ہوئی تھی اور اب تو ہمارا بڑھاپا ایک دوسرے کا معاصر بھی ہے اور غم گسار بھی...... اگرچہ غلام الثقلین نقوی ایک کشادہ کالونی میں چلے گئے ہیں اور صرف اسی روز ملتے جب انہیں اپنے پرانے بینک سے پنشن وصول کرنی ہوتی تاہم وہ دن ہمارے لئے روزِ عید ہوتا اور ہم دیر تک ماضی کی یادیں کریدتے اور ادیبوں، ناشروں اور مدیروں کے قصیدے پڑھتے تھے۔

یہ چند ذاتی باتیں میں نے اس لئے پیش کی ہیں کہ گزشتہ نصف صدی کے عرصے میں اب ہمارے درمیان کسی بات کا پردہ نہیں رہا۔ مجھے رحمان مذنب کو دیکھنے، ملنے اور باتیں کرنے کے اتنے مواقع ملے ہیں کہ میں اپنے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا جو وہ میرے بارے میں جانتے ہیں اور ان کے بارے میں مجھے اتنا کچھ معلوم ہے کہ ان پر کچھ لکھتے ہوئے مجھے قطعاً سوچنا نہیں پڑتا۔ قلم اٹھاتے ہی سابقہ واقعات آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں اور وہ افسانہ نگار جسے کبھی میں نے اسی کے افسانوں کے باطن میں دیکھا تھا، میرے سامنے اس تقدس سے آموجود ہوتا ہے جو انہیں بچپن سے اپنے خاندان سے ودیعت ہوا تھا اور جس کو باسی گلی کی خوشبودار عورتیں بھی بدراہ نہیں کرسکی تھیں۔ اب اس ''باسی گلی'' کے بارے میں آپ جو رائے چاہیں قائم کریں میرا احساس ہے کہ رحمان مذنب ''اس گلی'' کے اسی روپ کے افسانہ نگار ہیں جہاں ایک مخصوص معاشرہ اپنی مخصوص اقدار کے سائے میں پرورش پاتا اور پیشے کے تقاضے پورے کرنے کے باوجود اپنی ساختہ قدروں کو ثابت و قائم رکھتا ہے اور تکذیب گوارا نہیں کرتا۔

مجھے یاد آرہا ہے کہ ایک مرتبہ رحمان مذنب مجھے اپنی ایک پرانی شناسا طوائف بی بی جان کے بالا خانے پر لے گئے۔ اس بی بی کا دورِ عروج گزر چکا تھا۔ وقت نے اس کے چہرے پر سینکڑوں تبصرے لکھ رکھے تھے لیکن جو طمانیت اس کے چہرے پر عیاں تھی، وہ بعض اونچے درجے کی عزت دار عورتوں کے ہاں بھی مجھے نظر نہیں آئی۔ رحمان مذنب نے بتایا کہ اب طوائف بی بی جان اس معاشرے کی اکادمی ہے۔ زیرِ تصنیف طوائفوں کو اپنے معاشرے کے رموز و آداب سکھانا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ گفتگو کی بھی ماہر ہے اور اپنے ہر مہمان کے مرتبے کو پہچانتی ہے۔ رحمان مذنب اس کے لئے 1935ء کے دور کا کھلنڈرا لڑکا تھا جو ہیرا منڈی میں پتنگ اڑانے اور کٹی ہوئی پتنگ لوٹنے کے لئے جس بالا خانے پر چاہتا تھا بے دھڑک چڑھ جاتا تھا۔ بوڑھی طوائف جان نے رحمان مذنب سے بچوں جیسا سلوک ہی کیا اور انہیں سابقہ دور کے Nickname سے بلایا۔ لیکن پھر مفتی عبداللہ ٹونکی کے ذکر پر وہ مؤدب ہوگئی اور ان کا نام لینے سے پہلے سر پر دوپٹہ کرلیا۔ نہ جانے کس طرح ذکر آج کے بداطوار زمانے کی طرف چلا گیا۔

طوائف بی بی جان کہنے لگی:

''ہم تو باعزت لوگ ہیں، یہاں آنے والے اپنی عزت گھر چھوڑ کر آتے ہیں۔''

میرے کان کھڑے ہو گئے'' کیا طوائف بھی اپنی ''عزت'' کا احساس رکھتی ہے؟''......

بی بی جان نے اضطراب بھانپ لیا اور بولی:'' یہ بازار ہمارا ہے۔اس بازار کے آداب ہمارے ہیں،اس کی اقدار ہماری ہیں۔ کسی کو یہ آداب و اقدار توڑنے کی اجازت نہیں۔ہم نے دکان سجا رکھی ہے ..... گاہک خود چل کر آتا ہے۔اپنے مطلب کا مال خریدتا ہے، ہماری مرضی کے پیسے دیتا ہے اور پھر تازہ دم ہو کر چلا جاتا ہے...... اور اب شہر کی حالت کیا ہے؟ بیشتر اونچے درجے کے گھروں میں بالا خانے کھل گئے ہیں، لالچی لڑکیاں بغل میں کتابیں تھامے بس اسٹاپ پر، ہوٹل کے باہر یا سینما کی کھڑکی کے قریب گاہک پھانس رہی ہوتی ہیں۔سینما کے ایک ٹکٹ پر عزت گنوا بیٹھتی ہیں اور ملال تک نہیں کرتیں۔آج کی طوائف دھندا چھپ چھپ کر کرتی ہے۔ ہمارا ماحول شفاف ہے۔آپ بتائیے کون عزت دار ہے؟''

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اور رحمان مذنب تو پہلے ہی اس معاشرے کو انسانی زندگی پر تہمت قرار دینے کے باوجود اس دریافت میں مگن رہتے تھے کہ دنیا کے اس سب سے قدیم پیشے کو جنم کس نے دیا؟ اس جسم فروشی کا ذمہ دار کون تھا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے انہوں نے ''یونان کا عہدِ جاہلیت اور دیو مالا کا ارتقا'' کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ لکھا اور یہ دریافت کرنے کی کوشش کی کہ '' دنیا کی پہلی طوائف'' کب معرضِ وجود میں آئی تھی؟ اس موضوع کی دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے اساطیر اور ساحری کی تحقیق کا بیڑہ اٹھایا تو جادو اور جادو کی رسوم کے پاتال میں اتر گئے۔اس سرگردانی کے دوران ان کے باطن سے وہ نور ازل جاگا جو انہیں موروثی طور پر اپنے بزرگوں سے ملا تھا تو انہوں نے ''گلوری آف اسلام'' کا ترجمہ ''مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے'' کے نام سے کیا۔ان کی دو کتابیں ''بنگی جان'' اور ''بالا خانہ'' طوائف کے معاشرے کی آئینہ دار ہیں۔لیکن ایک کتاب ''رام پیاری'' ایسے افسانوں پر مشتمل ہے جس کے کردار تاریخ میں سفر کرتے اور انسانی زندگی کے روشن زاویوں کو منفرد انداز میں سامنے لاتے ہیں۔رسالہ ''علامت'' میں انہوں نے ''گھر کا رانجھا'' اور ''بیوہ'' جیسے افسانے لکھے جو عام معاشرے کے افسانے ہیں اور جن میں طوائف کا معاشرہ موجود نہیں؟

ایک طویل عرصے سے انہیں صرف "طوائف کے معاشرے" کا افسانہ نگار شمار کیا جاتا رہا۔ رحمان مذنب نے اس بات کو کبھی الزام سمجھا نہ اس میں پھبتی کا زہر خند محسوس کیا بلکہ جب ان کا موازنہ سعادت حسن منٹو سے کیا جاتا اور لوگوں کی بھنویں تن جاتیں تو وہ اپنا دفاع اپنے فن کے مضبوط حربوں سے کرتے اور پھر مرزا ہادی حسن رسوا، پریم چند، قاضی عبدالغفار، ایم اسلم، قاری سرفراز حسین، غلام عباس، آغا بابر، حتیٰ کہ فرخندہ لودھی کی تحریروں سے طوائف نگاری کے زاویے سامنے لاتے اور ثابت کرتے کہ ایک ہی موضوع کو متعدد افسانہ نگار کن زاویوں سے دیکھتے اور موضوع کا سینہ کس طرح نئے انداز سے عریاں کرتے ہیں۔ ہر افسانہ نگار معاشرے کو اپنے مخصوص زاویہ نظر سے دیکھتا اور اپنی ٹیکنیک میں پیش کرتا ہے۔ رحمان مذنب کا موقف یہ تھا کہ افسانہ نگار نے موضوع کو کس طرح استعمال کیا۔ اس کے ساتھ سلوک کیسا کیا؟ اور اسے کس ٹیکنیک میں آشکار کیا ہے...... ایک طویل عرصے تک ادبی دنیا میں اس سوال پر غصے اور ناراضی کا اظہار کیا جاتا رہا کہ

"کیا رحمان مذنب سعادت حسن منٹو سے بڑا افسانہ نگار ہے؟"

رحمان مذنب نے اس سوال کا جواب پامردی سے دیا اور اپنے فن کا جھنڈا بلند رکھا لیکن اصل حقیقت وزیر آغا نے واضح کی کہ سعادت حسن منٹو اس طوائف کا افسانہ نگار ہے جس کے باطن میں معاشرے کی باوقار عورت بننے اور خانہ دار خاتون کا بلند مقام حاصل کرنے کی آرزو زندہ ہے۔ منٹو نے اسی طوائف کی مظلومیت کو آشکار کیا ہے۔ اس کے برعکس رحمان مذنب اس معاشرے کا افسانہ نگار ہے جس میں طوائف پیدا ہوتی ہے، پلتی بڑھتی اور پیشے کے تقاضے پورے کرتی ہے اور پھر بڑے خلوص سے اپنا پیشہ اگلی نسل کو سونپ دیتی ہے۔ اس کے دل میں خانہ دار یا گھریلو عورت بننے کی آرزو جنم ہی نہیں لیتی۔ اگر یہ آرزو پیدا ہوتی ہے تو طوائف کا معاشرہ اسے غیر حقیقی قرار دیتا ہے۔ چنانچہ رحمان مذنب نے اس معاشرے کو اس کی اپنی وضع کردہ قدروں کے ساتھ پیش کیا۔ طوائف ان کا موضوع ہے لیکن ان کا موضوع منٹو کے موضوع سے الگ بھی ہے اور شاید وسیع بھی ہے۔ موضوع کی مطابقت کے باوجود ان دونوں کے افسانوں کی ٹیکنیک اور کرداروں کا عمل اور ردِ عمل مختلف نوعیتوں کا ہے اور ان کا موازنہ درست نہیں ہے اور نہ اسے ہم طرح غزل شمار کیا جاسکتا ہے۔

رحمان مذنب کے افسانے ان کے اپنے مشاہدے اور مطالعے کے سچے عکاس ہیں اور اب جبکہ طوائف کے معاشرے کی قدریں بھی ٹوٹ گئی ہیں اور طوائف نے ہیرا منڈی سے نقل مکانی کر کے شہر کے پوش علاقوں میں اپنی ''گناہ گاہیں'' قائم کر لی ہیں تو رحمان مذنب کے افسانے اس خوابیدہ دور کی تاریخ بھی بن گئے ہیں جو کچھ عرصے کے بعد صرف ان کے افسانوں میں دستیاب ہوگی۔

یہ سطور لکھتے وقت مجھے آغا بابر یاد آ رہے ہیں، وہ زندگی کے آخری دور میں لاہور تشریف لائے تو ''علامت'' کے مدیر شیخ محمد سعید نے ان کے اعزاز میں ایک محفل اپنے گھر پر منعقد کی۔ آغا بابر (خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) مجلس آرائی کے ماہر تھے۔ جب بولنے لگتے تو یادوں کے میلے لگ جاتے لیکن اس روز انہوں نے رحمان مذنب کو کریدنا شروع کیا تو انہوں نے آزادی سے پہلے کی چند طرح دار اور وضعدار طوائفوں کا تذکرہ اس جمال آرا انداز میں کیا کہ آغا بابر ہر واقعے پر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ یہ بڑی دلچسپ محفل تھی۔ آغا بابر ہی نہیں محترم اعجاز حسین بٹالوی نے بھی اپنی یادوں کے سفینوں کو کھلے سمندروں میں چھوڑ دیا تھا اور وہ لکھنؤ کی چند نامی گرامی طوائفوں کا تذکرہ شہر میں کر رہے تھے۔

محفل ختم ہوئی تو آغا بابر رحمان مذنب سے بولے:

''آپ سے ایک مؤدبانہ درخواست ہے''

رحمان مذنب چونکتے ہو گئے، یہ اسلوبِ گزارش آغا بابر کا نہیں تھا۔ بولے:

''فرمایئے، میں تعمیلِ ارشاد کے لئے حاضر ہوں۔''

آغا بابر نے کہا، ''رحمان مذنب! آپ نے جو باتیں آج اس محفل میں سنائی ہیں، یہ سب قلم بند کر دیں۔'' اور پھر گلوگیری آواز میں بولے، ''جو مشاہدہ آپ کا ہے وہ کسی کا نہیں ہے۔ یہ تاریخ کی امانت ہے آپ یہ امانت قوم کے سپرد کر دیں۔''

رحمان مذنب نے وعدہ کر لیا، اس کے بعد آغا بابر کے خط نیویارک سے آنے لگے۔ وہ ہر خط میں دریافت کرتے:

''رحمان مذنب صاحب نے کتنا کام کر لیا ہے؟''

اس سوال کا جواب اب رحمان مذنب سے کون طلب کرے گا۔ سوال کرنے والے

آغا بابر خود اگلے جہان کو چل دیئے ہیں لیکن ان کی یہ بات زندہ ہے کہ ''رحمان مذنب سے زیادہ طوائف کے معاشرے کا آشنا اور کوئی نہیں ہے۔''

............O............

معاف کیجئے، میں ''عرضِ سدید'' مختصر لکھنا چاہتا تھا لیکن شوق نے بات بڑھا دی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ جب میں نے ''ڈاکٹر وزیر آغا ایک مطالعہ'' لکھی تو آرزو پیدا ہوئی کہ اس قسم کی مزید کتابیں دوسرے نامور ادیبوں پر بھی لکھی جانی چاہئیں۔ اس کتاب نے ہی مجھے ''مولانا صلاح الدین احمد'' پر ایک اور کتاب لکھنے کا ارادہ بندھوایا لیکن اس کے لئے اوّل الذکر دو کتابوں جیسی ''منصوبہ بندی'' نہیں کی گئی تھی نہ اس کا باضابطہ خاکہ بنایا تھا، تاہم حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ تیس برس کے دوران میں نے رحمان مذنب پر بہت کچھ لکھا، ان کی کتابوں پر تبصرے کئے، جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا تو میں ان پر کالم لکھتا۔ اب جبکہ میری عمر کا پیمانہ لبریز ہونے والا ہے تو سوچا کہ اس مواد کو جو لالۂ خودرو کی طرح پیدا ہوتا رہا اور اب تک بکھرا ہوا ہے، جمع کر دینا چاہیے، پھر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ رحمان مذنب پر چند دوسرے اصحابِ گرامی مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا، ریاض احمد، صابر لودھی، غلام الثقلین نقوی، سلیم خان گمی اور گل نوخیز نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ کیوں نہ ان کی کچھ منتخب تحریریں بھی اس کتاب میں جمع کر دوں۔ یہ کتاب اس آرزو کی تکمیل ہے اور مجھے خوشی ہے کہ جس طرح وزیر آغا، مولانا صلاح الدین احمد اور دلآور فگار پر پہلی جامع کتاب میں نے لکھی، اس طرح رحمان مذنب پر یہ کتاب پیش کرنے کا اعزاز بھی مجھے حاصل ہو رہا ہے۔ اس اعزاز پر میں جتنا فخر کروں کم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اربابِ علم اسے عنایت کی نظر سے دیکھیں گے۔

لاہور 21 اپریل 1999ء

انور سدید
172۔ ستلج بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور

آثارِ زندگی

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

نام: مفتی عزیز الرحمان

قلمی نام: رحمان مذنب

پیدائش: ۱۵ جنوری ۱۹۱۵ء بمقام لاہور مغربی پنجاب

تاریخ وفات: ۱۶ فروری ۲۰۰۰ء

تعلیم: ایف۔اے، دیال سنگھ کالج، لاہور ۱۹۳۷ء

ابتدائی تعلیم لاہور میں پائی۔ میٹرک سنٹرل ماڈل ہائی سکول لاہور سے ۱۹۳۳ء میں کیا۔ انٹر اسلامیہ کالج، سول لائنز لاہور سے کر کے دیال سنگھ کالج میں بی اے میں داخلہ لیا لیکن تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور اپنے والد مفتی عبدالستار کے زیرِ نگرانی بادشاہی مسجد لاہور کے دار الفتاویٰ میں دینی تعلیم حاصل کرتے رہے۔

مختصر حالاتِ زندگی

رحمان مذنب کی جائے پیدائش لاہور کے ٹکسالی دروازے کی اونچی مسجد سے ملحقہ مکان تھا۔ آپ کے والد شاہی مسجد لاہور کے دار الفتاویٰ کے مفتی تھے اور لاہور میں ان کا فتویٰ چلتا تھا۔ مفتی عبدالستار کا بیشتر وقت فقہی کتب کے مطالعہ، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزرتا۔ رحمان مذنب کے نانا شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی بہت بڑے عالم اور اورینٹل کالج میں عربی ادبیات کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تھے اور ۱۹۲۳ء میں لگ بھگ تیس سال پڑھانے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی میں چلے گئے۔

رحمان مذنب کے آباؤ اجداد ہند میں اسلام پھیلانے کی غرض سے عربستان سے آئے اور راجپوتانہ (ہندوستان) میں قیام کیا۔ سکھوں کے خلاف جہاد کے لیے جب سیّد احمد شہید بالاکوٹ آئے تو ان کے رفقاء میں رحمان مذنب کے بزرگ بھی تھے جو بالاکوٹ کے معرکے میں شہید ہوئے۔ آج بھی ان کی قبریں وہاں موجود ہیں۔ راجپوتانہ سے رحمان مذنب کے بزرگوں کی لاہور آمد لگ بھگ 1841ء کی ہے۔ یہ لوگ پرانے لاہور میں آباد ہوئے اور ان کی آبائی جنگی حویلی آج بھی محلہ سمیاں، اندرون بھاٹی گیٹ خاصی بہتر حالت میں موجود ہے۔

رحمان مذنب کو لاہور سے بہت محبت تھی۔ وہ لکھتے ہیں:-

''لاہور میرا وطن ہے۔ میں یہیں کی غلیظ گلی کوچوں، خاک آلود اور بدبودار محلوں میں کھیلا اور پروان چڑھا۔ آج بھی وہ دن سہانے سویروں کی طرح جگمگا رہے ہیں جب ہماری ٹولی نہر کی نرم نرم اور چکنی چکنی روشوں پر لٹو گھمانے، سڑکوں کے بیچوں بیچ کیڑی کاڑا کھیلنے، پتھر پھینک پھینک کر بیر توڑنے، ٹہنیاں ہلا ہلا کر سنگترے توڑنے، انار، نارنگیاں اور شہتوت جھاڑنے، املتاس اور جامنیں اتارنے، چیچو چیچ گنڈیریاں، کبڈی اور آنکھ مچولی کھیلنے، پتنگ اڑانے، لنگر لڑانے، اجنبیوں کی پگڑی اچھالنے، کلفے والوں کو لوٹنے، کپڑے پھاڑنے اور ڈھول پھانکنے میں معروف رہتی۔ جب ہم کھیلتے تو ہمیں ساری دنیا کھلنڈرا نظر آتی اور اپنی سُدھ بُدھ بھی نہ رہتی۔ معصوم شعور وقت کی رفتار اور اس کی ہستی سے مکر جاتا۔ قیامتیں گزر جاتیں اور کانوں کان خبر نہ ہوتی۔''

اوپر دیا ہوا پیرا ان کے افسانوں کے مجموعے ''خوشبودار عورتیں'' سے ان کے مضمون ''برگ آہن'' سے لیا گیا ہے جو کہ ان کی آپ بیتی کا ایک خوبصورت باب ہے۔

رحمان مذنب وسیع المطالعہ اور قلم پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ ان کے قلم سے شائد ہی کوئی موضوع بچا ہو لیکن بڑا نام انھوں نے افسانے اور اساطیری علوم میں پایا۔ آپ کے موضوعات قرآنیات، سیرت رسول مقبولؐ، افسانہ، ڈرامہ، ناول، ڈرامے اور تھیٹر کی تاریخ، اساطیری علوم، شاعری، ماحولیات، اقبالیات، سوشل انتھروپولوجی، پنجابی ادب اور پاکستان تھے۔ بوطیقا کو پنجابی میں منتقل کیا۔ شوقِ آوارگی انھیں ملک کے طول و عرض سے دور لے گیا۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور میں مقیم رہے، سرکاری ملازمت بھی کی۔ انفارمیشن منسٹری میں بطور

انفارمیشن آفیسر راولپنڈی میں تعینات رہے اور پھر واپڈا میں جب محکمہ تعلقات عامہ بنایا گیا تو بطور پبلک ریلیشن آفیسر لاہور آ گئے۔ جنوری ۱۹۷۲ء میں ریٹائر ہوئے۔

رحمان مذنب کا قلم اور کتاب کے علاوہ کوئی خاص مشغلہ نہ تھا البتہ کرکٹ ٹی وی پر ضرور دیکھتے اور بسنت کے دنوں میں پتنگ بازی سے شغل فرماتے۔ ٹی وی پر ۲۶ اقساط پر مشتمل پنجابی سیریل ''پتن'' تیرہ اقساط پر مبنی ''ویہڑہ'' اور اردو سیریل ''تکون'' لکھیں۔ ان کی وفات کے بعد ۱۱۳ اقساط پر مشتمل ٹی وی سیریل ''سفر'' چلا۔ پی ٹی وی پر بچوں کے لیے ''الف لیلیٰ'' سیریز کے لیے رحمان مذنب کے لکھے ہوئے ڈراموں کو تادیر یاد رکھا جائے گا۔ ریڈیو پر ان کے بے شمار ڈرامے اردو و پنجابی فیچرز اور بچوں کی بے شمار کہانیاں نشر ہوئیں۔ ریڈیو پر اردو اور پنجابی فیچر شروع ہی انہوں نے کیے۔ آپ کا تعلق ریڈیو سے بہت پرانا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے آپ کے ڈرامے ہندوستان کے مختلف ریڈیو سٹیشنوں سے نشر ہوتے رہے۔ آپ کے افسانے کے بارے اردو ادب کی کہکشاں میں سے چند قد آور شخصیات کے تاثرات درج ذیل ہیں:۔

''رحمان صاحب اپنی نگاہ جویاں سے جو کچھ واقعتہً دیکھتے ہیں اسے عین مین اسی طرح اپنے ناظرین تک پہنچا دیتے ہیں۔ تخلیق اور ابلاغ کے درمیان اتنی بات البتہ ان کی ملحوظ نظر رہتی ہے کہ جب ان کے مشاہدے کی شیشم نگار اظہار تک پہنچے تو گرد و پیش کی فضا ایک کیفِ بے نام سے معمور ہو جائے۔ خلوص اور حسنِ اظہار کا یہ امتزاج بہت کم فنکاروں کو نصیب ہوا ہے اور جنھیں ہو گیا ہے وہ اس سے کبھی محروم نہیں ہوتے کہ فن کی دنیا میں صداقت کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔''

(مولانا صلاح الدین احمد ''ادبی دنیا'' لاہور)

''تقسیم کے بعد اردو افسانے کے انحطاط و زوال کی کہانی آج زبان زدِ خاص و عام ہے اور چونکہ بات چل پڑی ہے اس لیے وہ لوگ بھی جو دوسروں کے اخذ کردہ نتائج کو عام طور سے قبول کر لینے کے عادی ہیں افسانے کو زوال آمادہ قرار دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے ایسے لوگوں کو رحمان مذنب کے افسانے پڑھنے چاہئیں تا کہ وہ محسوس کر سکیں کہ تقسیم کے بعد بھی اردو افسانہ نے ارتقاء کی بہت سی منازل طے کی ہیں اور اس میں کردار نگاری کے علاوہ جزئیات نگاری کی ایک ایسی روش پیدا ہوتی ہے جو اردو افسانے کے مستقبل کے لیے ایک نیک فال ہے۔'' (ڈاکٹر وزیر آغا)

''رحمان مذنب کے افسانے فن کے نمائندہ نمونے اور ادب کے قیمتی شہ پارے ہیں۔
رحمان مذنب کا اندازِ تحریر شگفتہ، رواں، بے ساختہ اور متحرک ہے۔اس کی تشبیہات اور استعاروں میں ندرت اور جاذبیت ہے اور انھیں زندگی کے تجربے ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔انھوں نے طوائف کے معاشرے کو اس حقیقت نگاری اور توازن فکری سے پیش کیا گیا ہے کہ اردو کے بیشتر افسانہ نگار اس میدان میں رحمان مذنب کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔'' (انور سدید، ''بالا خانہ'')

''رحمان مذنب اپنے کردار عموماً نچلے اور مظلوم طبقے سے تلاش کرتا ہے جن کے ارد گرد وہ افسانے کا تانا بانا بنتا ہے۔ بالخصوص طوائف کے کردار کا اس نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے حالانکہ اس موضوع پر اچھے اچھے لکھنے والے کچھ بہک سے جاتے ہیں لیکن رحمان مذنب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔وہ سمجھتے ہیں کہ سوسائٹی کا یہ حقیر اور ذلیل طبقہ جسے طوائف کے نام سے پکارا جاتا ہے انسانیت کے حق میں ایک طاعونی پھوڑے سے کسی طرح کم نہیں لیکن اس طاعون کو کیسے روکا جا سکتا ہے۔شائد رحمان مذنب کی تحریریں اس کا جواب دے سکیں۔'' (سید عطا اللہ شاہ ہاشمی، مدیر اعلیٰ ہفت روزہ ''مصور'' لاہور، بمبئی۔ ۱۴ جولائی 1951ء)

''اردو افسانے میں جہاں انحراف کی کئی شکلیں ہیں —— ابہام، تجریدیت اور علامت وغیرہ، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا رجحان جدید رویے کی شکل میں موجود رہا ہے۔جس کے نمائندہ قرۃ العین حیدر، رحمان مذنب، جوگندر پال وغیرہ ہیں۔ان سب کے یہاں (جوگندر پال کو چھوڑ کر) فکر اور فارم کی CLARITY ہے۔'' (رام لال، ''اوراق'' جنوری، فروری ۱۹۷۷ء)

''رحمان مذنب ایک بلند پایہ ادیب، انتہائی بے باک اور گہری نظر رکھتے ہیں۔
ان کا اندازِ بیاں ایسا با کمال ہے۔جس کا مقابلہ ہی نہیں۔رحمان مذنب کے بغیر اردو ادب کبھی اس ارفع مقام پر نہ ہوتا جیسا کہ اب ہے۔'' (ڈاکٹر شمیم حنفی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی ۲۰۰۲ء)

رحمان مذنب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تیسری جنس، پیشہ کرانے والی عورت اور شہوت میں بھٹکتے ہوئے افراد کی نفسی کیفیات کو ان تمام تر جزئیات اور تاریخی پس منظر کے ساتھ اپنے افسانوں میں سمیٹنے کا جتن کیا ہے۔بطور افسانہ طراز، رحمان مذنب اپنے پسندیدہ لینڈ اسکیپ (خصوصاً ہیجڑوں کی بیٹھک یا چکلے) پر چھوٹا کھیل نہیں کھیلتے، بڑی بازی لگاتے ہیں جس کے طفیل

ان کا قاری، ہیجڑے، طوائف اور تماشبین کے علاوہ نوسرباز، کبابیے، جیب تراش، دلے اور سفید کپڑوں میں پولیس کے کارندوں کی حقیقت تک پہنچتا ہے۔اس خصوص میں رحمان مذنب کے ''پتلی جان''، ''گشتی''، ''لال چوبارہ''، ''چڑھتا سورج''، ''باسی گلی''، ''بالا خانہ'' اور ''گوری گلاباں'' لازوال افسانے ہیں۔

اوّلین تحریر: ڈراما: ''جہاں آراء'' عزیز تھیٹر موجودہ پاکستان ٹاکیز، اندرون ٹکسالی گیٹ، لاہور ۱۹۳۴ء میں کھیلا گیا۔''

اوّلین افسانہ: ''آخری رقص''، عالمگیر لاہور ۱۹۳۷ء

قلمی آثار (مطبوعات):

۱۔ ''بیورج پلان'' مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۴۰ء
۲۔ ''ترقی پسند ادب کا مسئلہ'' مطبوعہ ناشرین، ۱۹۵۲ء
۳۔ ''جادو اور جادو کی رسمیں'' (اساطیر) مطبوعہ ''ناشرین'' لاہور ۱۹۵۹ء
۴۔ ''داستانِ آب وگل'' ناشرین لاہور، دسمبر ۱۹۶۰ء
۵۔ ''دنیا کے نامور جاسوس'' فیروز سنز ۱۹۶۸ء
۶۔ ''دیہی ساحری'' (اساطیر) باراول ۱۹۶۸ء
۷۔ ''دریا، نہریں اور بند'' (ترجمہ واضافہ) شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۰ء
۸۔ ''تندرستی اور لمبی عمر'' فیروز سنز، ۱۹۷۴ء
۹۔ ''یوگا اور تندرستی'' فیروز سنز، ۱۹۷۶ء
۱۰۔ ''روس میں اسلام کا خطرہ'' فیروز سنز لمیٹڈ، باراول: ۱۹۸۱ء
۱۱۔ ''بوطیقا'' (پنجابی) پنجابی ادبی بورڈ، لاہور، باراول: ۱۹۸۸ء
۱۲۔ ''اسلام اور جادوگری'' مقبول اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۰ء
۱۳۔ ''پتلی جان'' (افسانے) باراول ۱۹۹۱ء، رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ باردوم: ۲۰۰۲ء
۱۴۔ ''رام پیاری'' (افسانے) باراول ۱۹۹۱ء رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ باردوم: ۲۰۰۳ء

۱۵۔ ''بالا خانہ'' (افسانے) بار اول ۱۹۹۲ء رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ بار دوم: ۲۰۰۳ء

۱۶۔ ''لارنس سے ماتا ہری تک'' جنگ پبلشرز، بار اول: ۱۹۹۳ء

۱۷۔ ''قتل کے چند تاریخی مقدمے'' جنگ پبلشرز، بار اول: ۱۹۹۷ء

۱۸۔ ''خوشبودار عورتیں'' (افسانے) رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ بار اول: ۲۰۰۲ء

۱۹۔ ''باسی گلی'' (ناول) رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ بار اول: ۲۰۰۲ء

۲۰۔ ''گلبدن'' (ناول) رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ بار اول: ۲۰۰۲ء

۲۱۔ ''مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے'' (ترجمہ) انعام یافتہ برائے سال ۱۹۷۱ء، بار اول ۱۹۷۱ء
رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ بار دوم: ۲۰۰۲ء

۲۲۔ ''پنجرے کے پنچھی'' (افسانے) زیرِ طبع بہ اہتمام رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ

۲۳۔ ''محمد ﷺ (سیرت رسول)'' زیرِ طبع بہ اہتمام رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ

۲۴۔ ''بلالؓ '' (ترجمہ) زیرِ طبع بہ اہتمام رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ

۲۵۔ ''ڈرامے اور تھیٹر کی عالمی تاریخ'' (مقالے) زیرِ طبع بہ اہتمام رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ

۲۶۔ ''بلھے شاہ کی شاعری اور اس کا نظریہ تصوف'' زیرِ طبع بہ اہتمام رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ

۲۷۔ ''گوری گلاباں'' (ناول) زیرِ طبع بہ اہتمام رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ

۲۸۔ ''کانچ کے پتلے'' (ڈرامے) زیرِ طبع بہ اہتمام رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ

۲۹۔ ''کلامِ مذنب'' زیرِ طبع بہ اہتمام رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ

مقالات (انتخاب):

۱۔ ''پنجاب کی فلم کمپنیاں'' مطبوعہ ''پارس'' ویکلی ۱۷ اپریل ۱۹۳۵ء

۲۔ ''عالمگیر امن'' (''سماجیات'' از سر ولیم بیورج کا ترجمہ)، مطبوعہ ''جامعہ'' دہلی، ۱۹۴۱ء

۳۔ ''میرا سیاسی عقیدہ'' ترجمہ مقالہ از جی لوز ڈکنسن، مطبوعہ ''جامعہ'' دہلی، اکتوبر ۱۹۴۳ء

۴۔ ''ملتِ اسلامیہ کا نیا دور'' مطبوعہ ماہنامہ ''شکر گنج'' لاہور دسمبر ۱۹۴۶ء

۵۔ ''پاکستان کا آئین'' روزنامہ ''نوائے وقت'' ۲۳ اگست ۱۹۴۷ء

۶۔ ''جمال الدین افغانی کا مشن'' مطبوعہ ماہنامہ ''پیغامِ حق'' جولائی ۱۹۴۸ء

۷۔ ’’اقبال اور کیموزم‘‘ مطبوعہ ’’قندیل‘‘ ہفت روزہ، ۱۷ مئی ۱۹۴۹ء

۸۔ ’’روس، دنیا اور پرولتاری آئین‘‘ ماہنامہ ’’ادبِ لطیف‘‘ لاہور نومبر ۱۹۴۹ء

۹۔ ’’خلافت اور ملوکیت کی پہلی آویزش‘‘ مطبوعہ روزنامہ ’’زمیندار‘‘ ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۹ء

۱۰۔ ’’ادب کا صحیح نظریہ‘‘ مطبوعہ ماہنامہ ’’ہمایوں‘‘ لاہور، دسمبر ۱۹۵۰ء

۱۱۔ ’’اقبال اور تحریکِ احیاء‘‘ مطبوعہ ’’نظام‘‘ ویکلی ۱۶ اپریل ۱۹۵۰ء

۱۲۔ ’’اقبال کے سیاسی نظریے‘‘ مطبوعہ ’’صحیفہ‘‘ دیال سنگھ کالج لاہور، ۱۹۵۴ء

۱۳۔ ’’شاعری اور ڈراما‘‘ (ترجمہ، ٹی ایس، ایلیٹ) مطبوعہ ’’ساقی‘‘ کراچی، سالنامہ ۱۹۵۶ء

۱۴۔ ’’ڈرامے کے تاریخی محرکات اور مہیجات‘‘ (مقالہ) مطبوعہ ’’ماہِ نو‘‘ کراچی، جولائی ۱۹۵۶ء

۱۵۔ ’’ڈرامے کی ابتداء‘‘ (مقالہ) مطبوعہ ’’اقبال‘‘ لاہور، اکتوبر ۱۹۵۷ء

۱۶۔ ’’ترقی پسند ادب کا مسئلہ‘‘ (تنقید) مطبوعہ ’’ناشرین‘‘ لاہور، ۱۹۵۷ء

۱۷۔ ’’اقبال کے شعر میں وحدت کا تصور‘‘ ماہنامہ ’’آبادکار‘‘ مئی ۱۹۵۹ء

۱۸۔ ’’یونان کا تھیکر‘‘ (مقالہ) مطبوعہ ’’اقبال‘‘ لاہور، اکتوبر ۱۹۶۰ء

۱۹۔ ’’اقبال کا پیغام‘‘ مطبوعہ ’’سیارہ‘‘ ماہنامہ لاہور، مئی ۱۹۶۲

۲۰۔ ’’ادب مذہب اور اقبال‘‘ مطبوعہ ماہنامہ ’’دستور‘‘ لاہور

۲۱۔ ’’ادب میں شخصیت کا پرتو‘‘ سہ ماہی ’’ادبی دنیا‘‘ جنوری ۱۹۶۲ء

۲۲۔ ’’جادو اور دیومالا‘‘ مطبوعہ ماہنامہ ’’علم‘‘ لاہور مارچ ۱۹۶۲ء

۲۳۔ ’’یونان کا عہدِ جاہلیت اور دیومالا کا ارتقاء‘‘ (مقالہ) مطبوعہ ’’اقبال‘‘ لاہور، اکتوبر ۱۹۶۴ء

بچوں کا ادب (انتخاب):

۱۔ ’’نور پور کی بستی‘‘ ۱۹۷۲ء ناشرین

۲۔ ’’لکڑہارا اور چور‘‘ ۱۹۶۴ء ناشرین

۳۔ ’’فرعون کا خزانہ‘‘ ۱۹۷۷ء ٹیکنیکل پبلشرز

۴۔ ’’لوہے کا آدمی‘‘ ۱۹۷۶ء ٹیکنیکل پبلشرز

۴۔ ''بھورے خان اور بھیڑیا'' ۱۹۷۰ء سن رائز پبلی کیشنز

۵۔ ''الف لیلےٰ سیریز'' ۱۹۷۳ء ٹی وی پبلیشر

۶۔ ''الف لیلےٰ سیریز'' ۱۹۸۶ء مقبول اکیڈمی

اعزاز:

۱۔ پاکستان رائٹرز گلڈ ادبی انعام برائے ''لکڑہارا اور چور'' (ناولٹ) ۱۹۶۴ء

۲۔ ترقی ادبی بورڈ، کراچی، ادبی انعام برائے ''لکڑہارا اور چور'' (ناولٹ) ۱۹۶۴ء

۳۔ پاکستان سائنس بورڈ، اول انعام برائے ''وادیٔ سندھ اور اس کا ماحول''

۴۔ پاکستان رائٹرز گلڈ ادبی انعام برائے ''مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے'' ۱۹۷۱ء

o

برگِ آہن

رحمان مذنب

میری ولادت پہلی عالمگیر جنگ کے آخری ایام میں ہوئی اور جن دنوں طاعون کی وبا پھیلی، میں ہوش سنبھال چکا تھا۔ مجھے یہ مہلک قیامت بھول نہیں سکتی کیونکہ اسکے ہاتھوں میرے نوجوان اور شکیل بھائی عبدالحیٔ کی موت واقع ہوئی۔ میری والدہ مہینوں اسکی یاد میں آنسو بہاتی رہیں۔

لاہور میرا وطن ہے۔ میں یہیں کے غلیظ گلی کوچوں، خاک آلود اور بدبُو دار محلوں میں کھیلا اور پروان چڑھا۔ آج بھی وہ دن سُہانے سویروں کی طرح جگمگا رہے ہیں جب ہماری ٹولی نہر کی نرم نرم اور چکنی چکنی روشوں پر لٹو گھمانے، سڑک کے بیچوں بیچ گیڑی کاڑا کھیلنے، پتھر پھینک پھینک کر بیر توڑنے، ٹہنیاں ہلا ہلا کر سنگترے توڑنے، انار، نارنگیاں اور شہتوت جھاڑنے، املتاس اور جامنیں اُتارنے، چیچو چیچ گنڈیریاں، کبڈی اور آنکھ مچولی کھیلنے، پتنگ اڑانے، لنگر لڑانے، اجنبیوں کی پگڑی اُچھالنے، کلچے والوں کو لُوٹنے، کپڑے پھاڑنے اور دھول پھانکنے میں معروف رہتی۔ جب ہم کھیلتے تو ہمیں ساری دنیا کھلنڈرا نظر آتی اور اپنی سُدھ بُدھ بھی نہ رہتی۔ معصوم شعور وقت کی رفتار اور اس کی ہستی سے مکر جاتا۔ قیامتیں گزر جاتیں اور کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

کانچ کی سفید اور رنگ برنگی گولیوں پر دم دیتا تھا۔ جہاں خالی جگہ دیکھی کھتی (گتی) کھود لی اور پل گولی کھیلنے لگ گئے۔ آنٹے سے نشانہ باندھا اور زن سے گولی اڑا دی۔ بچوں کا یہ انٹرنیشنل کھیل ہے۔ بڑے بوڑھے ہم سے جلتے تھے اور شیخ الٰہی بخش مرحوم کی ہیبت تو ہم پر ابوالہول سے بھی بڑھ کر طاری تھی۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ پرانی وضع کے بزرگ تھے اور صوم وصلوٰۃ کے پابند۔ فرائڈ کو پڑھا نہیں تھا اور بچوں کی نفسیات سے آشنا نہ تھے۔ اخلاق کے رسمی اور روایتی نظریوں کے قائل تھے۔ ان سے ہماری جان جاتی تھی۔ ادھر وہ میاں عبدالحمید کی کٹوی سے

برآمد ہوئے اور ادھر ہم بگٹٹ بھاگے۔ بھاگتے بھاگتے اتنی دور نکل جاتے کہ ان کی گھرکیاں، چیخیں اور ہلکی پھلکی گالیاں ہماری سماعت کو نہ چھوسکتیں۔ وہ ہمارے کھیل کو شیطان کا کاروبار سمجھتے اور باز رکھنے کی کوشش کرتے لیکن یہ سب بے سود تھا۔ ان کے اپنے صاحب زادے اور پسر زادے محمد علی، شجاعت علی اور شہادت علی بھی ہمارے ساتھ کھیلتے۔ دراصل بزرگوں کو تب بہت کم احساس تھا کہ کانچ کی گولیاں ہمارے لئے کس مسرت کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ ہم ان کے عاشق تھے اور کبھی کبھی ان کی خاطر ہم میں لڑائی بھی ٹھن جاتی تھی۔

بعض اوقات ماربل کی بجائے پیسوں، گول گول ٹھیکریوں، بکائن کے ہرے بھرے پھلوں اور چڈوں سے کھیلتے۔ مٹی کے ٹھیکرے (ٹیر) ہمیشہ میری نفاست پسندی، حسن پسندی اور فن کاری کو آواز دیتے۔ میں بڑی احتیاط سے گول گول خوبصورت ٹھیکریاں تراشتا اور اچھی طرح ان کی نوک پلک نکالتا۔ بعض ساتھی بدوضع اور ڈھپال ٹھیکریاں بناتے لیکن میں طبعاً ایسا کرنے سے معذور تھا۔ میری ٹھیکریاں نہ بدوضع ہوتیں اور نہ ڈھپال۔ عام طور پر ان کا ایک قطر ایک اور دو انچ کے درمیان ہوتا۔

چھچھو چھچ گنڈیریاں بھی خوب کھیل تھا۔ کوئلے لئے گرمی کے قہر آلود دنوں میں عین دوپہر کے وقت بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ لوگوں کے گھروں، دکانوں اور کوٹھریوں میں گھس کر چوری چھپواں دیواروں پر لکیریں کھینچ رہے ہیں۔ کہیں کسی زیرِ تعمیر مکان کی پڑی ہوئی اینٹوں پر نشان ڈال رہے اور انہیں لوٹا پوٹا کر چھپا رہے ہیں۔ درخت کا بالائی تنا ہو یا کمٹی، تیسری منزل کی دیوار ہو یا برساتی کی منڈیر، ہر جگہ طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ دو مخالف سمتوں اور علاقوں میں دو ٹولیاں اپنا اپنا کام کر رہی ہیں۔ سورج کی انتہائی تمازت ہماری مسرت کے بہار آفریں لمحوں میں پگھل پگھل کر پسینہ پسینہ ہو جاتی۔ اور ہوا کی خفیف سی لرزش جنت کی خنکی کا احساس دلاتی۔

کبڈی کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ اِدھر زوال کا وقت آیا اور اُدھر میں باغ میں جا پہنچا۔ کوئی نہ کوئی دیوانہ ساتھی آ جاتا، مظفر، امین یا ابا۔ ایک بھی ساتھی ملا تو کھیل شروع کر دیا۔ جوں جوں دن ڈھلتا تو کھلاڑیوں کی تعداد بڑھتی اور ۴، ۵ بجے کے قریب بیس پچیس کھلاڑی جمع ہو جاتے۔

تب لاہور کے باغات صاف ستھرے رہتے تھے۔ لوگ انہیں بیت الخلا اور اوپن ائیر موتری کے طور پر استعمال نہ کرتے تھے۔ شاید وجہ یہ تھی کہ جگہ جگہ کمیٹی کی ٹٹیاں بنی تھیں اور سفید زمین

بکثرت موجود تھی۔ اگر چہ اب کمیٹی ہے لیکن مٹیاں نہیں رہیں اور سفید زمین کا بھی کال ہے۔ اسی لئے لوگ باغات پر گذارا کر رہے ہیں۔

اُس زمانے میں مَیں سمجھتا تھا کہ خدا کی وسیع زمین گلّی ڈنڈا کھیلنے اور پتنگ اڑانے کے لئے ہے۔ گلّی ڈنڈا بنانے میں رحیم بخش بڑھئی کا ہاتھ بڑا صاف تھا۔ بڑی صفائی سے گلّی گھڑتا مضبوط لکڑی منتخب کرتا۔ پھر کئی کئی دن تک ہتے لگانے کے بعد بھی چونچیں خراب نہ ہوتیں اور ڈنڈا ہم ایسا چُن کر نکالتے کہ گلّی کی کمر میں پڑا اور وہ پورے سوگز پر جا کر پڑی۔ اسی طرح پتنگ بھی کئی قسم کی ہوتی، لکھنؤ کاٹ، پان وال کنکوا، ٹپ، پری، تیرا۔ اسی طرح رنگ برنگ کا مانجھا ہوتا۔ سنگل یا تکوار مار کہ ریل کا مانجھا خوب کاٹ کرتا۔

جہاں آج مرحوم شاہی محلے کے نقوش پائے جاتے ہیں وہاں کبھی ہمارے بے تاج بچپن کی سلطنت تھی۔ اس سفید زمین کا اکثر و بیشتر حصہ دن رات ہمارے تصرّف میں رہتا، البتہ کچھ حصے میں گوجریاں اُپلے تھاپتیں اور گوجروں کے مویشی چارہ چرتے۔ ہماری مملکت میں ہر آدمی چوکنا ہو کر پھرتا، ورنہ پھر آنکھ، ناک، منہ اور پیشانی کی خیر نہ ہوتی۔ ہوا میں پرواز کرتی ہوئی آزاد گلیاں تیر اور بھالے کی طرح لپکتیں۔

دن تو جو کھیل میں گزرتا سو گزرتا شام کے بعد بھی گھر میں ٹکنا محال تھا۔ جب ساتھی بازار میں غُل مچاتے پھرتے تو دل مچل جاتا۔ ہوا کے تند جھونکے کی طرح میں بے اختیار منڈلی میں جا پہنچتا۔ آنکھ مچولی کا ہنگامہ گرم ہوتا۔ اندھیرے میں دوڑتے بھاگتے، نہ بجلی تھی نہ گیس لیمپ۔ لاہوری کے تنور پر، دتا کے ٹال پر، ماموں کی دکان پر اور رنڈیوں کے چوباروں پر چراغ اور لالٹینیں جلتیں، انہی کی روشنی میں ہم چیتے کی سی تیز بینائی کے ساتھ راستہ ناپتے۔ آنکھ مچولی کا ہنگامہ اس وقت تک گرم رہتا جب تک ایک ایک کے گھر والے تلاش میں نہ نکلتے اور ہماری نرم نرم ہڈیوں کو سخت سخت چھڑیوں سے سہلاتے ہوئے نہ لے جاتے۔

موسیقی پر جان چھڑکتا ہوں۔ جہاں کہیں اچھی تان سنی، رُک گیا۔ کسی مکان، دکان، ہوٹل یا پنواڑی کے اڈے پر ریڈیو نے کوئی دلپذیر گانا سنایا، کھڑا ہو کر سننے لگا۔ باغ کی روشوں پر کسی نے کوئی دلگداز نغمہ چھیڑا تو اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

ایک بار شام کے بعد رنگ محل کے پاس کہیں بینڈ بجتا جا رہا تھا۔ اُس کے نغمے ایسے لبھائے کہ مجھے اپنی سُدھ بُدھ نہ رہی اور میں ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ جب بینڈ والے اپنی منزل پر پہنچے اور انہوں نے ساز بند کیے تو آنکھیں کُھلیں ۔ایکدم بدحواس ہُوا۔ رات بہت بھیگ چکی تھی اور میں راستہ بھول چکا تھا، سہم گیا، بچپن کے خوف بھی عجیب وغریب ہوتے ہیں، ننھے سے دل پر پہاڑ سا آ گرا۔ ڈرتا ڈرتا لوگوں سے پوچھتا پوچھتا بڑی مشکل سے گھر آیا۔ یہاں آتے ہی سڑسڑاتے ہوئے بیدوں نے تواضع کی۔ والدہ کو ترس آیا، وہ بیچ بچاؤ نہ کرتیں تو کھال اُدھڑ جاتی۔

معصوم مصروفیتوں کے دوش بدوش قید خانے میں بھی جبراً رہنا پڑتا۔ گھر میں علم کے فضائل پر زور دیا جاتا اور مدرسے میں استاد کی چھڑیاں یا خوفناک طمانچے روح قبض کیے رہتے۔ اگر کبھی ننھے سے دماغ میں بھاگنے کا خیال آتا یا فرار کی کوئی تدبیر سُوجھتی تو تھوڑی سی دیر کے لئے دل ضرور باغ باغ ہو جاتا لیکن پھر سوچتے...... مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۔ ہر پھر کر اگر جیل ہی میں آنا ہے تو بھاگنے سے کیا حاصل؟ اگرچہ میں لکھنے پڑھنے میں پھسڈی نہ تھا۔ بلکہ میرا شمار پہلی صف کے لڑکوں میں ہوتا تھا پھر بھی جان سہمی رہتی ۔اُستاد سے بڑا ڈر لگتا۔ رحمدل سے رحمدل استاد بھی چھڑی اور طمانچے کے بغیر بات نہیں کرتا تھا۔ گدھے سے لے کر سؤر، بدذات اور حرامی تک کی گالیوں سے دن بھر جماعت کا کمرہ گونجتا رہتا۔ اس سب کے باوصف ہم استاد کا بڑا احترام کرتے اور اُسے یکتائے روزگار سمجھتے۔

چار برس تک مسلسل میلے کچیلے ٹاٹوں پر بیٹھ کر پڑھا۔ یہ ٹاٹ پرائمری سکولوں کا ٹریڈ مارک تھے اور آج بھی ہیں۔ ہر صبح ہم ٹاٹوں کو جھاڑتے اور ہر شام انہیں اتنا ہی گرد آلود کر جاتے۔ ہماری بے ڈھب دواتیں نہ صرف ہمارے اُجلے کپڑوں کو ماتمی رنگ پہناتیں بلکہ ٹاٹوں پر بھی Painting کرتیں۔ جب کبھی دوات انڈلتی ساتھی سے جھڑپ ہوتی۔ استاد سے جھڑکیں یا چھڑیاں الگ پڑتیں۔ سرکاری ٹاٹوں کو میلا کرنا سنگین جرم تھا اور معافی کی گنجائش نہ تھی۔

گھر کا ماحول عالمانہ تھا۔ دن رات قال قال یا رسول اللہ کی صدائیں کانوں میں پڑتیں۔ جوں جوں ہوش پکڑتا گیا ان کے مطالب اخذ کرتا گیا۔ ہدایہ، فتاویٰ قاضی خاں، خازن، تفسیر کبیر، فتاویٰ عالمگیری، صحاح ستہ کی ضخیم جلدیں ہر وقت کھلتیں، فتوے دیئے جاتے، مسائل حل کیے جاتے۔

اب تک یاد ہے کہ مفقود الخبر کے سلسلے میں امام مالکؒ کے فیصلے کی پابندی کی جاتی۔ ہر فرقے کے علماء اور فقہاء ہمارے یہاں جمع ہوتے۔ گھنٹوں بحثیں چلتیں۔ بیشتر مسائل کا موضوع غیر سود اور معراج ہوتا۔ تاہم کبھی کسی مسئلے پر اتفاق نہیں ہُوا۔

گھر میں پیر پرستی، قبر پرستی، رسم پرستی، توہم پرستی، بُت پرستی پر کسی کا ایمان نہ تھا۔ پہلی عالمگیر جنگ سے دوسری عالمی جنگ کے درمیان کا زمانہ معاشی ہنگاموں سے یکسر خالی رہا البتہ لکھنے پڑھنے کی سرگرمی جاری رہی۔ جب ڈسٹرکٹ بورڈ کے مدرسے میں ٹاٹ پر بیٹھ کر دن گزرتے تھے تو عجائب گھر اور چڑیا گھر پر مضمون لکھتا تھا۔ اس زمانے میں مجھے ایک ہم جماعت .... شجاعت پر بڑا تاؤ آیا جو کسی سے مضمون لکھوا کر لایا اور میری بجائے خود دادِ تحسین لے گیا۔ پرائمری جماعتوں میں ''پھول''، ''گلدستہ'' اور ''انتخاب لاجواب'' پڑھتا تھا۔ انتخاب لاجواب میں مسلسل ناول چھپتے تھے لیکن انہیں میں نے کبھی نہیں پڑھا۔ اسی زمانے میں میرے پاس منشی سورج نرائن مہرؔ دہلوی کا کلام تھا جسے گلاب سنگھ نے چھاپا تھا۔ مہرؔ کی چیزیں میں نے خوب پڑھیں۔ ۴۲ء کے بعد دوسری کتابوں کے ساتھ یہ بھی تلف ہوگیا۔ ساتویں جماعت میں مجھے ''ساقی'' سے دلچسپی ہوئی۔ اب مجھے ادب سے پالا پڑا۔ میر امن، رتن ناتھ سرشار، حالی، میر درد، داغ، مومنؔ، ذوق، غالبؔ، نذیر احمد، محمد حسین آزادؔ، شبلی، اقبالؔ، پریم چند، چکبست اور دیگر شعراء و ادباء سے تعارف ہُوا۔

مضمون نگاری کے شوق کو شہ ملی۔ ماحول سازگار تھا۔ غالباً سن ۳۲ء کی بات ہے۔ تاریخ الخلفاء سے ایک واقعہ میں نے اپنایا اور انتخاب لاجواب میں چھپوایا۔ اپنے اس کارنامے پر اتنی مسرت ہوئی جیسے کوئی ملک فتح کر لیا ہو۔

۳۳ء میں چند احباب نے ناٹک کمپنی کھولی اس میں اس کے لئے ڈراما تصنیف کیا۔ اسٹیج کے ایک مشہور ایکٹر اللہ بخش تانتا نے ہدایت کاری کے فرائض ادا کئے۔ میں نے شہزادے کے دوست سپہ سالار کا پارٹ ادا کیا، اگرچہ یہ پارٹ عبدالرحیم کو کرنا تھا لیکن عین کھیل کی رات اس کی نانی کا انتقال ہوگیا اور وہ شریک نہ ہوسکا۔ یہ ناٹک قصور اور لاہور میں دو دورات کھیلا گیا۔

اب میں باقاعدہ ادیب بن گیا۔ ۳۳ء یا ۳۴ء میں بمبئی سے ہفت نامہ ''مصوّر'' نکلا۔ یہ فلمی پرچہ تھا۔ میں نے اس پر نظرِ عنایت کی۔ فلمی تنقید سے ابتدا کی۔ سیر ندھری، امرت منتھن،

مہاتما دغیرہ پر تین تین چار چار قسطوں میں تنقیدیں چھپیں۔ ''ڈائریکٹر کے فرائض'' کے عنوان سے اس کے کسی سالنامے میں طویل فلمی مقالہ چھپا۔اس کے علاوہ ''پارس'' ویکلی میں بھی لکھتا رہا۔ اسی دوران میں مسٹر امرناتھ نے ''طوفان'' ویکلی جاری کیا اور مجھے ادارت میں شامل کرلیا۔ پہلے صفحے پر میری نظم چھپتی اور مزاحیہ کالم لکھتا۔کبھی کبھی افسانہ بھی جڑ دیتا۔مسٹر امرناتھ کے ساتھ ایک اور صاحب حصّہ دار تھے جو بیمہ کمپنیوں کا کام کرتے تھے۔بلیک میلر تھے اور پرچے کو اپنا ہتھیار بنانے کی فکر میں رہتے تھے۔ان کی اس حرکت نے بدمزگی پیدا کی اور پرچہ بند ہو کر رہا۔امرناتھ جی آجکل کسی ہندوستانی روزنامے میں کام کرتے ہیں۔انہوں نے بڑی عقیدت سے قرآنی آیات کا ایک نہایت نفیس مجموعہ ہدیتہً دیا،افسوس! یہ اب میرے پاس نہیں رہا۔اس کے بعد بازار میں جو نسخے دیکھے وہ ترتیب،انتخاب اور طباعت کی خوبی سے محروم تھے۔

فلمی دَور کے بعد ۱۹۳۵ء میں ''ہمایوں'' میں لکھنا شروع کیا۔ہمایوں اپنے شباب پر تھا۔ مولانا حامد علی خاں ادارت فرماتے تھے۔میرے ڈراموں کے قدردان تھے انہوں نے مجھے ایک مکتوب میں لکھا۔

''آپ کے تازہ گرامی نامہ سے آپ کا اسم گرامی معلوم ہُوا جس کے لئے شکر گزار ہوں۔ ''چوپٹ راجہ'' خوب چیز ہے مجھے بہت پسند آیا۔آپ کے ڈراموں کی میرے دل میں خاص قدرومنزلت ہے۔''

۷ اگست ۱۹۳۹ء کو ایک دوسرے مکتوب میں لکھا:۔

''اگر آپ دو تین ڈرامے بھجدیں تو آپ کو سال بھر کے لئے چھٹی مل سکتی ہے۔ اگر آپ زیادہ بھیج دیں تو درکارِ خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست۔ثواب ہی ثواب ہے۔آپ کا سانفیس خط اور صاف مسودہ کسی کا نہیں ہوتا۔زبان بھی اعلےٰ درجے کی ہوتی ہے۔معلوم نہیں آپ کا کیا شغل ہے اور آپ نے ایسی اچھی زبان لکھنی کہاں سے سیکھی ہے۔تصور میں آپ کی عمر مَیں چالیس بیالیس سال سے زیادہ نہیں سمجھتا۔''

میری عمر اور شکل و شباہت کا تصور کسی حد تک ...... بلکہ بڑی حد تک میرے نام کی اُلجھن اور تحریر کی پختگی سے موصوف نے قائم کیا تھا۔چنانچہ ۱۹۴۸ء میں جب میں امروز کے دفتر

میں ملا تو موصوف نے پہچاننے میں کافی تامل کیا، عمر کے اعتبار سے بھی ہنوز دلی دُور تھا۔
اب میں "جامعہ"، "عالمگیر"، "نیرنگ خیال" اور بعض دوسرے رسالوں میں لکھنے لگا۔ ہمیشہ یہی اصول پیش نظر رہا کہ کم لکھوں اور بہتر لکھوں۔ یہ پابندی آج بھی میں نے عائد کر رکھی ہے۔

اب تک میں نے نشر گاہ سے بھی رابط قائم کرلیا تھا۔ "مقدس پیالہ" اور "عمر خیام" قریب قریب تمام اسٹیشنوں سے نشر ہوئے۔ فیچر اور کہانیاں بھی لکھیں لیکن رفتار ہمیشہ سُست رہی۔ نشر گاہوں کے لئے لکھنا سہل بھی ہے اور دشوار بھی۔ سہل اس لئے کہ معاوضے کا لالچ ہمت بڑھاتا ہے اور عوام کے مذاق و معیار کی سیدھی سیدھی چیزیں لکھنی پڑتی ہیں، دشوار اس لئے کہ اخلاق کا ایک قدیم زاویہ ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ تہذیب، معاشرت اور شائستگی کا ایک ٹکسالی معیار سامنے رہتا ہے، مثلاً اخوت اور مساوات کے یہ معنی ہیں کہ مزدور اور سرمایہ دار دونوں بھائی بھائی ہیں۔ ایک چھوٹا بھائی ہے اور دوسرا بڑا بھائی۔ اسی طرح اخلاق کے دیگر صلح کُن نظریات رائج ہیں۔ انقلابی اور ایسے جدید رجحانات جو نہایت بے دردی سے موجودہ فرسودہ معاشرے کو تمام کیا چاہیں، نئی صحیح قدریں اور نیا صحت مند نظام پیش کیا چاہیں، پاکستان کی سرکاری نشر گاہوں کے لئے قابل قبول نہیں۔ اس میں نشر گاہوں کی خطا نہیں بلکہ اس غلامانہ نظام کا قصور ہے جو خود غرض ممتاز طبقے نے ہم پر مسلط کر دیا ہے۔ کوئی ایسی بات زندگی کے کسی شعبے میں برداشت نہیں کی جاتی جو ممتاز طبقے کے مفاد کو ضرر پہنچائے۔ نظام اشیاء اس وقت تک نہیں بدل سکتا جس وقت تک کہ ممتاز طبقہ ختم نہیں ہو جاتا۔ طبقاتی جنگ ختم نہیں ہو جاتی۔

لکھنے کے ساتھ ساتھ پڑھنے کا بھی شوق رہا۔ مَیں اس باب میں تعصب کو قریب نہیں آنے دیتا۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ حصولِ علم کے لئے رواداری بشرطِ استواری شرطِ اوّل ہے۔

مجھے جَین مت کی مقدس کتاب "اُترادھیاین سُوتر" کا یہ جملہ کبھی نہیں بھولے گا۔ "آدمی کو ماکدر کا ہے میرا عقیدہ ہے، "Truth is not the monopoly of any religion" دنیا کے کامل فلسفے، بہترین علوم اور گراں قدر نظریے صداقت کی پردہ کشائی کرتے ہیں۔ ڈارون اور ہکسلے کی ارتقائے حیات کی تھیوری، فرائڈ کی جنس نوازی، افلاطون کی عینیت پرستی، مارکس اور لینن کی مادیت پرستی، زرتشت، بدھ اور مسیح کی نرم روی، اسلام کی سخت روی، ارسطو کا نظریہ فن، سب کسی نہ کسی

انداز سے حیات اور کائنات کے متعلق انکشافات کرتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ میں سبھی کو قبول کروں لیکن سب کو داد ضرور دیتا ہوں۔ مجھے شوپنہار کی قنوطیت پسند نہیں لیکن قنوطیت کو سمجھنے کی خاطر شوپنہار کو ضرور پڑھتا ہوں اگر چہ جانتا ہوں کہ "Christ trusted in God and God let him down" لیکن اس ناکام پیغمبر کی باتیں بڑی پیاری پیاری ہیں، شوق سے ان کا مطالعہ کرتا ہوں۔ سلیمان ندوی "ارض القرآن" سے قوم عاد کا حال پڑھ کر بڑا لطف محسوس کرتا ہوں۔ جنات کے متعلق بشیر الدین محمود کا نظریہ مجھے سائنٹیفک معلوم ہوتا ہے۔ جارج سنتیانہ کے عندیے سے مجھے نفرت نہیں جو مذہب کو "Poetic Truth" کہتا ہے۔ رومی اور اقبال کی جرأت پسندی کا بھی مداح ہوں۔ میں دانتے کو "جہنم" اور ملٹن کو "ابلیس" کی تخلیق پر ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔ مادی جدلیت کی وجہ سے مارکس اور اینگلز کا قدردان ہوں۔ لی کاک کو چٹخارے لے لے کر پڑھتا ہوں۔ بیدل کو دقت نگاری پر داد دیتا ہوں۔ پکاسو کو دیکھتا ہوں اور سمجھتا ہوں۔

مجھے کسی فن کار، ہادی یا عالم کے خیالات اور نظریات سے لاکھ اختلافات سہی، میں اسکی approach اور دریافت کی قدر کرتا ہوں۔ کسی نے اندھیرے دیے یا اُجالے، میں دونوں کی تعریف کروں گا۔ علم وفن کے ارتقاء اور ان کی تکمیل میں دونوں کا ہاتھ ہے۔ میں ہر فطین کے افکار پڑھنے پر آمادہ ہو جاتا ہوں اور جائز طور پر اس کی کاوش کو سراہتا ہوں۔ ہاں! میں کسی فلسفے، حکمت یا دریافت سے اس وقت تک متاثر نہیں ہوتا جس وقت تک میرا وجدان، رجحان، مزاج اور شعور اس کی تائید نہ کرے۔ میں ہر وقت حق کی تلاش میں رہتا ہوں اور اس معاملے میں پرلے درجے کا غیر متعصب اور جانب دار ہوں۔ میں غیر جانب داری سے حق اور باطل دونوں کی حجتیں سنتا ہوں لیکن قبول صرف حق کو کرتا ہوں خواہ وہ فرشِ لالہ ہو یا فرشِ شرارہ۔ تلخ سے تلخ حقیقت بھی مجھے گوارا ہے۔ اپنی حقیقت کے بارے میں مَیں جانب دار اور متعصب ہوں، میں ہمیشہ اسی کی تبلیغ و اشاعت کروں گا۔ ضروری نہیں کہ میرا اسلوبِ فکر دوسروں سے ملتا جلتا ہو یا میرا مکتب خیال دوسروں کے مکاتب خیال سے منطبق ہو۔ تاہم میں اپنے ایمان پر پوری شدت اور پورے خلوص سے قائم رہتا ہوں۔

اچھی اچھی کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے دو مرتبہ میری کتابیں حادثات کی نذر ہو چکی ہیں۔ اب تیسری مرتبہ کتب خانہ بنا رہا ہوں۔ افسانے، ڈرامے، ناول، مقالے،

خطوط اور شعروسخن سے لگاؤ ہے۔ مذہب، فلسفے اور مارکسیت کے متعلق بھی کتابیں جمع کرتا ہوں۔ اگر چہ میرے پاس سردست گنتی کی چند کتابیں ہیں اور جیب میں اتنی گنجائش نہیں کہ حسب مرادان میں اضافہ کرسکوں، تاہم قناعت کرتا ہوں اور دل کو طفل تسلی دے لیتا ہوں۔

عاریتاً کتاب دینے سے گریز کرتا ہوں۔ یہ مقولہ بالعموم ذہن میں گھومتا ہے کہ ''کتاب دینا حماقت ہے۔'' اور کتاب لے کر لوٹانا اس سے بھی بڑی حماقت ہے۔ دی ہوئی کتاب اوّل تو لوٹ کر نہیں آتی اور آتی ہے تو بڑی جدوجہد کے بعد۔ دی ہوئی کتاب کا حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ جن احباب نے کتاب عاریتاً نہ دینے کا سبق پڑھایا ان میں احسان علی، صوفی برکت علی اور سردار سنگھ کوہلی کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

لائبریری سے بہت کم کتابیں لے کر پڑھتا ہوں۔ ابتداً (۱۹۳۹ء سے پہلے) اکثر لائبریری میں جا کر پڑھتا تھا لیکن اب یہ عادت چھوٹ گئی ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو اپنی کتاب ہر وقت پاس رہتی اور بوقت ضرورت فوراً کام آتی ہے، دوسرے پڑھتے وقت نشان لگا لگا کر اسے دوسروں کے لئے ناکارہ کر دیتا ہوں۔ اہم حصّوں کو خط کشیدہ کرتا ہوں۔ حاشیے پر خلاصہ لکھتا ہوں۔ مصنف اور موضوع کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرتا اور کتاب میں قلم بند کرتا ہوں۔ دو دو پنسلیں کام میں لاتا ہوں۔ خط کھینچنے کے لئے سرخ، اودی، نیلی یا ہری اور لکھنے کے لئے پنک۔ پڑھی ہوئی کتاب کو بہت عزیز رکھتا ہوں۔ اس کی قیمت ان پڑھی کتاب سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ پڑھی اور ان پڑھی کتاب میں وہی فرق ہے جو جتی اور ان جتی زمین میں ہوتا ہے۔

لکھنے پڑھنے کے ساتھ ساتھ ادبی مجالس اور ادبی محافل بھی مرغوب ہیں۔ یہاں ذہن کو مجلآ کرنے کا مصالحہ دستیاب ہوتا ہے۔ تقسیم کے بعد غلام محمد، سیف، اقبال کوثر، شورش، اسلم آفریدی، شیر محمد، ظہور الحسن اور بعض دیگر حضرات کی مساعی سے اردو مجلس کی تشکیل ہوئی۔ موسسین میں میرا بھی نام لیا جاتا ہے۔ دو سال تک اردو مجلس نے ادبی اور ثقافتی مشاغل میں حصّہ لیا، اس کے بعد ملکی بحران و انتشار نے چولہا ٹھنڈا کر دیا۔ سردست مجلس کولڈ اسٹوریج میں ہے۔

۱۹۴۹ء میں ایک نیا ہنگامہ برپا ہوا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے سیاست کو اپنے اوپر مسلط کر لیا اور ان تمام ادباء کو خارج کر دیا جو سیاست سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ ردِ عمل کے طور پر

قدوس صہبائی، اے حمید، احمد شجاع پاشا، حبیب اللہ اوج، خالد لطیف، آصف اور دیگر حضرات جمع ہوئے اور ایک غیر سیاسی ادبی جماعت کی بنیاد رکھی۔ میں لاہور کی شاخ کا کنویسر منتخب کیا گیا۔ منشور چھپا، اداریے چھپے، خبریں چھپیں، خط چھپے، بحثیں چھڑیں، اعلانات ہوئے، رکنیت جاری کی گئی لیکن ملکی بحران و انتشار نے یہاں بھی گُل کھلایا۔ ایک دو مفاد پرستوں کی بے عملی اور بد عملی نے بھی نقصان پہنچایا۔ چند دنوں مجلس ترقی پسند مصنفین کا خوب غلغلہ رہا لیکن پھر بازار مندا پڑ گیا۔

آج کل حلقۂ ارباب ذوق سے اپنی دلی تشنگی بُجھا لیتا ہوں۔ گاہے بگاہے مقالہ یا افسانہ پڑھنے کا موقعہ مل جاتا ہے ورنہ سننے اور تنقید کرنے میں بھی لُطف ملتا ہے۔ وہ چند حضرات جن کی کاوشوں سے حلقے کی بنیادیں پختہ ہیں ان میں مولانا صلاح الدین، حمید احمد خاں، ڈاکٹر سعید اللہ، قیوم نظر، شہرت بخاری، خلیل الرحمان اور انجم رومانی سب سے پیش پیش ہیں۔ حلقے کے اجلاس میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر باقر، وقار عظیم، صلاح الدین اکبر، حافظ لدھیانوی، اقبال حسین، انتظار حسین، امجد الطاف، کلیم صدیقی، منٹو، ناصر کاظمی، ریاض قادر، سجاد رضوی، عبدالمجید بھٹی، ضیا جالندھری، شیر محمد اختر، چراغ حسن حسرت، عظیم قریشی، امجد حسین اور دیگر ادبا و شعرا سے ملاقات ہوسکتی ہے۔ نیز ان کے تازہ ترین خیالات معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ حلقے میں ایک حد تک ہر مسلک اور مدرسہ فکر کا آدمی سنجیدگی کے ساتھ اپنا مافی الضمیر ظاہر کرسکتا ہے۔ خیال پر بندش نہیں۔ حلقے میں ایک ایسے طبقے کو کافی رسوخ حاصل ہے جو صرف ماضی کی شکستہ آواز پر سر دھنتا ہے۔ اس طبقے کے لوگ قدیم اساتذہ کے غیر مطبوعہ نسخوں کی ورق گردانی کرتے ہیں، دقیانوسی عہد کی داستانیں کرید کرید کرلاتے ہیں۔ گل و بلبل کے افسانے بار بار دہراتے ہیں اور وقت کے نئے تقاضوں کو نہایت اطمینان سے نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ان کی نظریں ہمیشہ ۱۸۵۷ء کے ارد گرد گھومتی اور صرف تاریکیوں میں بھٹکتی رہتی ہیں۔ وہ ماضی کو حال پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ ماضی پرست ہر جدید، انقلاب انگیز اور ترقی پسند نظریئے کی نفی کرتے ہیں۔ وہ ایسے کھوجی ہیں جو اندھیروں پر فریفتہ ہیں اور عدم کا سراغ نکالتے ہیں، تاہم مایوسی کی ضرورت نہیں۔ حلقے میں چند ایسے بھی نوجوان ہیں جو زندگی اور حال پر نظر رکھتے ہیں، وقت کی نگہبانی کرتے ہیں اور اپنے مسائل سے غافل نہیں رہتے۔ میں نے یہاں تندرست نظمیں، توانا کہانیاں اور زندہ

تنقیدیں سنی ہیں۔نور وظلمت کا ہمیشہ تصادم رہا ہے۔ حلقے کا چلن یہ ہے کہ وہ کسی پر اپنا نظریہ نہیں ٹھونستا، کوئی جس طرح چاہے سوچے۔

میری اس گفتگو سے یہ اخذ نہ کیجئے کہ میں ہر وقت علم وادب کے محور ہی کا طواف کرتا ہوں۔آرزو یہی ضرور ہے کہ غمِ حیات سے فرصت اگر ملے تو اپنی زندگی علم وادب کے لئے وقف کردوں لیکن یہ پاکستان ہے۔ یہاں کا نظام دنیا کے کسی غلام ملک سے بہتر نہیں۔ یہاں جہالت ہے، بیکاری ہے، بیماری ہے، افلاس ہے، غیر اقتصادی اور غیر صحت مند معاشرہ ہے، یہاں علم وادب کی پرورش کا سامان میسر نہیں۔ یہاں علم وادب کی حیثیت ایک بانجھ عورت کے برابر ہے۔علم وادب سے یہاں پھوٹی کوڑی نہیں ملتی۔ مضمون نگاری (مضمون نگار کے لئے) ایک غیر اقتصادی پیشہ ہے۔ ناشروں کی خسیس ہتھیلیاں اور تنگ جیبیں ان کے محسنوں پر کھلنے سے انکار کرتی ہیں۔علم وادب سے زرخیزی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔آخر گوشت پوست کا پتلا ہوں۔مادی زندگی سے فرار نہیں کرسکتا۔ دنیا کا بڑے سے بڑا مفرور، راہب، سنیاسی، بھکشو اور تپسوی بھی مادی زندگی کے ایک ناگزیر چکر سے آزاد نہیں۔ بیشتر ادیبوں کی طرح غیر ادبی پیشوں سے کسب معاش کرتا ہوں۔

چائے، سگرٹ اور پان سے چنداں دلچسپی نہیں اگرچہ میں انہیں شجر ممنوع نہیں کہتا تاہم ان سے خط نہیں ملتا۔شبلی (بی کام) اور قمر تسکین جیسے بعض لوگ ان پر فریفتہ ہیں، جب دیکھو سگریٹ اور چائے کا دور چل رہا ہے۔ ہفتے میں ایک دوبار میں چائے پی لیتا ہوں۔سگریٹ کا موقعہ تو عید کا چاند ہی پیدا کرتا ہے۔

گھومنے پھرنے کا خاصا ذوق رکھتا ہوں۔ چار پانچ میل مسلسل چلنے سے طبیعت کافی سیر ہوجاتی ہے۔اکثر تنہا سیر کرتا ہوں کیونکہ اصحابِ جنوں نہیں ملتے۔ایک آدھ میل تک ساتھ دینے والے تو بہتیرے ہیں۔لیکن اس سے آگے قدم اُٹھانے والے کمیاب ہیں۔عبادت بریلوی اور اقبال حسین بھی سیار ہیں۔ہاں، رنگے سیار نہیں ورنہ گلگشت کے موقعے پر گل کھلتے۔

ایسی سیرگاہ بھلی لگتی ہے جہاں سڑکیں اور روشیں کہکشاں کی طرح صاف اور ستھری ہوں۔موٹروں کی آمدورفت قطعاً ممنوع ہوتا کہ دھواں اور دھول فضا کو مکدر نہ کرسکیں۔نیز طبقاتی معاشرے کی یہ تعیش آفریں علامتیں دماغ کو پریشان نہ کریں۔سبزہ، پھول، سایہ، دھوپ اور روشنی بکثرت ہوں۔

گرمی کے موسم میں زیادہ تر شام کے بعد سیر کو نکلتا ہوں۔ کیونکہ اس وقت روزمرّہ کے کاموں سے نجات ملتی ہے۔ سردیوں میں شام سے پہلے سیر سے فارغ ہو جاتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ صبح کے وقت بھی سیر کروں لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔ پو پھٹے اٹھتا ہوں تو ہاتھ سرہانے کی کتابوں پر پڑتا ہے یا پھر کوٹ کی جیب کی طرف بڑھتا ہے، جہاں میرا رفیق قلم رہتا ہے، پھر برش اور بلیڈ کی طرف بھی نگاہیں اُٹھتی ہیں۔

ایک زمانے میں راوی کے درشن کیا کرتا تھا۔ منٹو پارک پہنچا۔ بادامی باغ سے ریل کی پٹڑی پکڑی اور سیدھا راوی کے پُل پر پہنچا، تب کشتی کی سیر بھی ہو جاتی تھی۔ اب انتقالِ مکان کے باعث باغ جناح جانے کا موقع ملتا ہے۔ یہی سب سے قریب کی سیر گاہ ہے لیکن اب وہ رونق کہاں جو تقسیم سے پہلے ہوتی تھی۔ نہ اب شاعری ہے نہ رندی۔ دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے جائیے، رومان کا کوسوں پتہ نہیں ملتا اور مل جائے تو آٹے اور نمک کا تناسب ملتا ہے۔ ایک تعلیم کی کمی ہے دوسرے رواجی جہالتوں کے بھوت سر پر سوار ہیں۔ نہ معاشی خوشحالی ہے، نہ بے فکری۔ آزادی تو مل گئی ہے لیکن نئی اُمنگ اور جرأت ناپید ہے۔

سیر کرنے انگریز اور پارسی فرض کے طور پر آتے ہیں ان کی عورتیں اور ان کے بچے بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ باغ جناح میں فضاً الرحمان وکیل، پروفیسر منیر، پروفیسر چاولہ اور مظہر انصاری کو اکثر گھومتے دیکھتا ہوں۔ کبھی کبھی بات چیت بھی ہو جاتی ہے۔

گنگناتی اور مسکراتی ہوئی کلیوں سے ہو کر اس مزار کی طرف لوٹ آتا ہوں جہاں پیر مراد شاہ مدفون ہیں اور جہاں ہر جمعرات کو قوالی ہوتی ہے۔ اگرچہ میں قبر پرست نہیں تاہم قوالی کی خاطر یہاں چلا آتا ہوں۔ یوں تو استاد غلام علی خاں، عاشق علی خاں مرحوم، توکل علی خاں، مبارک علی خاں، برکت علی خاں اور بعض دیگر اساتذہ کو بالمشافہ سننے کا اتفاق ہُوا لیکن اب موسیقی تنزل پر ہے اور استادوں کی محفلیں نایاب ہو رہی ہیں۔ دھرپد اور خیال کو سن لیتا ہوں لیکن ہلکے پھلکے گانے بھی پسند کرتا ہوں۔ سُریلی آواز مجھ پر جادو کا اثر کرتی ہے۔

سیر کے علاوہ سنیما کا عاشق ہوں۔ جب تھیٹر نے دم توڑا تو میں نے سنیما دیکھنا شروع کیا۔ سب سے پہلی ہندوستانی تصویر ''آوارہ شہزادہ'' دیکھی جس میں زبیدہ اور یعقوب نے کام کیا ہے۔

اس کے بعد ''زرینہ''، ''لیلےٰ مجنوں''، ''اندر سبھا'' وغیرہ۔ ''عالم آراء'' جو پہلی ناطق فلم تھی، میں نے بہت بعد میں دیکھی۔ اس وقت پلازا، نشاط، کیپٹل، روز، پیراماؤنٹ، اوڈین اور ریوالی معرض وجود میں نہیں آئے تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد نمائش گاہوں کا بڑا بُرا حال ہُوا ہے۔ بیشتر نمائش گاہوں میں شکستہ نشستیں بکثرت ملیں گی اور تیسرے درجے میں معمولی درجے کی کُرسیاں اور یا پھر بنچیں ہونگی۔ نجانے نمائش گاہوں والے تیسرے درجے کے تماشائیوں کو انسان بھی سمجھتے ہیں کہ نہیں۔ اس درجے کی نشستیں پردے سے اس قدر قریب ہونگی کہ نہ تصویر اچھی نظر آئیگی اور نہ بیٹھنے میں چین ملے گا۔ نظر پر جو اثر پڑتا ہے وہ الگ۔ یہ تاجرانہ حیوانیت اور غیر انسانی جذبہ نفرت کے قابل ہے۔ انسانیت کو ذلیل اور رُسوا کر کے روپیہ کمانا سب سے بڑا جرم ہے۔

میری ہمیشہ یہی خواہش رہتی ہے کہ تیسرے درجے والوں میں گھل مل کر بیٹھوں، ان کی حیات اور نفسیات کا مطالعہ کروں، ان کی بول چال کے بے ساختہ پن کا لُطف اُٹھاؤں، لیکن میری کمزور نظر مانع آتی ہے، تاہم میں ڈیموکریٹک کلاس میں بیٹھتا ہوں۔ مستقل اکثریت کے گاہک صرف تھرڈ کلاس اور ڈیموکریٹک کلاس والے ہیں لیکن انہی سے سب سے زیادہ بدسلوکی کی جاتی ہے۔

سیر یا سینما سے پہلے ''فلم لائٹ'' کے دفتر میں بھی جاتا ہوں۔ یہ ادیبوں، فلمی صحافیوں، لیڈروں اور کاروباری لوگوں کا اڈہ ہے۔ ایک جانب خان عیسےٰ غزنوی فلمی رسالوں کے اوراق لوٹتا پوٹتا رہتا ہے اور دوسری طرف شبلی (بی کام) کاؤچ پر پاؤں پسارے پڑا رہتا ہے۔ اسے آرام کی سخت طلب رہتی ہے لیکن آرام بہت کم ملتا ہے۔ اس اڈے پر آنے جانے والوں میں قمر تسکین، ظہیر نقش، نثار نجیب آبادی، کریم مصور، اے حمید، احمد شجاع پاشا، قدوس صہبائی، راؤ مہروز، اختر تسکین علیگ، بشیر قریشی، واقف صدیقی اور ہوٹلوں کے بیرے ہیں۔ یہاں ہر قسم کی گفتگو نہایت آزادی سے چلتی ہے۔

اخبار حتی الوسع باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ تین ملکوں کی خبروں میں بڑی دلچسپی لیتا ہوں۔ ایک پاکستان دوسرے امریکہ اور تیسرے روس۔

امریکہ ایسا روشن چراغ ہے جس سے دنیا میں بڑا گھناؤنا اندھیرا پھیلتا ہے اور جس کا تیل مشرق کے گہرے اور حیات آفریں چشموں سے سنچ کر جاتا ہے۔ یہ ایک عالمگیر بلڈ بینک ہے

جو ایشیا کے خون سے لبریز رہتا ہے اور اسے امریکنوں کی رگوں میں پہنچایا جاتا ہے۔ امریکہ کے باشندے احساسِ برتری کے مریض ہیں اور بالادستی کی سیاست کے عامل۔ ان کے مسکراتے ہوئے چہروں پر افلاس زدہ ملکوں کی تازگی بہار دیتی ہے۔

اسرائیل عربستان کے قلب میں تھوہر کا پودا ہے، امریکہ اسے اپنے خون سے سینچ رہا ہے۔ جس کا شعور ابھی کم لوگوں کو ہے۔ آگے آگے دیکھئیے۔

رُوس میں عوامی حکومت ضرور ہے لیکن یہ پوری طرح مارکسی نہیں ہے۔ اس کا آئین سب سے زیادہ توانا اور صحت مند سہی، لیکن ابھی یہ ملک تجربے کے دَور سے گزر رہا ہے۔ اس کا ارتقاء جاری ہے۔ ابھی اسے انفرادی آزادی کو بحال کرنا اور ایک پارٹی کی اجتماعی سختیوں کو کم کرنا ہے۔

پاکستان امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ ایک طرف وہ وعدے ہوا میں معلق نظر آتے ہیں جن کا فریب دے کر اِسے قائم کیا گیا اور دوسری طرف ممتاز طبقے کی بڑھتی ہوئی گرفت رنگ لا رہی ہے۔ حکمران طبقے کی طرف امید افزاء نظروں سے دیکھنے والے لوگ یا تو سادہ لوح ہیں اور یا پھر فریب خوردہ۔ موجودہ نظام صرف آمریت، سرمایہ داری اور جاگیرداری کیلئے میدان ہموار کرتا ہے۔ عوام کا روگ دور نہیں کرتا۔ اخوت، مساوات اور اسلام کے نام سے تاجر اور لٹیرے مخلوق کو گمراہ کرتے ہیں، نہ یہ اسلام کا درد رکھتے ہیں اور نہ انہیں عوام سے محبت ہے۔ یہ صرف اونچی اونچی پہاڑیوں، پُرتکلف نشاط گاہوں اور زریں تجوریوں کی خیر منانا جانتے ہیں۔ یہ ہمیشہ انہی کی سلامتی کی خاطر بار بار اسلام، اخوت اور مساوات کے نعرے بلند کرتے رہتے ہیں۔ خود کو مسلمانوں کا خادم بتاتے ہیں۔ یہ دھوکہ ہے اور خطرناک دھوکہ ہے۔ یہ لوگ اپنے خادم اور عوام کے حاکم ہیں۔

میری یہ تمنا نہیں کہ ہم اپنی مشکلات حل کرنے کے لئے کسی غیر ملک کو دعوت دیں۔ ہم میں خود اتنی قوت ہونا چاہئے کہ اپنے لئے خود راستہ تیار کریں۔ ہم جو چاہتے ہیں اسکا خود اہتمام کریں۔

میری زندگی کا پروگرام بہت سادہ ہے۔ میری مجبوریاں دیگر عوام سے ملتی جلتی ہیں۔ تاہم جہاں تک حالات اور ارادے ساتھ دیتے ہیں جدوجہد کرتا ہوں۔ دفتر جاتا ہوں، احباب سے ملتا ہوں اور سیر کو جاتا ہوں۔ اگرچہ یہ سمجھتا ہوں کی یہ کائنات نہ معلوم پروگرام پر چل رہی ہے۔ اس کی چشمِ مروت ہماری زندگی کو بہاراں کر سکتی ہے اور اس کی چشمِ غضب ہلاکت آفریں بن سکتی ہے۔

اسے نہ ہماری ضرورت ہے اور نہ ہماری پروا۔ ہمارے بغیر بھی یہ اپنی منشا ہی کے مطابق رواں دواں رہے گی۔ لیکن اس کے باوصف میں نے کبھی زندگی کو ہیچ نہیں سمجھا قدرت کی طنز آمیز مسکراہٹ پر میں نے کبھی جھنجلاہٹ کا اظہار نہیں کیا۔ اس کائنات کی سنگدلی نے بھی مجھے قنوطیت کی راہ پر گامزن نہیں کیا۔ میں نے کبھی حقیقت کی جانب سے آنکھیں بند نہیں کیں۔ جس طرح وہ تغیر پسند ہے اسی طرح میں بھی تغیر پسند ہوں۔ کائنات موڈ بدلتی ہے، میں بھی موڈ بدلتا ہوں۔ لیکن جس طرح کائنات اپنی مرضی سے موڈ بدلتی ہے اِسی طرح میں بھی حتی الامکان اپنی مرضی سے موڈ بدلتا ہوں۔ میں ہمیشہ اپنے فکر کو آگے لے جانے کی سعی کرتا ہوں۔ پیچھے لوٹنا مجھے ناگوار گزرتا ہے، مجھے یاسیت درکار نہیں۔ میں ایسا گوشہ تیار کیا چاہتا ہوں جہاں امید کی اُجلی کرنیں مسکرائیں، جہاں سدا اُجالا رہے، مسرت رہے۔ اسی ماحول میں جینا اور اسی میں مرنا چاہتا ہوں۔

رحمان مُذنب
5.12.50

مطبوعہ: ماہنامہ ''حشر'' ملاہور شمارہ: مارچ ۱۹۵۱ء

میری بات

رحمان مذنب

سوچتا ہوں، حیران ہوتا ہوں، کیسی تھی یہ زندگی؟ کس طرح گزری؟
عمر بھر دولخت ہونے کا اندیشہ رہا، قدرت آڑے نہ آتی تو میرے لئے جسم و جان کی اکائی کو برقرار رکھنا ممکن نہ تھا۔ زندگی میں یہ سب کچھ کیسے ہوا، کیوں ہوا؟ اس کی تفصیل تو بیان کر سکتا ہوں لیکن اس کے لئے میں جوابدہ نہیں۔ بندۂ تقدیر کیونکر جوابدہ ہو سکتا ہے؟ حالات کے تان پلٹے، وقت کے پل پل بدلتے ہوئے تیور اور قدم قدم پر رخ موڑتے دھارے میرے اختیار میں نہ تھے۔ تار ہلانے والا کوئی اور تھا، میں نہ تھا۔

مجھے دولخت کرنے اور جسم و جاں کی اکائی کو پارہ پارہ کرنے والے کرب ناک سانحات میرا مقدر رہے۔ انہی نے مجھے برباد کیا، انہی نے آباد کیا —— مجھے بنایا سنوارا، میری تخلیقی کارگاہ کو رونق بخشی۔ کاغذ، قلم اور کتاب کی یاری سے توانائی ملی، سنبھالا ملا اور جینے کا حوصلہ بھی۔ بخیے ادھیڑتا بھی رہا، سیتا بھی رہا، زمانے کی مقراض پیراہن طراز کا کیا کہنا!

مفتیوں کے گھرانے میں پیدا ہوا۔ مسجد سے ملواں مکان میں پروان چڑھا۔ اِدھر اذان کان میں پڑتی، اُدھر بائی جی کی ٹھمری سنائی دیتی۔ گھر میں علم و عرفان کا نور برستا، باہر سُر گم اور تانوں کی برکھا ہوتی۔

سات سال کا ہوا۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد ملک بھر میں طاعون نے زور باندھا۔

سیلِ مرگ رواں ہوا اور میرا شینہ جوان بڑا بھائی عبدالحیٔ اس میں بہہ گیا۔ والد کے چار آنسو ٹپکے باقی اندر ہی جذب ہو گئے۔ عالم بھی تھے، درویش بھی۔ والدہ کی کمر ٹوٹ گئی۔ پھر ان کی فرشتہ صفت، شگفتہ، ذہین اور دردمند دختر نیک اختر کا بیاہ ہوا، وہ اپنے میاں پروفیسر سید منظور علی کے ہمراہ اندور چلی گئی۔ ماں کا رہا سہا ایک اور سہارا ٹوٹا۔ بیٹے کی موت ہی کیا کم تھی کہ بیٹی بھی پردیس سدھاری؟ کسے اپنا دکھڑا سناتیں؟

روگ لگ گیا۔

والد کا وقت صَوم وصَلوٰۃ، تعلیم وتدریس، تبلیغ، کتب بینی، فتویٰ نویسی، سائلین سے نمٹنے، بحث مباحثے اور اسی نوع کی سرگرمیوں میں گزرتا۔ اسی دوران میں والدہ کی دلجوئی کرتے، صبر کی تلقین کرتے، اور کیا کر سکتے تھے؟

ستم ہائے روزگار کا سلسلہ تھما نہیں۔ پہلے بیٹی گھر سے کوسوں دور چلی گئی، پھر ماں (نانی کلثوم بی) ٹونک (راجپوتانہ) چلی گئیں۔ وہ لاہور میں باجی رشیدہ لطیف کے سکول میں بچیوں کو پڑھاتی تھیں۔ ملازمت سے فارغ ہو کر اپنے بھائی اور خاندان کے دوسرے لوگوں میں پہنچ گئیں۔ نانی کے عم زاد اور رضائی بھائی جو والد کے بھی عزیز تھے، شمس العلماء پروفیسر مفتی محمد عبداللہ ٹونکی اورینٹل کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر کلکتہ یونیورسٹی میں جا پہنچے۔ ان کے صاحبزادے، نسخۂ حمیدیہ کے مؤلف مفتی انوارالحق بھوپال چلے گئے۔ پہلے انسپکٹر آف سکولز، پھر وزیرِ تعلیم اور آخر میں وزیرِ مالیات بنے، وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

والدہ جنہیں اپنے بیٹے کی موت نے نیم جان کر دیا تھا، دو تین سال تک مسلسل روتی رہیں اور پھر ان کے آنسوؤں کا چشمہ سوکھ گیا۔ اب وہ غم واندوہ کی کرب ناک تپش سے اندر ہی اندر گھلنے لگیں، موت کا عمل شروع ہوا۔ ایک ایک کر کے عزیز دور ہوئے تو وہ ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ صبر اور جبر کی ایک دھائی گزار کر ۱۹۳۵ء میں اللہ کو پیاری ہوئیں۔ والد کو بڑا صدمہ ہوا۔ تین دھائی سے زائد کی رفاقت چھوٹ گئی۔ ضبط تو کر گئے لیکن بجھے بجھے سے رہنے لگے۔ گھر میں سنجیدگی اور خاموشی کے سوا کچھ نہ رہا گم سم رہتے۔ یوں لگتا جیسے زندگی کی انتہائی قیمتی گمشدہ چیز کی تلاش میں ہوں۔ پھر جب اس دنیا میں اسے نہ پایا تو ستمبر ۱۹۳۷ء میں ان سے ملنے

اگلی دنیا میں چلے گئے۔ گھر کی اکائی بکھر گئی، دونوں چھوٹی بہنیں اور چھوٹا بھائی اپنی بڑی بہن کے پاس چلے گئے۔

●

مسجد اور ملحقہ مکان جہاں کا ذرّہ ذرّہ علم کی روشنی سے مہکا تھا، جہاں یادوں کی خوشبو سمٹی تھی، جہاں بائیس سال تک دکھ سکھ کروٹیں لیتے رہے، مجھ سے چُھٹ گئے۔ یہ لازوال بائیس سال آج بھی مجھ میں زندہ اور تابندہ ہیں۔ ماضی مسرت انگیز ہو یا غمناک سہانا ہوتا ہے۔

میں ڈانواں ڈول ہوگیا۔ سامنے صحرا تھا۔ اکیلے میں جی گھبرانے لگا۔ چھپّر رہا نہ کھاٹ رہی، گھر کا تصور ہی جاتا رہا، نیک و بد کی تمیز رہی نہ سُود وزیاں کا احساس رہا، گھر اجڑا تو سب کچھ اجڑ گیا، ناؤ تھی، منجدھار میں آکر پھنس گئی، سہارے ٹوٹ گئے، ایک سہارا ضرور تھا۔

ناخدا جس کا نہ ہو اس کا خدا ہوتا ہے

تب بھی اسی کا سہارا تھا، اس سے پہلے بھی تھا، اب بھی اسی کا سہارا ہے، یہی سب سے بڑا سہارا ہے، اسی کی بدولت میرے اندر ہر وقت امید کی کرن فروزاں رہتی ہے۔

●

ماحول بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ معمار بھی ہے تخریب کار بھی، دل کو اپنی طرف کر لیتا ہے۔ ماحول اور معاشرے نے جس طرح میری تراش خراش کی، جس ڈگر پر لگایا اس کی کبھی کسی نے مزاحمت نہیں کی۔ والد نے میرے بارے میں ایک خواب دیکھا تھا اور چاہا تھا کہ میں انگریزی تعلیم حاصل کروں اور اسکالر بنوں۔ وہ خواب میں نے پورا کیا۔ وہ خود عالم اور فقیہ تھے لیکن مجھے اپنی روش پر لانے کے خواہاں نہ تھے۔ انہوں نے مجھے آزاد چھوڑ دیا۔ ان کی اپنی علمی مصروفیت اتنی تھی کہ مجھ پر دباؤ ڈالنے، کسی بات سے روکنے ٹوکنے یا اپنی بات منوانے کے لئے وقت نہ بچتا۔ اتنا ضرور ہے کہ

درس کے وقت میں بھی پاس بیٹھ جاتا۔ ان کی تشفی ہو جاتی۔ سمجھتے تھے کہ قبلہ درست رکھے گا۔

نہایت وسیع القلب اور درگزر کرنے والے انسان تھے۔ پتنگ اڑانے، لٹو گھمانے، گلی ڈنڈا، ٹھپے، چڈے، بنٹے، دھرکونے کھیلنے سے منع نہ کرتے۔ اس کا سبب شائد یہ ہو کہ میں پڑھائی کے معاملے میں ان کی توقع پر پورا اترتا تھا۔ پھر بڑے بیٹے کی موت نے دل گداز کر دیا تھا۔

●

گھر کو بازار سے کیا نسبت؟ تام کوقدر مشترک نہ تھی ان میں، دونوں میں اتنا ہی فاصلہ تھا جتنا روشنی اور تاریکی میں ہو یا کفر اور ایمان میں۔ قسمت نے مجھے دونوں میں شریک کیا۔ گھر اجڑنے سے پہلے بھی مکانی فاصلے نہ ہونے کے برابر تھے اور اب تو بازار نے پوری طرح مجھے اپنے اندر سمیٹ لیا۔ قال قال رسولؐ اللہ کی وہ پاکیزہ آوازیں اب بھی میرے کانوں میں گونجتی تھیں جو ہر صبح صحنِ مسجد میں والد کی زبان سے بلند ہوتی تھیں۔ آواز والے اللہ کے پاس چلے گئے۔ آوازوں کی گونج مجھے دے گئے۔

●

آنکھ کھلی تو بازار کو گل اندام غیتی سنیاری، نازک بدن نجو بائی (جسے شفاء منزل سے نجات المومنین کا فصیح و بلیغ اور معنی خیز خطاب ملا تھا)، خلاصہ حسن عنایت بائی ڈھیروں والی، خوش گفتار اور شائستہ نسیم کشمیرن، عیدن بائی، وزیر بائی، سانوری سردار بائی اور غیتی سنیاری کی نقشِ ثانی گلزار بائی سے آراستہ دیکھا۔ مجرا خانے آباد تھے۔ یہاں رات کو دن طلوع ہوتا اور منڈوا ٹوٹنے سے پہلے پہلے ڈھل جاتا۔ بدن مہکتے، مہتابیاں چھوٹتیں، مسکراہٹوں اور قہقہوں کی جھڑی لگ جاتی۔ نغمے برستے، پیالے کھنکتے، تماشابین دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے اور اسی بے خبری میں مارے جاتے۔ صبح تعلیم کے وقت اور رات کو دکنداری کے وقت سرگم اور تان پلٹے سنائی دیتے۔ پہلے

سیدھے سبھاؤ بالا خانوں کے نیچے سے گزر جاتا، اب ان کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یوں ٹھیک سے تخریب و تعمیر، آبادی و بربادی کا بیک وقت آغاز ہوا۔

۱۹۳۳ء میں والد کی زندگی ہی میں فلمی مضامین سے قلمی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ ڈرامے بھی لکھنا شروع کیے تھے۔ ان کی وفات کے بعد نقشہ ہی بدل گیا۔ دن کو کتب خانے میں جاتا، رات کو بالا خانے پر، پھر یہ دونوں گڈمڈ ہو گئے۔ گھر پر بھی کچھ وقت گزارتا، لکھنے کے ساتھ ساتھ پڑھنے کا کام بھی یہاں کرتا۔ گھر بدلتا رہا لیکن دل کبھی نہ بدلا۔

گھر، کتب خانہ اور بالا خانہ میری سوچ اور شعور کی شیرازہ بندی میں صرف ہوئے۔ انہی سے تخلیقی کاروبار چلا۔

پریم چند، سُدرشن، یلدرم، عظیم بیگ چغتائی، سَرشار، پطرس، موپساں، چیخوف، گورکی، ہارڈی، برناڈشا، پَرل ایس بک اور بیسیوں دوسرے افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں کو پڑھتا رہا۔ آیئنے کی پریاں بھی دیکھتا رہا۔ ۱۹۵۴ تک خانہ خراب رہا۔ بے اعتدالی کی زندگی گزر رہی تھی لیکن جہاں یہ چپکے چپکے مجھ سے چوری چھپواں، غیر محسوس طور پر میرے شعور کی تشکیل کر رہی تھی، وہاں میری تخلیقی کارگاہ میں افسانے اور ڈرامے کا گرانقدر مواد بھر رہی تھی۔

●

۱۹۴۰ یا ۴۱ء میں دو اچھی باتیں ہوئیں۔ ٹینی سن کے معروف منظوم ڈرامے "دی کپ" کو مقدس پیالہ، کے نام سے اردو میں منتقل کیا۔ عالمگیر کے خاص نمبر میں چھپا۔ خلاصہ دہلی ریڈیو سے نشر ہوا۔ انہی ایام میں پریم چند کا "کفن" شائع ہوا۔ اسے پڑھتے ہی قلب ونظر کا دریچہ کھلا اور روشنی کی بھرپور لہر آئی۔ تخلیقی جذبے نے نئی انگڑائی لی۔ اب تک ڈرامے اور مقالے لکھتا تھا۔ اب افسانہ لکھنے پر مائل ہوا۔ کرب، اضطراب، بے واری اور آرزو کا شدید ریلا تھا جو بہا کرلے گیا۔ کئی سال تک بہتا رہا۔ یہی دُھن سوار رہی کہ "کفن" کے پائے کا افسانہ لکھوں۔ ایسا افسانہ جو PREFECT ہو۔ کہانی پن، زبان وبیاں، تکنیک، فنی جمالیاتی اقدار اور اسلوب خوب ہو۔

رسالوں اور کتابوں میں سینکڑوں افسانے پڑھے تھے، تکنیک کی بھی سمجھ آ گئی تھی لیکن تکنیک کو سمجھنا اور بات ہے، افسانہ لکھنا اور بات ہے۔ پہلوانی کے داؤ پیچ تو تماشائی کو بھی اَزبَر ہو جاتے ہیں لیکن انہیں برتنا تو پہلوان ہی کا کام ہے۔ افسانہ لکھنا اور پھر ''کفن'' کے فنّی اور جمالیاتی معیار کو پہنچنا ہمالیہ کی چوٹی سر کرنے والی بات تھی۔

اسی زمانے میں مَیں بھوپال چلا گیا۔ بہنوئی سید منظور علی ڈیلی کالج، اندور سے ریٹائرڈ ہو کر بھوپال چلے آئے تھے، جہاں عمِ محترم مفتی انوارالحق کے مشورے پر انہوں نے ''حاجی پور'' کی بنیاد رکھی۔ نواب حمید اللہ خان مرحوم چاہتے تھے کہ باہر کے لوگ بالخصوص اپ کنٹری کے جفاکش کاشتکار آ کر بھوپال کی افتادہ زمین کو آباد کریں۔ بڑی آپا کے کہنے پر میں گاؤں چلا گیا۔ آبادکاری کا آغاز تھا۔ بستی میں چار عورتیں، چھ سات مرد اور تین جھونپڑے تھے۔ زندگی فطری تقاضوں، خوش رنگ تنوعات، کام اور فرصت کے ادلتے بدلتے سست اور تیز چکروں سے بخوبی آشنا تھی۔ سیّد صاحب کی دوسری بیوی کے دو بھائی انتظامی امور میں ان کے معاون تھے بلکہ ایک ہی بھائی کام کرتا تھا، بڑا بھائی لٹھ باز اور رنگین مزاج تھا۔ اس نے بیڑنی (بیرنی) کو گھر میں ڈال لیا تھا۔ بیڑنی اپنی جوان، بلا کی حسین اور ہنس مکھ بیٹی کو بھی ساتھ لائی تھی۔ گنوارن شہزادی لگتی تھی اور ہر کسی کی زندگی میں سے ریشم کی تلوار بن کر گزر سکتی تھی، بڑی قیمتی شے تھی۔ اونچی ماڑیوں کے لائق تھی لیکن گدڑی کے اس لعل کی قسمت کہاں ایسی تھی؟

میرا وقت کھیتوں، بھیڑ بکریوں کے باڑے، مرغی خانے، گنواروں اور گنوارنوں کے درمیان گزرتا۔ حاجی پُور سے کچھ دور بیریسہ نامی قصبے میں پینٹھ لگتی۔ چھ سات بندے کھینچ تان کر چھکڑے میں آ جاتے، ان میں بیڑنی اور اس کی بیٹی ضرور ہوتی۔ بیل یوں اڑتا جاتا جیسے پھولوں کی ٹوکری لئے جا رہا ہو۔ ہلکی ہلکی ہوا چلتی تو پھولوں کی ٹوکری سے لپٹ لپٹ کر خوشبو بکھیرتی تھی۔

حاجی پور پھولوں اور کانٹوں سمیت میری زندگی میں داخل ہوا۔ جو کچھ میں نے وہاں سے لیا اسے ''پیال'' (پرالی) میں ڈھال دیا۔ یہ میرا پہلا افسانہ تھا جو ۱۹۴۱ یا ۴۲ء میں صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوا، پھر نہ معلوم کہاں گیا۔ کچھ حسین صورتیں، کچھ دلآویز باتیں اور کچھ جاں سوز یادیں رہ گئیں۔ افسانہ نویسی کا آغاز تو ہوا لیکن پہلے افسانے کے زیاں کا قلق آج بھی ہے۔ کبھی موقع ملا، ماضی میں

RE-LIVE کیا تو ''پیال'' کو دوبارہ لکھوں گا۔ ابھی تک تو دیرینہ خواب جوں کا توں رکھا ہے۔

جو کچھ دل پر گزرتا ہے، جو کوئی میری زندگی میں سے گزرتا ہے، دل پر انمٹ نقوش چھوڑ جاتا اور نوکِ قلم پر آ کر افسانہ بن جاتا ہے۔

میں اپنے اندر زندگی کی قربتیں، گہرائیاں، نفرتیں اور محبتیں سمو لینے کا عادی ہوں۔ پگھل کر دوسروں کی زندگی میں گھل مل جاتا ہوں یا پھر دوسرے میری زندگی میں گھل مل جاتے ہیں۔ میری زندگی کا انداز ہی ایسا ہے۔ علم الیقین اور عین الیقین کی حد سے گزر کر حق الیقین تک پہنچتا ہوں۔ اک جنون تھا، اک لگن تھی، عہدِ جاہلیت تھا، جس کا آغاز ہوا تو انجام دور ہوتا چلا گیا۔

کسی منصوبے کے بغیر بے ارادہ ایسی بادِ شرط ملی جو اس راستے پر ڈالتی جس کی خط بندی میں نہیں، قسمت کرتی۔ اس طرح افسانوں کے لئے ایسا کھرا، سچا اور انتہائی حقیقت افروز مواد ملا جسے میں نے بڑی عرق ریزی، کئی سال کی مسلسل ریاضت، مشق اور لگن سے برتا، انجام کار وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا جو میں نے ''کفن'' پڑھنے کے بعد دیکھا تھا۔ افسانہ ''تتلی جان'' اس خواب کی تعبیر تھا (نئی تحریریں ستمبر ۱۹۵۴ء کے شمارے میں شریکِ اشاعت ہوا)۔

''کفن'' اپنی انفرادیت، تکنیک اور حسن و جمال کے اعتبار سے انتہائی معیاری افسانہ تھا۔ اس ایک بہترین فن پارے کی واضح تصویر ہمیشہ سامنے رہی۔ یہ درست ہے کہ ''تتلی جان'' سے پہلے میں نے چند اچھے افسانے لکھے تھے۔ بھول سائیں (مطبوعہ ماہِ نو مارچ ۱۹۴۹ء) اپنی انفرادیت اور تکنیکی خصوصیت کے باعث خاص طور پر قابلِ ذکر ہے لیکن ''تتلی جان'' کی شان ہی اور تھی۔ یہ ایک PERFECT افسانہ تھا، ایک شعر تھا۔ یہ کردار برسوں میری آنکھوں کے سامنے رہا، روز و شب میں بسا رہا۔ پھر جب تجربہ مکمل ہوا تو پکے پھل کی طرح نوکِ قلم سے ٹپک پڑا، اس سے مجھ میں نیا ولولہ اور اعتماد پیدا ہوا۔

عزم کا بندہ ہوں، اپنے کام سے مطمئن تھا۔ ''تتلی جان'' کے ساتھ اول درجے کے افسانوں کا نیا اور بھرپور دور شروع ہوا۔ یہ مجموعہ میرے دعوے کا ثبوت ہے۔

یہ ان عورتوں کے افسانے ہیں جنہیں لوگ برا کہتے ہیں (قیصراں ان سے الگ ہے۔ یہ ایک شریف زادی ہے جو شیطانی ماحول میں رہنے سے انکار کرتی ہے۔ ایسی ہی پاکیزہ سوچ اور

نیک عمل والی شریف زادیوں سے معاشرے کی آبرو قائم ہے۔ انہی کا ایمان بدترین حالات میں ڈولتا نہیں)۔ برے لوگ تو بری عورتوں سے بے روک ٹوک تعلق قائم کرتے ہیں لیکن بیشتر شرفاء جو بڑی گھن گرج سے اپنی شرافت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، بری عورتوں کو برا کہتے ہیں، دل میں ان سے ملنے کے آرزومند رہتے ہیں، حجاب درمیان میں ہوتا ہے، انہیں ملنے سے ڈرتے ہیں۔ کوئی انہیں ناگن کہتا ہے، کوئی گندی نالی کا پانی، کوئی معاشرے کا کینسر...... کتنے ہی شریف زادے، معاشرے کے نامدار اور پارسالوگ چوری چھپے اس ان کی چوکھٹ پر پیشانی رگڑتے ہیں۔ مغرب کے نفسیات دان ان رسوائے زمانہ عورتوں کو سیفٹی والو کہتے ہیں۔ ان کی بدولت برائی شہر میں نہیں پھیلتی، لوگ جگہ جگہ منہ نہیں مارتے، جنسی جرائم کی واردات کم ہو جاتی ہیں۔

یہ سخت جان عورتیں جو چھ سات ہزار سال سے دنیا بھر کے معاشرے کو سرنگوں کئے ہوئے ہیں، ہر بھونچال، ہر قیامت، ہر سیلاب، ہر انقلاب سے گزر جاتی ہیں بلکہ یہ خود بھونچال اور قیامت ہوتی ہیں۔

شرفاء کے نزدیک رنڈی ایک گالی ہے۔ غور فرمایئے! گالی جو رنڈی، گشتی، نکیائی، نوچی کسبی، بیسوا، ڈیرہ دارنی، رقاصہ اور مغنیہ کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے، کہاں کہاں پہنچتی اور رسائی پاتی ہے۔ ہوٹلوں اور قحبہ خانوں کی گنتی تو کیجئے، کہاں کہاں، کن کن جگہوں، شرفاء کے کن کن محلوں، گلی کوچوں، دیہاتوں، دوردراز کوہساری علاقوں سے اس کی سپلائی ہوتی ہے؟ وڈیرہ شاہی اور سرمایہ داری نظام نے اس کی پرورش کی ہے۔ رزق سہل نے اسے بڑھنے پھیلنے اور پَر پُرزے نکالنے کا موقع دیا ہے۔ یہ خودرو پودا نہیں، اس کے مالی ہیں جو بیج ڈالتے اور اس کی غورو پرداخت کرتے ہیں۔

یہ ٹھکرائی ہوئی جنس ہے۔ معاشرہ اسے ٹھکراتا ہے، یہ عمر بھر معاشرے کو ٹھوکر مارتی ہے۔ ہر نوع کے ذہنی تحفظات سے بالاتر ہو کر زندگی گزارتی ہے۔ جنسی معاملات میں بے باک، سودابازی میں طاق اور ہوشیار سے ہوشیار گاہک کو آخری پائی تک محروم کرنے پر قادر ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسے اس بری طرح پامال کرتی ہے اور اس کے دامن میں اتنی ڈھیر ساری رسوائی اور افسردگی ڈال دیتی ہے کہ وہ جیتے جی مر جاتا ہے۔ بڑی بڑی حویلیاں، راجواڑے اور جاگیریں اس

کی ٹھوکروں میں کھنڈر ہوئیں۔ معاشرہ اس کے سامنے ڈانواں ڈول ہی رہا۔

چند دہائی قبل اس میں سحر تھا، کیف تھا، شائستگی تھی۔ اب وہ بات نہیں رہی، کلاشنکوف نے پرانی رنڈی کو ہلاک کر دیا ہے۔

روپے کی ریل پیل سے منڈی کے بھاؤ میں تیزی آ گئی ہے، مانگ بھی بڑھ گئی ہے۔ ایک سو روپے کی رات دس دس ہزار میں بک جاتی ہے۔ کار، کوٹھی اور کوٹھے نے نئی تہذیب کو جنم دیا ہے۔ پرانی قدریں بدل گئی ہیں۔ منڈی کے تیور بھی اب اور ہیں۔ مجرا خانہ زوال پر ہے۔ جہاں کبھی خیال، ترانے اور ٹھمریاں سنائی دیتی تھیں، وہاں اب صرف فلمی گانے اور فلمی ناچ ہوتے ہیں۔ آواز کی ضرورت برائے نام ہے۔ بدن کا کاروبار چمک اٹھا ہے۔ روپے کی مُوسلا دھا بارش تو ہوتی ہے، نغمے کی برکھا نہیں ہوتی۔ کلاسیکی رنڈی مر چکی ہے، نئے کھلونے جی بہلانے کو آ گئے ہیں۔

●

رنڈی کو سب بری عورت کہتے ہیں، ٹھیک ہے، جو مرد اس کے پاس آتے ہیں انہیں کیا کہیں گے؟ باور کیجیے! ایک بری عورت کی زندگی میں ہزاروں عارضی اور درجنوں لمبی مدّت کے گاہک یعنی برے آدمی داخل ہوتے ہیں۔ ان بری عورتوں کی خدمت میں آنے والوں کی تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے۔ لہٰذا رنڈی ہی پر کیوں انگلی اٹھائی جائے، اس کے قدردانوں کا نام کیوں نہ آئے؟

بہر حال رنڈی بھی ایک عورت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت اور رنڈی میں بڑا فرق ہے۔ اس ماں، بہن اور بیٹی پر اللہ کی ہزار ہزار رحمتیں نازل ہوں جس کی پاکبازی اور عصمت و عفت سے گھر سلامت ہے، معاشرہ سلامت ہے۔ ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ لیکن ابلیس کی کارگزاری ملاحظہ ہو، عورت ایک ہی جست میں رنڈی بن جاتی ہے اور پھر معاشرہ واپسی کے تمام دروازے اس پر بند کر دیتا ہے۔ ایسے میں وہ کیا کرے، کہاں جائے؟ وہ اپنی عمر ہنس کر بھی گزار سکتی ہے، رو کر بھی، بہر حال اسے زندہ رہنا ہے۔ اپنے حالات سے خود کو ہم آہنگ کر کے اپنے شب و روز گزارنے پڑتے ہیں۔ وہ بھنور میں پھنسی ہوئی ناؤ ہوتی ہے۔ اسی میں پھنسی رہتی ہے اور ایک رات چُپ چاپ ڈوب جاتی ہے۔

رنڈی ہمارے معاشرے کا جزولاینفک ہے۔یہ ہمارے درمیان ایک کردار بھی ادا کرتی ہے۔
اسے حق پہنچتا ہے کہ ادب اور معاشرے کی تاریخ میں اسے جگہ ملے،اس کے حق کو پہچانتے ہوئے میں
نے اسے اپنے افسانوں میں سمویا۔ یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں نے اس پہلو دار عورت کی زندگی کے
سارے رنگ اور سارے انگ دکھائے ہیں تاہم میں نے اپنے گوناگوں قلمی مشاغل میں اسے وہ مقام
دیا جس کی یہ حقدار تھی۔ زیادہ تر اسی کے بارے میں افسانے لکھے۔ان میں باسی گلی، گوہاں کی جنت
اور بالا خانہ ایسے طویل افسانے بھی شامل ہیں۔ میں نے ایک متخصص کی حیثیت سے کام کیا۔
افسانے کی صنف کو مالا مال کیا،اسے بلند ترین مقام پر پہنچایا۔

شکوہ ہے تو اس بات کا کہ وہ جو قد آور نقاد بنے پھرتے ہیں، جنھوں نے بڑی بڑی
''اینٹ البحرین'' چھپوائیں، ان کی آنکھوں میں روشنی ہی نہ رہی کہ میرے افسانوں کو پڑھ ہی
لیتے، وہ عصبیتوں کی عینکیں چڑھائے پھرتے رہے۔ قلم چلتے رہے اور ساون کے اندھے
قطار در قطار میرے سامنے سے گزرتے رہے۔

ادیبوں کی گروہ بندیوں نے بڑے جھگڑے کھڑے کئے۔ ہر کوئی اپنی وفا کا ساتھ دیتا۔
وفاداری اور لڑنے جھگڑنے میں بڑا وقت ضائع ہوا۔لڑائی جھگڑے کو میں برا نہیں کہتا بشرطیکہ یہ علمی
اور ادبی سطح پر ہو، نیت بخیر ہو،اس سے قارئین کے ذوق اور شعور کو جلا ملے، ورنہ ہلچلیں اور اعلیٰ
فضاء برپا ہو۔ افسانہ نگار نقادوں سمیت گروہوں میں بٹ گئے اور بات فن کی بجائے گروہوں
کے حوالے سے ہونے لگی۔

ایسے میں وزیر آغا اور انور سدید میرے آڑے آئے، انہوں نے میرے افسانے
پڑھے اور پھر بلا تعصب اظہار رائے کیا۔اس میں انہوں نے قلم کی آبرو کو برقرار رکھا۔ مجھ سے
رعایت برتی نہ مصلحت سے کام لیا۔ انہوں نے کھری تنقید سے اچھی روایت قائم کی ہے۔
عارف عبدالمتین اور ڈاکٹر غلام حسین اظہر نے بھی میرا ذکرِ خیر کیا۔

ہر دلعزیز نقادوں نے جنھیں بڑا افسانہ نگار کہا وہ ،کفن، اور 'ٹپکی جان' کے پائے کا ایک
بھی افسانہ تخلیق نہ کر سکے۔

●

کتابوں کے کاروبار میں ہمارے ناشرین قابلِ رشک مقام رکھتے ہیں۔ یہ بادشاہ گر جسے چاہیں کاغذی پیکر میں لے آئیں، جسے چاہیں نہ لائیں لیکن میں ایسا گیا گزرا نہ تھا کہ ان کی چوکھٹوں کے چکر کاٹتا۔

بالآخر نیک دل اور نیک نیت ماسٹر سے ملاقات ہو ہی گئی۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ سرد مہری کے اس زَمہریر میں میرے اندر کی جوالا مکھی کبھی ٹھنڈی نہیں پڑی۔ جو پودا محبت اور لگن کی تپش میں پروان چڑھے وہ برف کی مار سے نہیں مرتا۔

مجھے اطمینان ہے اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میں نے شاہکار افسانے دیئے ہیں۔ ''کفن'' سے مجھے جو راہنمائی ملی ہے اس سے میں نے پوری طرح اِستفادہ کیا اور نہ صرف اپنے دور میں بلکہ آنے والے دَور کے لئے بھی بڑی اچھی مثال قائم کی۔ میں نے روایتی افسانے کو استحکام بخشا اور اس کے لئے کام کیا۔

''تپلی جان'' کے بعد میں نے معیار برقرار رکھا اور اللہ کے فضل وکرم سے یہ آج بھی برقرار ہے۔

میرے قارئین سچی اور کھری سوچ اور مطالعے کا ذوق رکھتے ہیں۔ انشاء اللہ اس مجموعے کے ہر افسانے کو اس معیار کا پائیں گے جو خود میں نے ''کفن'' کے بعد اپنے لئے متعین کیا۔

جو نقاد حضرات بن پڑھے رائے قائم کر لیتے ہیں ان سے التماس ہے کہ وہ میرے افسانوں کو پڑھ لیں، جانچ پرکھ لیں، ٹھونک بجا کر دیکھ لیں، کہیں یہ کچا گھڑا تو نہیں۔

یہ سخت جان قلمکار کا پکا مال ہے۔

..................O..................

یہ مضمون جناب رحمان مذنب کے افسانوں کے مجموعے ''بالا خانہ'' سے لیا گیا ہے۔

قلم، کتاب اور زِندگی

رحمان مذنب

میری جائے پیدائش ایسی تھی کہ اِدھر اذان کی آواز کان میں پڑتی اور اُدھر مغنیہ کی تان سنائی دیتی۔ لاہور کے بعض سابقہ معماروں نے اس علاقے کی تشکیل ہی یوں کی تھی۔ اِس طرح لوگوں کو ڈانواں ڈول کرنے اور ان کے ایمان میں خلل ڈالنے کی صورت پیدا ہوگئی۔ انھی نے چاہا ہوگا کہ جو لوگ اپنے اعمال کے باعث کھڈ میں گرِے ہیں، وہ یونہی پڑے رہیں ورنہ طوائف کو مسجد کے قریب آباد کرنے میں کیا مصلحت تھی؟

۱۵ جنوری ۱۹۱۵ء کو لاہور میں میری زندگی کا پہلا ورق کھلا۔

گھر سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر عزیز تھیٹر تھا جہاں سارا سال ناٹک کمپنیوں کی آمدورفت رہتی۔ ایک کمپنی میں ایسا بھی اداکار تھا جو آواز کشا کے بغیر اتنی اونچی اور سریلی آواز میں اذان دیتا کہ پورا بازار گونج اُٹھتا اور شبستانِ وجود لرز جاتا۔ جی چاہتا کہ یہ موذن بن جائے اور اداکاری ترک کردے لیکن ایسا نہ ہوا۔

والد کبھی کبھی نمازِ فجر میں نہایت دلنشیں اور گداز آواز میں سورۃ رحمان تلاوت کرتے۔ مقتدی مسحور ہو جاتے۔ جی چاہتا کہ یہ صوتی شیرازہ بندی، سوزِ نہاں اور آواز کا تقدس یونہی قائم رہے۔ تلاوت ہوتی رہے اور ہم سنتے رہیں۔ والدہ کی تلاوت کا انداز بھی بہت دلپذیر تھا۔

مجھے تضاد و تصادم کے ایسے مہیب سنگم سے پالا پڑا کہ میرے کم و بیش ستر سال خود کو دولخت ہونے سے بچانے میں گزر گئے۔ عالمگیر شہرت کی حامل شاہی مسجد اس علاقے کی لپیٹ

میں آ گئی جہاں رات دن دِلنوازی اور جسم فروشی کا دھندا اب بھی چلتا ہے۔ مغلِ اعظم شہنشاہ اورنگزیب کے عہد میں موسیقی کا جو مُردہ گاڑا گیا تھا وہ اب اس کی تعمیر کردہ ـــــ رُوئے زمین کی بے نظیر عبادت گاہ کے عین پہلو میں جاگ اُٹھا ہے۔ یہاں دس مسجدیں اور بھی ہیں جن کے پڑوس میں ٹکیائیاں اور ڈیرہ دارنیاں آباد ہیں۔ اسی گڑھ میں مدرسۂ نعمانیہ ہے۔ یہاں رات دن علم وعرفان کی بارش ہوتی ہے۔ یہیں کوئی آدھی صدی پہلے ایک سالانہ اجلاس میں حفیظ جالندھری سے شاہنامہ اسلام کا کچھ حصّہ سنا تھا۔ یہیں علاّمہ علاؤالدین صدیقی اُردو کے مسئلے پر پنجاب کی نمایاں اور بھرپور خدمت کے حوالے سے گرجے تھے ـــــ مدرسے سے مِلواں وزیرِ مرچ کا بالا خانہ تھا۔

عزیز تھیٹر سے ملحق ہیجڑوں کی بیٹھکیں تھیں۔ چند قدم پر ٹکیائیوں کی گلی (تمی) اور ڈیرہ دارنیوں کا بازار تھا جو شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی کی شفاء منزل اور اِس کی پشت پر ایم اسلم کی حویلی سے کچھ آگے جا کر تمام ہوتا۔ اس سِرے پر بھی اُونچی مسجد تھی۔ اِس علاقے میں تکیے، جواء خانے اور چانڈو خانے تھے۔ آس پاس شرفاء کے مکان تھے۔ بعض جگہ دیواروں سے دیواریں ملی تھیں اور بظاہر یوں لگتا تھا جیسے خیر اور شر میں سمجھوتہ ہو گیا ہو۔

علم وعمل اور فن کے حوالے سے یہ تاریخی علاقہ جہاں میں نے شعور کی آنکھ کھولی، پرورش اور تربیت پائی، نہایت زرخیز ثابت ہوا۔ ہر ہائی نس اقبال بیگم، عنایت بائی ڈھیرو والی، خورشید بائی ہجرو والی، بڑے غلام علی خان، ان کے بھائی استاد برکت علی خاں اور مبارک علی خاں، استاد عبدالوحید خاں کیرانے والے، استاد عاشق علی خاں پٹیالے والے سبھی کا یہاں قیام تھا (بڑے غلام علی خان آزادی کے بعد بھارت چلے گئے، وہیں فوت ہوئے)۔ کامیڈین حسن علی عرف حسّو کا تعلق بھی اِسی علاقے سے تھا۔

شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی بھی یہیں آ کر مقیم ہوئے۔ نازک اندام محبو بائی جسے مرحوم نے احباب کی محفل میں نجات المومنین کا خطاب دیا، شفاء منزل اور بارہ گزرے کے وسط میں رہتی تھی۔ حکیم صاحب کی شوخئ طبع ضرب المثل تھی۔ اُنھوں نے مشہور طبی مرکب معجون راح المومنین کی رعایت سے یہ نام بلکہ نُسخہ تجویز کیا۔

غلام عباس، سراج الدین، احمد نظامی، فیروز نظامی، چوہدری محمد اکبر، ہیر رانجھا کے ایک مرتب فدا حسین اسیر ایسے باکمال لوگ بھی پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور نامور ہوئے۔ ابتدائی فلمی دُنیا کے ہیرو خلیفہ ایم۔ڈی (مہردین) خورشید، فقیر سیّد نجم الدین، فقیر سیّد وحید الدین (روزگار فقیر کے مصنف) ان میں سے کسی کو بھی اس گھمبیر تصادم سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ فقیر خانہ کے نامور فقیرزادگان سیّد عابد علی (سابق ڈائریکٹر جنرل تعلقات عامہ، واپڈا)، تاریخ لاہور کے مصنف جج محمد لطیف (جن کے نام پر یہاں بازار بھی ہے)، اے پی پی کے اقبال پیرزی، پروفیسر طلحہ، پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ اور بعض دیگر حضرات عارضی یا مستقل طور پر یہاں مقیم رہے۔

میں ٹکسالی دروازے کی اُونچی مسجد سے ملحقہ مکان میں پیدا ہوا۔ آس پاس کے گلی کوچے اپنی تمام جلوہ سامانیوں، خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ میری زندگی میں داخل ہوئے۔ میں سود و زیاں کی سوچ کے بغیر ان میں داخل ہوا۔ یہ داخلہ ناگزیر تھا۔ اس کے سواہ چارہ نہ تھا۔

باہر کا ماحول جس قدر کافرانہ تھا، گھر کا ماحول اسی قدر صوفیانہ اور عالمانہ تھا۔ والد ــــــــ مفتی محمد عبدالستار (مفتی مسجد شاہی) ہر صبح حدیث کا درس دیتے۔ کبھی کبھی دوپہر سے قبل شاہی مسجد کے دارالعلوم سے کچھ طلبہ بھی استفادے کی غرض سے آجاتے۔ والد کا بیشتر وقت فقہی کتب کے مطالعے میں گزرتا۔ انہوں نے سن ۳۵، ۳۶ میں عربی کی دو کتابوں کا ترجمہ بھی کیا۔ ان میں سے ایک سیرت کی کتاب تھی۔ دونوں مسودے میرے پاس ہیں۔

لوگ دینی مسائل کے سلسلے میں آتے۔ والد زبانی اور تحریری طور پر فتاویٰ دیتے۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد بھاری تعداد میں فوجی لاپتہ ہو گئے چنانچہ، ان کی بیویوں کے لیے ازدواجی مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ گاؤں کی یہ گوریاں شوہروں کی خبر اور نان و نفقہ سے محروم ہوئیں تو پریشانیوں میں گر گئیں۔ ان کے اعزاء فتاویٰ لینے آتے۔ یہ سلسلہ تادیر قائم رہا تا آنکہ میں ہوشمند ہو گیا۔ والد اور شفیق اساتذہ کی مہربانی سے میرا خط بہت اچھا ہو گیا۔ والد نے ایک فتویٰ لکھ کر مجھے دیا جس میں امام مالکؒ کا حوالہ تھا۔ میں نے فتوے کی عبارت حفظ کر لی۔ اب میں خود ہی فتویٰ لکھتا۔ والد پڑھ کر دستخط کرتے۔ میں مہر ثبت کرتا۔ فتوے کی رُو سے چار سال کے بعد مفقود الخبر کی بیوی کو دوسرے آدمی سے نکاح کرنے کی اجازت مل جاتی۔

علاوہ ازیں والد کے ہاتھوں ہزاروں غیر مُسلموں کو قبولِ اسلام کی سعادت نصیب ہوئی۔اس کارِ خیر میں بھی میں شامل رہا۔سرٹیفکیٹ میں ہی جاری کرتا۔

کبھی کبھی والد تکان دُور کرنے کے لیے لیٹ جاتے تو مجھے ہدایہ، فتاویٰ عالمگیری، ردّالمختار فی شرح درِّ مختار یا ایسی ہی کسی کتاب کا کوئی باب پڑھنے کو کہتے۔فارسی ہو یا عربی، یہ کتب اعراب سے بے نیاز ہوتیں۔میں غلط سلط پڑھتا والد صحیح مطلب اخذ کرتے۔

قصور کی ایک درگاہ کی سجادہ نشینی کے مدعی برکت علی قادری مقدمہ بازی کے سلسلے میں لاہور آئے تو یہیں کے ہو رہے۔دُبلے پتلے، پست قامت یہ صاحب مثنویٔ مولوی معنویٔ بڑی دلکش آواز میں پڑھتے۔والد کے عقیدت مند ہو گئے۔اور ''بشنو از نے چوں حکایت می کند۔ واز جدائیہا شکایت می کند'' سے لے کر وہاں تک پڑھتے جہاں تک انھیں یاد ہوتا یا آواز ساتھ دیتی۔

سہ پہر کو زمیندار کی محفل جمتی۔منشی الٰہی بخش پرچہ پڑھتے۔یہ دورِ زمیندار، مولانا ظفر علی خاں اور اُن کی ولولہ انگیز نظموں کا تھا۔شدھی، سنگھٹن، خلافت، ہجرت، مسجد شہید گنج، علمائے دیوبند کی سیاسی سرگرمیاں، جھوٹے نبی کا غلغلہ، جنگِ طرابلس، انور پاشا، اتاترک، رات بھر میں تعمیر ہونے والی مسجد، غازی علم الدین کے ہاتھوں شاتمِ رسُول ملعون راج پال کا قتل، ترکِ موالات، گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، نیشنلسٹ مسلمان رہنماؤں کی جدوجہد، ہندو مہا سبھا اور پنڈت مالویہ، سبھی زیرِ بحث آتے۔محفل میں پروفیسر سیّد طلحہ نمایاں ہوتے۔منشی الٰہی بخش اور بعض دیگر حاضرین اظہارِ خیال کرتے۔

ہمارے یہاں رات گئے تک علمی محفلیں قائم رہتیں۔کبھی کبھی شمس العلماء مفتی محمد عبداللہ ٹونکی بھی آ جاتے۔مرحوم ہماری نانی کلثوم بی کے عم زاد بھائی بھی تھے اور رضاعی بھائی بھی، والد سے بھی عزیزداری تھی۔اُن کا اپنا کتب خانہ بھی تھا لیکن والد کے کتب خانے سے بھی رجوع فرماتے تھے۔والد کے کتب خانے میں عربی اور فارسی کا وقیع ذخیرہ تھا۔بمبئی، بیروت اور کانپور کے مطابع کی کتابیں جمع کی جاتیں۔ہر کتاب کی نہایت نفیس اور چرمی جلد بنوائی جاتی۔جب بھی کوئی نئی کتاب آتی، شمس العلماء کو اطلاع دی جاتی۔شمس العلماء اپنے عہد کے فقید المثل فقیہہ اور عالم تھے۔کم گو، سنجیدہ اور نکتہ ور۔فالتو بات نہ کرتے، مختصری گفتگو میں مشکل سے مشکل

مسئلہ حل کر دیتے۔ اورینٹل کالج کے شعبہ ادبیاتِ عربی کے صدر تھے۔ بعدازاں کلکتہ یونیورسٹی میں چلے گئے۔ قد جس قدر چھوٹا تھا علمی اعتبار سے اسی قدر بُلند تھا۔ عالی دماغ تھے۔ ہر وقت منہ میں پان اور شانے پر کڑھا ہوا رُومال رکھتے جسے لاہور میں ''پُرنا'' کہا جاتا، آجکل بھی مستعمل ہے۔ سَر پر دو پلی ٹوپی رہتی۔ لباس انتہائی سادہ اور صاف ستھرا رہتا۔ گرمیوں میں ململ کا کرتا، سفید پاجامہ (ٹخنوں سے اُونچا) اور لال کھل (کھال) کے لاہوری جوتے پہنتے۔ یہ جوتی مقبولِ خاص وعام تھی۔ عام آدمی سے لے کر شمس العلماء اور رستمِ زماں گاماں پہلوان تک اسے پذیرائی بخشتے۔ اِن کے علم وفضل کا یہ مرتبہ تھا کہ عدالتِ عالیہ کے جج فقہی معاملات میں اِن سے آکر مشورہ کرتے اور اِن کی رائے کو صائب مانتے۔ اِن کی جنگی حویلی اینٹ کا بنا ہوا قلعہ تھی۔ آج بھی ستیاں بازار میں یہ سب سے اُونچی اور پختہ حویلی ہے۔

ایک اعتبار سے میری پرورش گاہ بڑی بے مثال تھی۔ یہاں وَن سوّنے آدمی تھے۔ وَن شوَنی عورتیں تھیں۔ بیرونی کافرانہ ماحول میں مجھے نہایت نفاستِ طبع، علم وفن کے پروردہ اور ذہین لوگ ملے۔ مدتوں اِن سے یارانہ رہا۔

کیپٹی تھیٹر (موجودہ ترنم سینما) کے چوک میں فیروز نظامی، متوراج قاسم، اور چودھری بشیر احمد خاں سے طویل گفتگو ہوتی۔ چوہدری صاحب متعدد اعلیٰ سرکاری عُہدوں پر فائز اور ریونیو بورڈ سے ریٹائر ہوئے۔

۱۹۳۴ء میں میرا ڈرامہ ''جہاں آراء'' عزیز تھیٹر کی اسٹیج پر کھیلا گیا تو حلقۂ احباب میں وسعت آئی۔ رفیع اختر، خاں صاحب اُستاد مُبارک علی خاں (اُستاد بڑے غلام علی خاں اور اُستاد برکت علی خاں کے چھوٹے بھائی) اور غلام علی سے دوستی ہوئی۔ رفیع اختر برسوں نگار سینما میں بطور مینیجر فرائض انجام دیتے رہے۔ بعدازاں فِلم پروڈکشن سے وابستہ ہو گئے۔ مبارک علی خاں اللہ کو پیارے ہوئے۔ اُنھوں نے فِلم ''سوہنی کمہارن'' میں ہیرو کا پاٹ ادا کیا تھا۔ غلام علی پچھلی نصف صدی سے فِلم بنانے کی دُھن میں ہیں۔

الغرض میں ایسے ماحول میں پرورش اور تربیت پانے لگا جہاں خیر وشر کے کئی رُوپ تھے اور ایک دُوسرے کے ساتھ ساتھ اُبھرتے۔ واقعات، سانحات اور واردات کی افراط تھی۔

سچ اور جھوٹ، نیک وبد، جُل وفریب، ژولیدگی اور پاکیزگی، پارسائی اور پاکبازی کے نمونے صاف صاف بکھرے پڑے تھے۔ میرے سامنے زندگی بے شمار دلفریبیوں، مُسرّتوں، دُکھوں، کراہتوں، نفرتوں اور محبتوں کے ساتھ عیاں تھی۔ آگ کا کھیل بھی تھا، نورِ ظہور اور حضور کا سماں بھی، یزداں کی کرشمہ سازیاں، شیطان کی کارستانیاں، جلال و جمال کی کیفیتیں، کیا کچھ یہاں نہ تھا؟ افسانوں اور ڈراموں کا ہجوم تھا۔ کمال وزوال کے قصّے تھے۔ جواری تھے کہ جیبیں بھر کے جواء خانے میں آتے اور لنگوٹ باندھ کے گھر جاتے۔ حویلیوں والے شاندار بگھیوں میں آتے، بڑے ٹھاٹ سے بالا خانوں کا رُخ کرتے اور کھنڈر ہو کے نیچے اُترتے۔ شوق وسرمستی کے عالم میں کوئی گویا جاڑے کی رات کو صابر شاہ والی سنسان سڑک پر کسی راگ راگنی کا سرگم کرتا یا تانیں اڑاتا گزرتا، چیت رام روڈ پر بھنگڑ خانے کے باسی گھڑے پر نغمات کی جھڑیاں لگا دیتے۔ عجیب لوگ یہاں آباد تھے۔ بُرے ایسے کہ عُمر بھر ایک ہی روش پر بشرطِ استواری قائم رہتے۔ اچھے ایسے کہ افلاس میں بھی تاحیات صبر وقناعت کا دامن نہ چھوڑتے۔

افسانوں کی اِس دُنیا میں میں بھی افسانہ بن گیا۔

اس متنوع اور متضاد ماحول میں لحہ بہ لحہ، قدم بہ قدم زندگی گزارنے لگا۔ نفس نفس یہ ماحول مجھ میں اور میں اس میں جذب ہوگیا۔ شب وروز اسی گرم وسرد میں بسر ہوئے۔

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد طاعون پھیلی تو بڑے بھائی عبدالحیٔ کی رفاقت کا خاتمہ ہوا۔ دس بارہ سال کے بعد ۱۹۳۵ء میں والدہ خیر النساء کی شفقت اور ستمبر ۱۹۳۷ء میں والد کے سایۂ عاطفت سے محرُوم ہوگیا۔ موت برحق ہے۔ بیماری بہانہ بنتی ہے لیکن پیاروں کی موت کا غم انسان کو کھا جاتا ہے۔ والدہ اپنے جوان بیٹے کے غم میں اور والد اپنی رفیقۂ حیات کے غم میں اللہ کو پیارے ہوئے۔

اب قلم، کاغذ، ریڈیو، سینما، رسائل وجرائد، کتب، بازار اور بالا خانے سے میرا علمی اور فنی اور روز مرہ کا حدود اربعہ مرتب ہوا۔ جذبات، محسوسات، تصورات، مشاہدات وتجربات ——— خارجی و داخلی اثرات وہیجات میری تخلیقی کارگاہ میں برسرِ عمل ہوئے۔ میری سوچ، میری بصیرت وبصارت کے جادو سے تخلیقی عمل بروئے کار آیا۔ افسانے، ڈرامے اور شعر ذہن کے اُفق پر طلوع ہوئے۔

گھر سے علم کا خزانہ اور علمی ذوق ملا۔ باہر سے تجربے کی دولت ملی۔ انہی سے میری شخصیت میں تنوع آیا۔

سیرتِ نبویؐ، ادب، ماحولیات ECOLOGY، جنسیات، مصریات، دین ساحری MAGIC، تصوف، تنقید، فلم اور تھیٹر کا تحقیقی اور تفصیلی مطالعہ کیا۔ میرے علمی و ادبی کام کی فہرست بہت طویل ہے (اِس کے لیے کتاب زیرِ ترتیب ہے)۔ چند مقالے یہ ہیں: جنگ بدر، جنگ تبوک، قربانی کی ریت (دین اسلام اور دین ساحری کے حوالے سے مفصل تاریخ)، ڈرامے کی ابتداء، سوفو کلیز، یونان کا تھیٹر، دنیا کی پہلی طوائف، یونان کا عہدِ جاہلیت اور دیو مالا کا ارتقاء، اولمپک کھیل، عزائی رسوم اور فنونِ لطیفہ۔

ترجمے کا کام بھی کیا۔ ترجمہ نہایت مشکل فن ہے۔ طبعزاد تحریروں میں الفاظ کا چناؤ نسبتاً کم مشکل ہوتا ہے۔ نیز یہ آپ کے اسلوب اور موضوع سے ہم آہنگ ہوتے ہیں بلکہ موضوع اور مفہوم کے ساتھ ہی نازل ہوتے ہیں۔ ترجمے میں مصنف کی ڈکشن، سٹائل اور سپرٹ سے خود کو ہم آہنگ کرنا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے زبردست ریاضت کرنا پڑتی ہے۔ عام انداز میں یوں کہا جائے گا کہ طبعزاد اور ترجمے میں کچھ ایسا ہی فرق ہے، جیسا سیدھی دوڑ میں اور رکاوٹوں والی دوڑ میں ہوتا ہے۔ بہر حال مشق، مطالعہ اور تجربہ ہر صنفِ ادب کی شرطِ اوّل ہے۔ انہی سے مشکل آسان ہوتی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے قرآن حکیم کا جو ترجمہ کیا اس میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں کی زبان استعمال کی، جس کی انہیں مشق تھی۔ اس طرح الہام کا تقدس اور اس کی روح کو نقصان پہنچا۔ شاعری کا ترجمہ تو اور بھی مشکل ہوتا ہے۔ پطرس مرحوم کے بقول اس میں لفظوں کا ترجمہ تو ہو جاتا ہے لیکن روح غائب ہو جاتی ہے۔

کبھی کبھی تو ترجمے میں الفاظ کا متبادل نہیں ملتا، پھر ان میں بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کا خاص معاشرتی اور تہذیبی پس منظر ہوتا ہے۔

مجھے متعدد شہ پاروں کے ترجمے کا موقع ملا۔ ٹی ایس ایلیٹ کی کتاب "پوئٹری اینڈ ڈراما" اردو میں منتقل کی۔ "گلوری آف اسلام" کے ترجمے (مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے)

پر ۱۹۷۱ء کا ادبی انعام لیا۔ ایک اور کتاب ''روس میں اسلام کا خطرہ'' کے نام سے اردو میں منتقل کی۔ بہر حال تخلیق اور ترجمے دونوں کے مسائل الگ الگ ہیں تاہم ادبی صلاحیت اور مشق دونوں کی قدر مشترک ہے۔

ریڈیو کے لیے کوئی نصف صدی تک بچوں اور بڑوں کے لیے اُردو اور پنجابی ڈرامے لکھے۔ ڈرامائی اور بیانیہ فیچر لکھے، تقاریر لکھیں اور دستاویزی پروگرام لکھے۔

افسانہ میں نے بعد میں لکھنا شروع کیا۔ یہاں بھی گھر کی زندگی، علمی ترکہ، والد کی صحبت کا فیض، کتاب کا مطالعہ، بیرونی دُنیا کا تجربہ اور اپنی سوچ میرے کام آئی۔ ''تتلی جان'' سے لے کر ''بلوری بلبل'' تک اسی ذخیرے کا کچھ حصہ صرف ہوا۔

''تتلی جان'' ایک امنگوں بھرے خواب کی تعبیر تھی۔ ۱۹۳۴ء میں ڈرامانگاری، صحافت، شاعری اور مضمون نگاری سے قلمی زندگی کی ابتداء کی۔ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ غالباً ماہنامہ ''جامعہ'' دلّی میں منشی پریم چند کا افسانہ ''کفن'' پڑھا جس نے بے حد متاثر کیا۔ اس سے پہلے میں نے پریم پچیسی اور پریم چالیسی کا مطالعہ کیا تھا۔ علاوہ ازیں سدرشن پچیسی اور سدرشن چالیسی، رتن ناتھ سرشار، ڈپٹی نذیر احمد، یلدرم، رسوا، شرر، شوکت تھانوی، ایم اسلم، چیخوف، گورکی، موپاساں، پرل ایس بک بیلز یک، ہارڈی اور دیگر کئی حضرات کے افسانے اور ناول پڑھے۔ کفن مجھے بہت مختلف لگا۔ یہ ایک بھرپور پرفیکٹ افسانہ تھا۔ اسے پڑھ کر افسانہ لکھنے کی امنگ پیدا ہوئی۔ یہی نہیں بلکہ کفن کے پائے کا افسانہ لکھنے کی آرزو بھی ہوئی۔ یہ ایسا چیلنج تھا جسے میں نے افسانہ نویسی سے قبل از خود قبول کر لیا۔ خدا کی ذات اور اپنے اوپر پورا اعتماد تھا کہ میں سرخرو ہو کر رہوں گا۔ کام بہت مشکل تھا۔ تخلیقی کام تو ہوتا ہی ایسا ہے۔ بہت مشکل اور صبر آزما بھی۔

انہی ایام میں لاہور سے اندور اور وہاں سے بھوپال چلا آیا، پھر دلّی اور آخر کار ۱۹۴۶ء میں لاہور لوٹ آیا۔ بھوپال میں شمس العلماء کے صاحبزادے، نسخۂ حمیدیہ کے مرتب عمِ محترم مفتی انوار الحق وزیرِ مالیات تھے۔ میرے بہنوئی پروفیسر سیّد منظور علی دہلی کالج اندور سے ریٹائر ہو کر آ گئے تھے۔ مفتی صاحب کے ایماء پر انہوں نے بھوپال شہر سے پانچ میل کے فاصلے پر حاجی پور آباد کیا۔ کچھ مدت کے لیے وہاں چلا گیا۔ وسطِ ہند کا یہ گاؤں بعض باتوں میں پنجاب کے گاؤں

سے خاصا مختلف تھا۔ بولی میں کسی حد تک مماثل تھا۔ یہاں اِتّل، اُتّل، اِتے، اُتے اور کِتے ایسے الفاظ تھے جو پنجاب میں مستعمل تھے اور ہیں۔ ہمارے یہاں اِتّل کو اَیتل، اُتّل کو اوتل، اِتے کو ایتھے، اُتے کو اُوتھے اور کِتے کو کِتے اور کِتھے بولتے ہیں۔

حاجی پور میں رہ کر دیہی زندگی کا تجربہ کیا۔ اپنے بہنوئی کے لٹھ بند عزیز، اس کی بیڑنی (بیرنی) اور اس کی حسین بیٹی سے ملاقات ہوئی۔ چھوٹی سی نگری میں جلد ہی دل کی دنیا آباد ہو گئی۔ اور دل تو ہر نگر سے بڑا ہوتا ہے۔ پُر اسرار اور عمیق بھی۔

''دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیا جانے ہُو!''

یہیں صدیوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے قدیم وضع کے بھیل دیکھے جو آج بھی شہری حقوق سے محروم ہیں اور جنھیں شودروں ـــــــ سلوروں کے ساتھ تیسرے درجے کے شہری سمجھے جاتے ہیں۔ شودروں کو رامائن میں بانر (بندر)، ملیچھ (پلید) اور داس (غلام) کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ شری رام چندر کے محسنِ اعلیٰ ہنومان کو بھی بانر کا خطاب دیا گیا اور اس کی صُورت بھی بگاڑ دی گئی۔ (ہومر کی رزمیے اور اودیسے میں بھی ایسی ہی حرکت کی گئی ہے، آکیائی تہذیب کو سربلند کرنے کی غرض سے قدیم پیلازجی باشندوں کے کردار اور ان کی شکلیں بگاڑ دی گئی ہیں۔ سائیکلوپیز اس کی ایک مثال ہے، جو بھلے چنگے پہاڑی انسان تھے۔ انھیں یک چشم اور آدم خور بتایا گیا۔ عہدِ قدیم میں مردم خوری عام تھی۔ ہومر کے کذب و افتراء اور زمین پرستوں کے صورتیں مسخ کرنے کے عمل کی پوری تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم الحروف کا طویل مقالہ بعنوان ''یونان کا عہدِ جاہلیت اور دیو مالا کا ارتقاء'' مطبوعہ سہ ماہی ''اقبال'' مورخہ اکتوبر ۱۹۶۴ء (پہلی قسط) اور اپریل ۱۹۶۵ء (دوسری قسط)۔ حاجی پور سے کچھ دُور بیریہ نامی قصبہ تھا جہاں ہر ہفتے پینٹھ لگتی تھی۔ چھوٹے پیمانے کا یہ میلہ مویشیاں نہایت دلچسپ ہوتا تھا۔ حاجی پور اور گرد و پیش سے جو مواد اکٹھا کیا اسے دو افسانوں میں ڈھالا۔ ایک کا نام ''پیال'' (پرالی) رکھا، دوسرے کا نام یاد نہیں۔ افسانہ نگاری کے سلسلے کی یہ میری پہلی کاوش تھی۔

حاجی پور سے بھوپال آیا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی آئے ہوئے ہیں (حال ہی میں انھیں ادبی خدمات کے سلسلے میں غالب ایوارڈ ملا ہے)۔ محمد احمد سبزواری میزبان تھے۔

سبزواری معاشیات کے موضوع پر لکھتے تھے۔ ہاشمی صاحب ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد ماہنامہ ''دِلّی'' کے مدیر ہوگئے۔ بعد ازاں لکھنؤ یونیورسٹی میں چلے گئے۔ میں ان کے دور میں ''جامعہ'' کے لیے لکھتا تھا۔ انہی کی فرمائش پر'' مکتبہ جامعہ'' کے لیے سوشل سکیورٹی پر سرولیم بیورج کی کتاب اُردو میں منتقل کی۔ آج سے چالیس پچاس سال پہلے یہ بالکل نیا موضوع تھا۔ اپنے دونوں رَف افسانے انھیں دکھائے اور اِن سے رائے طلب کی۔ افسانوں میں جان ہوتو افسانہ نگاری شروع کردوں۔ انھوں نے افسانوں کو سراہا اور اچھا افسانہ نگار بننے کی نشاندہی کی۔ ان کی حوصلہ بخش رائے کو اس عزم سے ہم آہنگ پا کر بڑی خوشی ہوئی جو میں نے ''کفن'' کے ضمن میں چیلنج کے طور پر کیا تھا۔ اب میں علمی مقالات اور ڈراموں کے ساتھ ساتھ افسانے بھی لکھنے لگا۔ بھوپال کا ماحول نہایت شاعرانہ تھا۔ اندور کا ماحول نسبتاً کم شاعرانہ تھا۔ میں دونوں جگہ شعروں کی تخلیق میں مشغول رہا لیکن زیادہ توجہ نثر پر رہی۔ بھوپال میں رہ کر چند افسانے لکھے۔ ایک کاپی میں نقل کیے۔ ایک بے تکلف دوست جو والی بال ٹیم میں میرے ساتھ شامل تھے۔ ایک دِن کے وعدے پر پڑھنے کو لے گئے اور پھر یہ اک دن کبھی ختم نہ ہوا۔ حتیٰ کہ میں دِلّی چلا گیا۔ دِلّی میں تو میں لُٹ ہی گیا۔ تمام مطبوعہ ریکارڈ ضائع ہوگیا۔ دِلّی تو لٹتی ہی رہتی ہے۔ لیکن اس بار تنہا میں لٹا۔

ڈرامے کے بعد افسانہ لکھنے سے نیا تخلیقی تجربہ حاصل ہوا۔ میرے لیے یہ ڈرامے کی نسبت زیادہ مشکل فن ہے۔ لفظ بہ لفظ، فقرہ بہ فقرہ، حقیقت، جذبے، تجربے اور سوچ کے ساتھ ساتھ چلنا، کیفیات وکوائف، جزئیات وتفصیلات سے آراستہ کرنا اور کہانی کے تانے بانے بُنتا بڑا پیچیدہ، نازک اور اہم کام ہے۔ تخلیق کے عمل میں آمد کا ریلا بڑا مُنہ زور ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کے اندر کے محتسب اور ناقد پوری طرح بیدار رہتا ہے۔ قدم قدم پر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو وقت کے قانون سے بھی خبردار رہنا پڑتا ہے۔ ابلاغ کا مسئلہ بھی کسی طرح کم اہم نہیں۔

پھر عرض کروں، تخلیقی مراحل کامیابی وکامرانی سے بخیروعافیت طے کرنے کے لیے بے پناہ محنت، ریاضت اور مشق درکار ہے۔ رات دِن تفکر کرنا پڑتا ہے۔ یہ ہمہ وقتی کام ہے۔ دراصل قلم کا قلی انتہائی مصروف محنت کش ہے۔ اس کا دماغ کبھی فارغ نہیں ہوتا۔ اِس کی زندگی میں چھٹی کا دِن کبھی نہیں آتا۔ اِس کے شب وروز تخلیقی عمل کے حوالے سے گزرتے ہیں۔ کسی کے دُکھ میں

شریک ہو یا سُکھ میں، محفلِ عشرت جمائے یا صفِ ماتم بچھائے، تنہا یا دوسروں کے ساتھ ہمواریاں یا ناہمواریاں طے کرے، لوگوں میں شیر و شکر رہے۔ اس کی اِن سرگرمیوں میں وہ مصالحہ پایا جاتا ہے جس سے وہ مضبوط بنیاد بناتا اور اکیلے بیٹھ کر قلمی عمارت کھڑی کرتا ہے ـــــــ لیکن ایک بات ہے۔ میں نے جتنی ریاضت کی، جوش ولولہ دکھایا، یہ سب Labour with joy تھا۔ خوشی خوشی محنت کی زحمت لی، مجھے اس طرح سکون ملا۔ اطمینان کی دولت ہاتھ لگی۔

کڑی دھوپ میں سفر کرنے، موسلا دھار بارشوں میں بھیگنے، کھڈ میں گرنے، پہاڑ پر چڑھنے والے کو کیا مِلتا ہے اِس ملک میں؟ معاشرے کا یہ خدمت گار، شہسوار اسے کیا کچھ نہیں دیتا، آپ کیا پاتا ہے؟ اس مسئلے پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا۔ غور کیا بھی نہیں جائے گا۔ فی زمانہ کھلاڑیوں بالخصوص کرکٹروں پر توجہ دی جارہی ہے۔

افسانہ نگار کرکٹر نہیں بن سکتا۔ وہ تو افسانہ نگار ہی رہے گا۔ اس کے چوکوں چھکّوں پر بعض اوقات واہ واہ بھی نہیں ہوتی۔ لوگ بُخل سے کام لیتے ہیں۔ لیکن افسانہ نگار صبر و استقلال کا دامن تھامے قلم اور کاغذ سے یارانہ قائم رکھتا ہے۔ کم از کم میں نے تو یونہی کیا ہے۔ وہ اور ہوں گے جو ڈھنڈورا پیٹتے اور پٹواتے پھرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک ہینڈی کرافٹ اور ہانڈی کرافٹ میں کوئی فرق نہیں۔ اپنی زندگی میں یہی فائدے میں رہتے ہیں۔

بات افسانہ نگاری اور ڈراما نگاری کی ہو رہی تھی۔ مجھ پر ان کا نزول الگ الگ پیرائے میں ہوتا ہے۔ افسانے کے بارے میں اُوپر بتا چکا ہوں۔ ڈرامے کے بارے میں میرا یہ تجربہ کچھ یوں ہے۔ ڈراما تمام واقعات و سانحات کی شیرازہ بندی کے ساتھ شروع ہی میں اکائی کی شکل میں نازل ہوتا ہے۔ بالعموم ایک دو نشستوں میں لکھ لیتا ہوں۔

عموماً طویل افسانے اور مختصر ڈرامے لکھے ہیں۔ افسانہ جس قدر طویل ہوگا اسی قدر زیادہ وقت لے گا۔ ہر صنفِ ادب ـــــــ شعر، افسانہ، ناول، ڈراما (منظوم اور نثری)، غنائیہ اور رزمیہ کا تخلیقی عمل اور طریقہ کار مختلف ہے۔ ہر ایک کی اپنی اپنی اہمیت ہے۔ اپنا اپنا پیرایہ ہے۔

مہینے میں ایک اچھا افسانہ یا اچھا ڈرامہ ہو جائے تو بہت ہے۔

قلم کاری کے ساتھ کتاب اور زندگی کا مطالعہ جاری رہا۔ ڈرامے کا مطالعہ تو میں نے

تاریخی ترتیب سے بھی کیا اور بے ترتیبی سے بھی۔ ڈراما پڑھتا رہا،لکھتا رہا۔ اسی دوران میں آج سے کوئی پینتیس برس قبل بابائے بشریات فریزر کو پڑھا تو دینِ ساحری کی ہزاروں سال پرانی عزائی رسُوم میں شاعری، داستان اور ڈرامے کے عناصر عیاں ہوئے۔ (اپنے مقالے ''ڈرامے کی ابتداء'' میں عزائی تمثیل ——— PASSION PLAY پر مفصل گفتگو کی ہے)۔ میں نے دین ساحری کے مطالعہ کو وسعت دی۔ میری عادت ہے جب کوئی موضوع مجھے اچھا لگتا ہے تو پھر میں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتا ہوں اور جب تک سیری نہیں ہوتی پیچھا نہیں چھوڑتا ہوں۔ سیری کبھی نہیں ہوتی۔ یہاں تو ہر موضوع بحرِ ذخار ہے۔ فریزر کے بعد میں نے جن محققین کو پڑھا ان میں والس بج، جے۔ بی۔ پریسٹیڈ اور مسِ جین ایلین ہیریسن کا مقام بہت بلند ہے۔ پہلے دو حضرات مصریات کے ماہر ہیں۔ مسِ ہیریسن نے یونانیات کے بارے میں بے مثال کام کیا ہے۔ سوشل اینتھروپالوجی کے مطالعے کے ہی دور میں ارسطو کی ''بوطیقا'' کے تراجم، ہومر کی رزمیات، ایسکی لس، سوفوکلیز، یوری پیڈیز اور اَیرس طوف آنیز کے ڈرامے پڑھے۔ انھیں سمجھنے کے لیے یونان کی قدیم تہذیب و ثقافت اور دیو مالا کا مطالعہ کیا۔ پھر مکالماتِ افلاطون اور یونانی حکماء کو پڑھا جن کی بغاوت سے یونان کے لافانی اور لازوال خدا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موت کی آغوش میں چلے گئے۔ عالمی تھیٹر اور یونان کے تھیٹر پر کتابیں پڑھیں۔ دنیا کا سب سے پہلا، انوکھا اور پروڈکشن کے اعتبار سے گراں ترین تھیٹر دینِ ساحری کی عبادت گاہ تھا۔ آج کی مروجہ اصطلاحات، تھیٹر، آرکیسٹرا، سین، ٹریجیڈی، ڈراما وغیرہ یونان ہی سے لیے گئے ہیں (اگرچہ ان کا مفہوم کہیں کہیں بدل گیا ہے)۔

اس کے بعد کلیسائی ڈراما، سنسکرت ڈراما (بالخصوص بھاس اور کالیداس کا ڈراما) اور تھیٹر، شیکسپیئر کا ڈراما اور تھیٹر زیرِ مطالعہ رہا۔ ابسن، برناڈ شا اور بعض دوسرے ڈراما نگاروں کو پڑھا۔ اسی لگن سے افسانے کا مطالعہ کیا لیکن تخلیقی معمولات کے ضمن میں صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ عادتاً اپنے ماحول اور معاشرے میں شیر و شکر ہوگیا۔ یہ اقدام شعوری نہیں بلکہ فطری تھا۔ انسانی رشتوں اور رابطوں کو سمجھنا، قائم کرنا اور مِل جُل کر رہنا میری خلقت میں داخل ہے۔ مجھے معاشرے سے کٹ کر رہنا کبھی مرغوب و مطلوب نہیں ہوا۔ یہ عمل ضرورتاً نہیں، طبعاً ہوا۔ ڈرامے

اور افسانے کا مواد از خود مہیا ہوتا رہا۔ ایسا نہ تھا کہ میں افسانے کی تلاش میں نکلتا اور مواد اکٹھا کر کے گھر آتا۔ کئی سال تک مواد جمع ہوتا رہا اور پھر جب افسانہ لکھنے کا ڈھنگ آیا تو یہ مواد میرے کام آیا۔

میرے نزدیک افسانہ نگار کا یہ طریق کار ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کو افسانے کی صورت بخشتا ہے۔ یہ بات میرے پیشِ نظر رہی۔ میں اس دور کا واحد افسانہ نگار ہوں جس نے سات دہائیوں کے بازار کو اپنی روایات اور تفصیلات کے ساتھ بھرپُور انداز سے محفوظ کیا ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے میں نے بیانیہ افسانے کو جس قدر مستحکم کیا ہے، ادب کا غیر جانبدار مورّخ مجھے ضرور اِس کا کریڈٹ دے گا۔

''کفن'' ذہن میں رہا۔ اس کے تکنیکی نکات بالخصوص افسانے کی بُنت قابلِ غور تھی۔ محض پڑھنے اور اچھا افسانہ لکھنے کا خواب دیکھنے سے بات نہیں بنتی۔ اس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے۔ برسوں کی بیٹھک کے بعد جا کر بات بنتی ہے۔ افسانے لکھتا رہا۔ اچھے اچھے افسانے لکھے۔ بالآخر طویل سوچ، تجربے اور صبر آزما انتظار کے بعد ''پُتلی جان'' کا نزول ہوا۔ یوں لگا جیسے شعلہ لپک گیا ہو، جیسے میں نے شعر کہا ہو، حاصلِ مشاعرہ غزل کہی ہو۔ یوں تو اس کے بعد میں نے گشتی، خلا، چڑھتا سورج، کوہاں کی جنت، باسی گلی، قیصراں، بالا خانہ، بلوری بُلبُل اور کتنے ہی بڑے افسانے لکھے لیکن ''پُتلی جان'' کی انفرادیت اس کا موضوع تھی۔

پُتلی جان کی شکل میں اُردو کا ایک بڑا افسانہ لکھنے سے مجھے بیانیہ افسانے کے فن پر جو عبور حاصل ہوا اسے میں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ اب مجھ پر فرض ہوا کہ میں معیار قائم رکھوں۔ معیاری افسانے لکھوں۔

پُتلی جان ہمارے معاشرے کا ایک سچا کردار ہے۔ وہ مر چکا ہے لیکن میرے افسانے میں محفوظ ہو کر ادب کا حصّہ بن چکا ہے۔ میں نے فنی اعتبار سے اسے شعر کہا ہے۔ یہ ایسے ماحول کی پیداوار ہے جو بڑا شاعرانہ تھا۔ جس نے یہ ماحول دیکھا ہے وہی اس کی سحر کاری سے آگاہ ہے۔

تکنیکی طور پر افسانے کے تین حصے ہوتے ہیں، ا: ابتداء، ج: انتہا، ب: درمیانی حصہ جس میں اس کی ڈویلپمنٹ ہوتی ہے۔ اس میں ایک لفظ، ایک واقعہ بھی کم نہیں ہونا چاہیئے ورنہ سقم آجائے گا۔

''کفن'' ایسا ہی افسانہ ہے۔ میں نے ایسا ہی افسانہ لکھنے کا خواب دیکھا اور بحمد اللہ اسے پورا کیا۔

فنکار جب کوئی بڑا کام کرتا ہے تو پھر اسے زندہ رہنے کے لیے مزید اور مسلسل بڑے

کام کرنے پڑتے ہیں کیوں کہ اس کا خود کار احتسابی نظام اور شعور اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ وہ معاشرے کا نہایت حساس، فرض شناس، مفید اور بڑا آدمی ہوتا ہے۔ اگر چہ ہمارے یہاں صرف کرکٹر بڑا ہوتا ہے۔

فنکار معاشرے کی ذہنی بالیدگی، شعور کی بیداری اور ارتقاء کیلئے کام کرتا ہے۔ بے مثال ہادی اور رہنما ہوتا ہے۔ معاشرے سے جو کچھ لیتا اور سمیٹتا ہے اسے بطور قرض قبول کرتا اور پھر بمعہ سود لوٹاتا ہے۔ استحصال کیخلاف آواز اُٹھاتا ہے۔ عقل و دانش بڑھاتا ہے ـــــــــ یہی فن کا تقاضا ہے۔

افسانہ نگار کا کام مشکل بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ وہ بڑے لطیف پیرائے میں مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے۔ وہ واعظ نہیں ہوتا۔ کرداروں کی صورت گری اس انداز اور خیر و شر کے رویوں سے انھیں اس طور لیس کرتا ہے کہ مثبت اکائی مرتب ہوتی ہے۔ دِل پر دستک دیتا ہے۔ فن کار خوب صورتیاں اور بدصورتیاں، صداقتیں اور حقیقتیں خاص ترتیب سے پیش کرتا ہے۔ حسن و قبح کی صاف صاف نشان دہی ہو جاتی ہے۔ میں نے جس نوع کے بیشتر افسانے لکھے ہیں، ان کے کردار سیم وزر کی برکھا میں ننگے پنڈے نہاتے ہیں۔ قدم قدم پر پٹڑی سے اُترنے کا خدشہ رہتا تھا لیکن میرا ضمیر بیدار اور میرا محتسب خبردار رہا۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ فن کا مرحلہ بڑا نازک اور کٹھن ہوتا ہے۔ غفلت نہیں کی جاسکتی۔

فن کار جوہڑ میں پھول اگاتا اور گندی کھاد سے پھول کھلاتا ہے، گندگی نہیں پھیلاتا۔ فحاشی اور لذّت پرستی سے دور رہتا ہے کیوں کہ یہ دونوں اس کے قاتل ہیں۔ آرٹ اور پلے بوائے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

بڑا افسانہ لکھنے کے لیے جان ہلکان کرنی پڑتی ہے۔ اس انتہائی مشکل کام کے لیے مسلسل ریاضت تو کرنا ہی پڑتی ہے لیکن ایک امر قابلِ غور ہے ـــــــــ یہ زندگی کا تجربہ ہے۔ تجربے میں جس قدر گہرائی ہوگی اسی قدر فن پارے میں حقیقت اور اصلیت ہوگی۔ جب تک تجربہ فن کار کی ذات کا حصّہ نہیں بنتا، علم الیقیں اور عین الیقیں سے ماورا نہیں جاتا، تجربہ مکمل نہیں ہوتا۔ جب تک آگ کو دیکھنے اور دوسروں کو آگ میں جلتا دیکھنے کی بجائے فن کار خود کو آگ میں نہیں جلاتا حقیقت کا پتہ نہیں چلتا۔ نکتۂ خاص معلوم نہیں ہوتا۔ بڑا افسانہ بھی معرضِ وجود میں نہیں آتا۔ کندن بننے کے لیے یہ ضروری ہے۔

میں جس آگ میں جلا ہوں، لوگوں کے ساتھ جیسے جلا ہوں۔ اس کا حال پوری طرح جانتا ہوں۔ میرے افسانوں میں وہی کردار ہیں جو میری زندگی میں شریک تھے اور میں جن کی زندگی میں شریک تھا۔ یہ میری بھی آپ بیتی ہیں اور دوسروں کی داستانِ حیات بھی۔

میرے بیشتر افسانے بازار کی زندگی اور زوال پذیر معاشرے کے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہیں۔ اس طرح میں نے ایک اہم دور کی تہذیبی تاریخ محفوظ کی ہے۔ ''پتلی جان'' اس تاریخ کا علاحدہ مگر مستقل باب ہے۔ یہ ایسا افسانہ ہے کہ جسے منٹو، بیدی، عصمت چغتائی، غلام عباس یا کرشن چندر لکھتا تو پیشہ ور نقاد اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے اور اس پر تنقیدی مضامین کے انبار لگا دیتے۔ یہ نقاد حسن و صداقت کو دیکھنے والی بصارت اور پرکھنے والی بصیرت سے محروم ہیں۔ بے چارے عصبیت کی عینک چڑھائے پھرتے ہیں۔ انھیں رحمان مذنب کو پڑھنے کی توفیق کہاں؟ جنھوں نے پڑھا اور قدرت کی طرف سے کھری بصارت و بصیرت پائی انھوں نے حق ادا کر دیا۔

پتلی جان کے بعد میرے جس افسانے کا چرچا ہوا، وہ گشتی ہے۔ یہ انتخابات میں بھی شامل ہوا۔ میں نے اپنی بیشتر تخلیقات بالالتزام حلقہ اربابِ ذوق (ادبی) میں پڑھیں۔ پھر جب حلقہ تقسیم ہوا تو اعجاز فاروقی آگے بڑھے۔ انھوں نے احباب کے تعاون سے نئی ادبی تنظیم قائم کی۔ اِس کے ماہانہ جلسے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کی بالائی منزل میں ہوتے۔ ان میں بڑی رونق ہوتی۔ صفِ اوّل کے ادیب شریک ہوتے۔ یہیں میں نے ڈاکٹر وحید قریشی کی صدارت میں ''گشتی'' پڑھا۔ جس نشست میں پڑھا وہ دو قسطوں میں بٹ گئی۔ چند صفحے پڑھے تھے کہ بجلی چلی گئی۔ سب لوگ بورڈ روم سے اُٹھ کر بیرونی چھت پر چلے آئے جو خالی پڑی تھی اور والی بال کورٹ کے کام آتی تھی۔ مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ جانے کب بجلی آئے؟ زیادہ وقت لگا تو لوگ کھسکنے لگے۔ آدھے گھنٹے کے بعد جا کر یہ انکشاف ہوا کہ فرشی منزل کے ایک کمرے میں روشنی ہے۔ چند لوگ جو چھت پر رہ گئے، نچلے کمرے میں آ گئے۔ میں بھی مایوسی کے عالم میں آیا۔ حاضرین کے چلے جانے کا بڑا صدمہ ہوا لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ایک کر کے وہ تمام چہرے سامنے آ رہے ہیں جو بورڈ روم میں دیکھے تھے۔ مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ میرے قدردان کس محبت اور لگن سے زحمتِ انتظار فرماتے ہیں۔ افسانے کے بعد عارف عبدالمتین نے بڑی وضاحت سے گفتگو کی۔ افسانے کے نکات اور اس

کے محاسن بہ تفصیل بیان کیے۔ عارف عبدالمتین ادبی محفلوں کے اعلیٰ نقاد ہیں۔ علم وادب کی بڑی پہچان رکھتے اور مدلل انداز سے بات کرتے ہیں۔ ذہنی رکاوٹوں سے بچ کر بڑی صفائی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

سچ بڑی کڑی چیز ہے۔ لاکھ چھپاؤ، چھپتا نہیں۔ کبھی نہ کبھی ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ تاریخی بددیانتی کرنے والے کھوٹا سکہ تو چلا سکتے ہیں لیکن کھرے سکے کو کھوٹا نہیں بنا سکتے۔

میں نے بیانیہ افسانے کے فروغ، اس کی تکنیک کے ارتقاء اور ترویج کے لیے جو کام کیا ہے اس سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ صلہ وستائش کی پروا کیے بغیر آدھی صدی تک ادب کے چمن کی آبیاری کی ہے۔ جب تک توفیق ہوئی کرتا رہوں گا۔

ان تنقید نگاروں کا ممنون ہوں کہ جنھوں نے اپنے خیالاتِ عالیہ میں میرا ذکرِ خیر کیا۔ وحید انور کا بھی شکر گزار ہوں جو پاکستانی افسانہ نگاروں کے شاہکار جمع کرنے بمبئی سے آئے اور میرا سراغ لگانے حلقہ ارباب ذوق (ادبی) کے جلسے میں پہنچے۔ انھوں نے افسانہ ''پتلی جان'' بطورِ خاص طلب کیا۔ مزید دو تین افسانوں کی بھی فرمائش کی۔ میں نے فرمائش پوری کر دی۔ بمبئی جا کر کسی اخبار میں انھوں نے میرا کچھ ذکر بھی کیا اور اپنی کتاب میں میرے افسانے شامل کیے۔

حلقہ اربابِ ذوق (ادبی) کی ۳۵ سالہ رفاقت بھی قابلِ قدر ہے کہ مجھے اس کی ہفت روزہ مجالس میں سب سے زیادہ افسانے، ڈرامے اور مقالے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ نیز بحثوں میں مؤثر کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔ ان احباب کا بھی ممنون ہوں جو گروہ بندی کے ماہر تھے، ہمہ وقت اپنی تعریف وتوصیف کے طلب گار رہتے اور حسبِ ضرورت تنقید کے ضمن میں اپنے رفقاء کو جلسے کے دوران یا قبل از وقت گائیڈ لائن بھی دیتے۔ مجھے ان کے مبلغ علم سے سروکار نہیں۔ مجھے تو انہی کی بدولت اپنے ارادے میں پختگی پیدا کرنے کی توفیق ہوئی۔

میں کیا ہوں، میری شخصیت، ادبی حیثیت اور قد وقامت آپ کے سامنے ہے۔

...............O...............

یہ مضمون جناب رحمان مذنب کے افسانوں کے مجموعے ''پتلی جان'' سے لیا گیا ہے۔

نام پر ایک وضاحت

رحمان مذنب

رحمان مذنب کے معنی 'اللہ کا گنہگار بندہ' ہے۔اس کے کوئی دوسرے معنی لینا جائز نہیں۔ گرامر کی رو سے یہ 'اضافتِ مقلب بزمابِ اضافت' ہے جیسے اورنگ زیب، زیب اورنگ ہے، اسی طرح مذنب رحمان ہے جو اضافتِ مقلب کے عمل سے رحمان مذنب ہوا۔ یہ نام عربی ترکیب سے نہیں بنا۔ عربی ترکیب سے اسے ''الرحمن المذنب'' ہونا چاہیے تھا اور اس صورت میں یہ بڑی گستاخی کا موجب بنتا۔ رحمان مذنب عربی گرامر سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس کے مقابل تحریکِ استقلال کے نامور رہنما خدائے نور کا نام قابلِ گرفت۔ ہندی قاعدے سے بھی یہ ترکیب درست ہے۔ دیوداس (دیوتا کا غلام)، رام داس، رام پیاری، رام لال اور بیسیوں ایسے نام موجود ہیں۔

..................O..................

حصّہ اوّل

ذات اور فن

تبرّک

حسنِ اتفاق ہے کہ اسی شمارے میں دورِ جدید کے ایک نہایت مخلص فنکار کا ایک ایسا عمدہ افسانہ چھپ رہا ہے جو ہمارے مختصر افسانے کے چمن میں ایک گلِ نو بہار کی شگفتگی کی نوید دیتا ہے۔ ہمارا اشارہ جناب رحمان مذنب کے افسانے ''باسی گلی'' کی طرف ہے جسے اشاعت زیرِ نظر کا سب سے چمکتا ہوا زیور کہنا چاہیئے۔ رحمان مذنب سے یوں تو ناظرین بخوبی آشنا ہیں لیکن وہ ہماری بزمِ افسانہ میں پہلی بار شامل ہو رہے ہیں اور دیکھیئے کہ اپنی اوّلین شمولیت ہی سے انہوں نے اپنے لئے صدر میں جگہ بنالی ہے۔

ہم نے ان کے لئے ''مخلص فنکار'' کا لفظ بالا ارادہ استعمال کیا ہے۔ رحمان صاحب اپنی نگاہِ جویاں سے جو کچھ واقعتہً دیکھتے ہیں اسے عین مین اسی طرح اپنے ناظرین تک پہنچا دیتے ہیں۔ تخلیق اور ابلاغ کے درمیان اتنی بات البتہ ان سے ملحوظ رہتی ہے کہ جب ان کے مشاہدے کی خمیمِ نگار اظہار تک پہنچے تو گردوپیش کی فضا ایک کیف بے نام سے معمور ہو جائے۔ خلوص اور حسنِ اظہار کا یہ امتزاج بہت کم فنکاروں کو نصیب ہوا ہے اور جنھیں ہو گیا ہے وہ اس سے کبھی محروم نہیں ہوتے کہ فن کی دنیا میں صداقت کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔

ہمارے ملک میں بے شمار ''باسی گلیاں'' اور ان سے بھی زیادہ بسیط و عریض مخازن ہیں جہاں سے یہ ''باسی گلیاں'' اپنے گہر ہائے آبدار درآمد کرتی اور انہیں بے آب کر کے معاشرے کے ڈلاؤ پر پھینک دیتی ہیں۔ صاحبِ افسانہ نے ان دونوں مقامات کا نہایت سچا اور گہرا مطالعہ کیا ہے اور بڑے نرم اور ہمدردانہ انداز میں اس ناسور کو کریدا ہے جو مشرق و مغرب کے ہر معاشرے کے جسم میں چپکے چپکے اپنا زہر پھیلاتا رہتا ہے لیکن از بسکہ ناسور بھی پرانا ہے اور زہر بھی تریاق پر ہمیشہ سے خندہ زن رہا ہے، اس لئے بظاہر ان دونوں سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، ماسوا اس کے کہ نوکِ نشتر کی بجائے پھاہے کا گداز و تاثیر پر زیادہ سے زیادہ اعتماد کیا جائے مگر کہاں اور کیوں کر......؟

صلاح الدین احمد

''ادبی دنیا'' لاہور

خاص نمبر 9......دورِ پنجم......شمارہ نہم

گوشۂ اوراق...... پہلا ورق

وزیر آغا

آج سے کم و بیش پینتیس برس قبل رحمان مذنب ایک اہم افسانہ نگار کی حیثیت میں ابھرے تھے۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی شاہکار افسانے لکھ کر اہلِ نظر کو چونکا دیا تھا۔ ان کا محبوب ترین موضوع طوائف کا ماحول تھا اور اس خاص میدان میں ان کا کوئی حریف نہیں تھا۔ سعادت حسن منٹو بھی نہیں! وجہ یہ کہ منٹو کے ہاں عورت اور طوائف دو مختلف شخصیتوں یا نظاموں کی صورت میں ایک دوسری کے روبرو کھڑی تھیں اور ایک دوسری پر غالب آنے کی کوشش میں تھیں۔ دوسری طرف رحمان مذنب نے اس تصادم سے اوپر اٹھ کر طوائف اور اس کے پورے ماحول کو ایک ادارے کی صورت میں پیش کرتے ہوئے اس کے بارے میں پیچ و خم کو آئینہ کر دیا تھا۔ رحمان مذنب کے اسلوب میں بھی ایک انوکھا ڈرامائی عنصر تھا جس نے ان کی کہانیوں میں کئی طرح کے جزر و مد پیدا کر دیئے تھے، چنانچہ ان کے افسانوں نے دیکھتے ہی دیکھتے مقبولیت کی کئی منازل سر کر لیں مگر پھر یکا یک رحمان مذنب نے اپنی صبا رفتار ریل گاڑی کو بریک لگائی۔ اس کا رخ تبدیل کیا اور اسے اگلے اسٹیشن تک پہنچانے کے بجائے، ریلوے شیڈ میں لا کھڑا کیا۔ پھر انجن کو بند کر کے خود مراقبے میں چلے گئے۔ یہ مراقبہ تقریباً پچیس سالوں پر محیط تھا۔ خدا خدا کر کے اب یہ مراقبہ ٹوٹا ہے اور انہوں نے یکے بعد دیگرے اپنے افسانوں کے متعدد مجموعے شائع کر کے گاڑی کو پھر سے لائن پر رواں کر دیا ہے۔ لہٰذا اگر نئی پود رحمان مذنب سے پوری طرح واقف نہیں ہے تو اس میں قصور خود رحمان مذنب کا ہے جن کی درویشی اور استغناء نے انہیں مراقبے میں چلے جانے کی ترغیب دی تھی جب کہ زمانہ اپنی مخصوص رفتار سے آگے ہی آگے چلا جا رہا تھا...... اوراق رحمان مذنب کے اس تاریخی فیصلہ کا خیر مقدم کرتا ہے اور اس بار ایک خصوصی گوشہ ان کے لئے مختص کر کے نئی پود کو اس بات کا احساس

دلانے کی کوشش میں ہے کہ اعلیٰ تخلیق کار کچھ عرصہ کے لئے گمنامی کی دھند اوڑھ بھی لیں تو ان کی تابانی ماند نہیں پڑتی بلکہ جب وہ دھند سے برآمد ہوتے ہیں تو پہلے سے بھی زیادہ درخشاں وتاباں نظر آتے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ رحمان مذنب کے افسانوں کی مکرر اشاعت اور اوراق کے زیرِ نظر شمارے میں شامل خصوصی گوشے کی مدد سے ادب کے طالب علم رحمان مذنب کو پھر سے دریافت کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

............O............

دوافسانہ نگار

رحمان مُذنب اور منٹو

ڈاکٹر وزیر آغا

اردو ادب کے جدید افسانوی ادب میں جنسی بے راہروی کو افسانے کا موضوع بنانے کے ضمن میں دو افسانہ نگاروں نے نام پیدا کیا ہے۔ سعادت حسن منٹو اور رحمان مذنب! منٹو کا نام اس میدان میں کچھ زیادہ نمایاں ہے اور رحمان مذنب زیادہ تر پسِ پردہ رہے ہیں۔ اس لئے وہ منٹو کی طرح مقبول نہیں ہوئے تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس میدان میں رحمان مذنب، سعادت حسن منٹو سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں بلکہ کئی پہلو تو ایسے ہیں جن کی عکاسی میں رحمان مذنب کے فن نے نسبتاً زیادہ توانائی، وسعت اور گہرائی کا ثبوت بہم پہنچایا۔

مثال کے طور پر منٹو کے ہاں طوائف کا جو کردار ابھرا ہے اس کے پس منظر میں عورت اور طوائف کی ازلی و ابدی کشمکش بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں بڑے التزام کے ساتھ ایک ایسی طوائف کو پیش کیا ہے جو اپنے اعمال سے یہ ثابت کر دیتی ہے کہ وہ عورت کا منصب حاصل کرنے کی غیر شعوری آرزو میں سرشار ہے چنانچہ کردار میں طوائف اور عورت کا تصادم اور آویزش ہی منٹو کے ان افسانوں کا بنیادی وصف ہے۔ یہی کشمکش ایک مختلف روپ میں اردو کے بہت سے دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں ابھری ہے۔ منٹو نے طوائف کے اندر چھپی ہوئی عورت کو نمایاں کیا تھا۔ ان افسانہ نگاروں نے عورت کے اندر چھپی ہوئی طوائف کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔

بنیادی طور پر بات ایک ہی ہے۔ عورت اور طوائف دراصل جذبے کی متوازن اور غیر متوازن صورتوں کے لئے علامت کا کام دیتی ہے۔ ایک طرف جذبے کی ناتراشیدہ صورت

ہے جو کسی قسم کی سماجی بندشوں اور حد بندیوں کو قبول نہیں کرتی بلکہ ان سے متصادم ہو کر ردِ عمل کا ایک واضح ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔ یہ طوائف ہے! دوسری طرف جذبے کی وہ سنبھلی ہوئی کیفیت ہے جسے سماجی نظم و ضبط، تہذیبی ارتقاء، ذہنی توازن اور مامتا نے ایک شور مچاتی، چٹانوں سے سر پٹکتی ہوئی پہاڑی ندی کی بجائے ایک ٹھہری ہوئی ساکن جھیل کی صورت عطا کی ہے۔ یہ عورت ہے لیکن جذبے کی یہ دونوں صورتیں سدا علاحدہ علاحدہ خانوں میں نہیں رہتیں بلکہ ہر دم ایک دوسری سے متصادم ہوتی رہتی ہیں، چنانچہ اسی تصادم اور آویزش کے طفیل بہت سے ایسے کردار ابھر آتے ہیں جن میں کبھی طوائف اور کبھی عورت غالب ہوتی ہے اور اسی لئے یہ کردار افسانے کا موضوع بھی بنتے ہیں۔ منٹو نے زیادہ تر طوائف اور عورت کی اسی کشمکش کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے لیکن رحمان مذنب نے اس عام روش سے ہٹ کر بات کہی ہے۔ انہوں نے طوائف کے کردار کو اس کی تمام تر جزئیات اور پس منظر کے ساتھ افسانے کی محدود سی فضا میں پیش کر دیا ہے۔ تصادم اور کشمکش کی اساس پر افسانے کا رنگ محل کھڑا کرنا نسبتاً آسان ہے کیونکہ اس میں ایک ڈرامائی کیفیت ہوتی ہے جسے بڑی آسانی سے گرفت میں لیا جا سکتا ہے لیکن کسی عورت کو اس طور پر پیش کرنا کہ وہ حالات و واقعات کی کروٹوں سے بتدریج طوائف پن اختیار کرتی چلی جائے نسبتاً زیادہ مشکل کام ہے۔ دوسرے لفظوں میں رحمان مذنب نے ایک قدرتی موڑ کو افسانے کا موضوع نہیں بنایا بلکہ سیدھی لکیر میں پیچ و خم دریافت کئے اور قصے کو اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ اس طور پیش کیا ہے کہ قاری کی دلچسپی شروع سے آخر دم تک قائم رہتی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو ان کا یہ طریقِ کار حقیقت نگاری کی ایک قابلِ قدر مثال بھی ہے۔ انہوں نے طوائف کی زندگی کو اس کے اصل روپ میں پیش کیا ہے۔ وہ روپ جو عورت اور طوائف کی باہمی کشمکش کے فرو ہونے کے بعد ابھرتا ہے، جب ضمیر کے کچوکے سرد پڑ جاتے ہیں اور سماجی ضوابط سے خوف زدہ ہونے کی صورت باقی نہیں رہتی۔ رحمان مذنب نے ایک ایسی عورت کو پیش کیا ہے جو خلا میں معلق نہیں اور نہ کسی تذبذب میں مبتلا ہے بلکہ جس نے اپنی کشتیوں کو آگ لگا کر واپس جانے کے سب امکانات خود ہی ختم کر دیئے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں وہ اس عورت کے تدریجی تنزل کی ایک حقیقی تصویر اس خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں کہ قاری دنگ رہ جاتا ہے۔ یہی نہیں کہ رحمان مذنب کے افسانوں میں عورت اور

طوائف کی کشمکش اور نیکی اور بدی کا تصادم موجود ہی نہیں۔طوائف کی کہانی لکھتے وقت اس کشمکش اور تصادم سے چشم پوشی ناممکن ہے اور رحمان مذنب نے اسے مناسب اہمیت بھی دی ہے مگر اس افسانہ نگار کے ہاں عورت اور طوائف کی کشمکش بنیادی موضوع نہیں بلکہ طوائف کا تنزل ہی اہم ترین موضوع ہے لیکن وہ اس تنزل کو کسی اصلاحی تحریک کی صورت میں پیش نہیں کرتے اور نہ اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔وہ تو محض طوائف کی اصل کہانی کو پیش کر دیتے ہیں اور یہ کہانی بالعموم کسی گاؤں سے شروع ہو کر بازارِ حسن کی کسی فرسودہ کوٹھڑی میں ختم ہوتی ہے اور عورت کو (جو انسان ہے) تنزل، انتشار اور گراوٹ کے تمام مراحل سے گزرتا ہوا دکھاتی ہے، چنانچہ کہانی کے مطالعے کے بعد مجموعی اثر طوائف کی زندگی سے نفرت کا تاثر ہے، لذت کوشی کا نہیں۔منٹو کے ہاں لذت پرستی کا عنصر بہت توانا ہے۔وہ بار بار ہمیں چونکاتے اور بعض علامتوں، چیزوں اور حرکتوں کا ذکر کر کے خود بھی لطف اٹھاتے اور دوسروں کو بھی لطف اٹھانے کی ترغیب دیتے ہیں لیکن رحمان مذنب ایک صاحبِ بصیرت تماشائی کی طرح اس سارے ڈرامے کو محض دیکھتے چلے جانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ نہ تو خود لذت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ناظرین کو اس کی ترغیب دیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ انھوں نے کہانی کے بیان میں بے باکی اور صاف گوئی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ کہیں کہیں تو وہ بہت زیادہ بے باک ہو جاتے ہیں مگر ان کے دیکھنے اور محسوس کرنے کا انداز کچھ ایسا ہے کہ قاری نہ تو چونک اٹھتا ہے اور نہ جنسی لذت ہی حاصل کرتا ہے بلکہ اسے طوائف اور اس کے ماحول سے ایک نفرت سی پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ رحمان مذنب نے نسبتاً ایک مشکل میدان میں ایک بہتر ردِ عمل کو تحریک دی ہے اس لحاظ سے ان کے افسانے فنی طور پر زیادہ بلند ہیں۔

منٹو کی بہ نسبت رحمان مذنب نے اپنے میدانِ عمل میں بھی زیادہ وسعت پیدا کی ہے۔ منٹو طوائف پر ہی اپنی تمام تر توجہ مبذول کرتے ہیں اور اس ماحول کو اور اس ماحول کی جزئیات کو ثانوی حیثیت دے دیتے ہیں بلکہ بیشتر اوقات تو قاری طوائف کی کشمکش میں اس درجہ کھو جاتا ہے کہ ماحول اس پر اثر انداز ہی نہیں ہوتا۔اس طرح منٹو کا دائرہ عمل ذرا محدود ہے اور انھوں نے اپنی مساعی کو کردار کے نفسیاتی مدوجزر سے آگے نہیں بڑھایا۔اس کے برعکس رحمان مذنب بھی اگرچہ طوائف پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں اور ان کے افسانوں میں طوائف کسی نہ کسی طرح ابھر کر

مرکزِ نگاہ پاتی ہے تاہم دراصل ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے طوائف کا سہارا لے کر اس کے ماحول کے نقوش کو ایک بڑی حد تک اجاگر کیا ہے۔ان کے افسانوں میں کردار سے بھی زیادہ اہم وہ پس منظر ہے جس پر اس کردار کے نقوش ابھرتے ہیں بلکہ کئی بار تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا اصل کردار ہی بازارِ حسن ہے جس میں طوائف کا کردار محض ایک پرزہ ہے اور یہ پرزہ دوسرے پرزوں کے وجود اور ان کی حرکات وسکنات ہی سے سرگرمِ عمل ہے۔رحمان مذنب نے طوائف کے اس ماحول کو پیش کرتے ہوئے جزئیات نگاری کی ایک روشن مثال قائم کی ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے گویا زندگی کی ایک بھرپور تصویر چشمِ تصور کے سامنے ابھر آئی ہے۔اس تصویر میں بڑے شوخ رنگ ہیں اور ہر رنگ مچلتا، تڑپتا، تململاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔بے شک طوائف اس تصویر کا مرکز ہے لیکن غنڈے، نوسرباز، کباڑیے، کنجر، جواری، ہیجڑے، ملنگ، تانگے والے، قلندر، جیب کترے، تماش بین، سپاہی اور بے شمار دوسرے لوگ بھی اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں اور ان سب کو اکٹھا ہوتے ہی تصویر مکمل ہوتی ہے۔اس میں رحمان مذنب کی جیت ہے کہ انہوں نے محض طوائف کے کردار کو پیش نہیں کیا بلکہ اس ماحول کو بھی پیش کیا ہے جو بیک وقت طوائف کے وجود کی پیداوار بھی ہے اور اس کا خالق بھی۔اس ماحول کے بیشتر کردار جذبے کی اندھی صورت کے تڑپتے ہوئے نمونے ہیں۔ یہاں غنڈوں کی بادشاہت ہے۔جیب کتروں نے علاقے بانٹ رکھے ہیں۔ہیجڑوں سے عشق ایک بالکل عام بات ہے اور طوائفوں کی راگ رنگ کی محفلوں کے ساتھ ساتھ نوچیوں کے غلیظ اور قابلِ نفرت اڈے بھی ہیں اور اس سارے ماحول پر ایک ہنگامۂ محشر برپا ہے۔ایک انوکھی تڑپ، ایک عجیب سا تلاطم جو شام ڈھلتے ہی شروع ہوتا ہے اور سپیدۂ سحر کے نمودار ہوتے ہی ختم ہوجاتا ہے لیکن اس تڑپ، حرکت اور ہنگامے کے عین درمیان ایک پھیلتا ہوا خلاء نظر آتا ہے اور رحمان مذنب نے اپنے قلم کی روشنائی سے اس خلاء کو شوخ تر کردیا ہے چنانچہ مجموعی تاثر اس کھوکھلے پن کا تاثر ہے اور قاری کے دل میں اس ماحول سے دور بھاگنے کی آرزو کروٹیں لینے لگتی ہے۔

رحمان مذنب کے ان افسانوں کی ایک اور اہم خصوصیات ان کا ڈرامائی مزاج ہے۔ شائد اس لئے کہ انہوں نے ڈرامے کو بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے۔شائد اس لئے کہ ان کے ہاں حرکت اور ہلچل کا ایک شدید احساس موجود ہے کہ ان کے افسانوں میں قدم قدم پر واقعات کے ڈرامائی

عنصر ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور ان ڈرامائی عناصر کو معرضِ وجود میں لانے کا کوئی اہتمام نہیں کرتے۔ یہ عناصر از خود ابھرتے اور پھر فوراً ہی ختم ہو جاتے ہیں بالکل جیسے کوئی چوبِ خشک یکا یک جل اٹھے اور پھر خود ہی بجھ جائے، ایسے موقعوں پر رحمان مذنب حقیقت نگاری کی جو مثال پیش کرتے ہیں اپنی ڈرامائی کیفیات کے لحاظ سے بڑی قابلِ قدر ہوتی ہے۔ ان کے افسانہ ''بالی'' میں ایک اہم واقعہ اس طرح ابھرتا ہے۔

''باتوں باتوں میں وقت ٹلنے لگا۔ گرمی بڑھتی ہی چلی گئی، بھٹی ہی تو سلگ اٹھی ہو جیسے...... ایک چوبارے میں سے کسی نے کہا، ''آج تو لوہاروں کا دن ہے۔''

دور سے کوئی بولا، ''باقیوں کی نانی تو نہیں مرگئی۔''

اس پر دونوں چوباروں میں بات بڑھی اور اپنی اپنی یار کی شہ پا کر دلیر ہو گئے۔ پہلی کھڑکی والے نے سوڈے کی بند گولی والی بوتل کھینچ ماری۔ جالے لوہار کی یار الٹ کر پیچھے جا پڑی۔ جالا بجلی کی سی تیزی سے نیچے آیا اور بند پیلے کواڑ پر ڈبل اینٹیں مارنے لگا۔ کواڑ نہ کھلا تو اس نے پورے زور سے ڈبل اینٹ اٹھا کر کھڑکی پر ماری جو شیشہ توڑ کر اندر چلی گئی، ایک چیخ اٹھی۔ آس پاس کے چوبارے اور بیٹھکیں سناٹے میں آگئیں۔ گلی میں حیرت اور خوف کی لہر دوڑ گئی۔

پھوجا کاٹی مار نہانا چھوڑ کر منڈیر پر بیٹھ رہا۔ بالی نے کہنی ٹیک کر ایک ہاتھ پر ٹھوڑی رکھی اور ابھرتی ہوئی چیخیں سننے لگیں۔

اس روز جالے نے دو خون کیے۔ اس کی اپنی بھی ایک آنکھ ضائع ہوئی۔''

اس کے بعد گلی میں سناٹا طاری ہو جاتا ہے لیکن کہانی جاری رہتی ہے۔

ان چھوٹے چھوٹے واقعات اور ہولناک نتائج سے رحمان مذنب صاحب کہانی کا تار پود تیار کرتے ہیں لیکن دیکھنے کی بات یہ کہ ان واقعات کے ڈرامائی عناصر کو وہ کس خوبی سے اجاگر کرتے اور کتنے کم الفاظ میں کیسی بھرپور تصور پیش کر دیتے ہیں۔ ان کا یہ کارنامہ ایک بڑی حد

تک ان کے اسٹائل کا ہی رہینِ منت ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے متحرک اور تیز جملے لکھتے ہیں لیکن نہ صرف یہ کہ ان میں کسی قسم کا جھول نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک دوسرے سے مربوط اور ہم آہنگ بھی ہوتے ہیں اور مسلسل حرکت، تڑپ اور ہلچل کو منظرِ عام پر لانے میں مدد دیتے ہیں۔ یہاں بھی ڈرامے سے ان کا گہرا شغف رنگ لایا ہے چنانچہ ان کے جملوں کا اختصار ڈرامے کے مکالموں کی مختصر اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہہ دینے کی روش سے براہ راست متاثر ہوا ہے۔

تقسیم کے بعد اردو افسانے کے انحطاط و زوال کی کہانی آج زبانِ زد خاص و عام ہے اور چونکہ بات چل پڑی ہے اس لئے وہ لوگ بھی جو دوسروں کے اخذ کردہ نتائج کو عام طور سے قبول کر لینے کے عادی ہیں افسانے کو زوال آمادہ قرار دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کو رحمان مذنب کے افسانے پڑھنے چاہئیں تا کہ وہ محسوس کر سکیں کہ تقسیم کے بعد بھی اردو افسانہ نے ارتقاء کی بہت سی منازل طے کی ہیں اور اس میں کردار نگاری کے علاوہ جزئیات نگاری کی ایک ایسی روش پیدا ہوئی ہے جو اردو افسانے کے مستقبل کے لئے ایک نیک فال ہے۔

.................o.................

تجھے ہم ولی سمجھتے

ریاض احمد

آنجہانی منشی تلوک چند مرحوم اس صدی کے اوائل ہی سے اردو کے نامور شعراء میں شامل ہو گئے تھے۔اس وقت کی درسی کتابوں میں دسویں جماعت تک کوئی ایسا درجہ نہیں تھا جس کے اردو نصاب میں منشی صاحب کی منظومات شامل نہ ہوں۔ یہاں اگر کوئی ان کا حریف تھا تو صرف مولوی اسمٰعیل میرٹھی تھے۔نظیر اکبر آبادی کا مقام و مرتبہ بہت دیر بعد جا کر دوبارہ متعین ہوا لیکن اب بھی ان کی دو چار ہی نظمیں ہیں جو نصابوں میں راہ پاتی ہیں۔علمی حلقوں میں بھی محروم کو ایک مقام حاصل تھا اور اسی حیثیت سے ان کا ربط ڈاکٹر داؤد رہبر کے والدِ گرامی ڈاکٹر محمد اقبال سے بھی تھا جو اورینٹل کالج کے اساتذہ میں بلند مقام رکھتے تھے۔منشی صاحب موصوف کے صاحبزادے جگن ناتھ آزاد بھارت میں اقبال شناسی کے حوالے سے ایک بلند مرتبے پر فائز ہیں۔ایک محفل میں داؤد رہبر کی آزاد سے بھارت میں ملاقات ہوگئی تو انہوں نے پرانی یادوں کی نسبت سے آزاد کو منشی جی کہہ کر خطاب کیا۔اس پر جس جس نے بھی سنا وہ چونکا،خود آزاد بھی ٹھٹک کر رہ گئے کہ یہ کس عہد کی زبان میں گفتگو کر رہے ہیں کہ آزاد اپنے نام کے ساتھ یہ لقب استعمال نہیں کرتے۔ بھارت میں کون ہے جو ان کے اس خاندانی لقب سے آشنا ہو یا داؤد رہبر کی طرح زمانہ طالب علمی کا شناسا ہو۔یوں منشی کا لقب مغل عہد کے فرمان نویسوں کی نسبت سے، بہت معتبر ہے۔

یہ قصہ یوں ہی در نہیں آیا۔اپنے ہاں بھی یادش بخیر ایک مفتی صاحب ہیں جنہیں آج تک کسی نے مفتی صاحب کہہ کر خطاب نہیں کیا۔یہ اس وجہ سے نہیں کہ مفتی کی نسبت میں کوئی ہتکی کا پہلو نکلتا ہے۔شعر و ادب میں بھی فقیہہ و محتسب زیادہ معتوب ہیں، مفتی سے تعرض کم ہی کیا گیا ہے۔ دور کیوں جایئے ہمارے عہد میں ممتاز مفتی کی نسبت اتنی معتبر ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے تو لوگ

بڑھ چڑھ کر مفتی کہلوانا چاہیں گے۔

جب کہہ کے ریاض اس نے پکارا سرِ محفل
بن بن کے کئی آدمی اس نام کے اٹھے

ذرا پیچھے چلیے تو مفتی صدرالدین آزردہ ہیں کہ ان کا یہ شعر ضرب المثل بن چکا ہے:

کامل اس فرقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے بھی تو یہی رند قدح خوار ہوئے

البتہ یوں ہوسکتا ہے کہ مفتی عزیز الرحمان نے سوچا ہو کہ پہلے دو کے ہوتے ہوئے مفتی نہ ہی کہلائیں تو بہتر ہے بلا سے لوگ رند قدح خوار کہہ کر بدنام کرتے رہیں لیکن یہ کوئی بات تو نہ ہوئی خود شعر کہنے والے مفتی کہلائے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ کامل الفن تھے۔ علامہ مفتی عبداللہ ٹونکی اور مفتی عبدالستار سے ننھالی اور ددھیالی رشتے کچھ ایسی گئی گزری بات بھی نہیں کہ آدمی منہ چھپاتا پھرے۔ سنا ہے کہ مفتی عزیز الرحمان در پردہ یہ خواہش رکھتے ہیں کہ کوئی انہیں اس نام سے پکارے۔ عزیز واقربا تو خیر انہیں اسی نام سے پکارتے ہوں گے لیکن عمر کے جس حصے میں ہم لوگ ہیں وہاں نام لے کر پکارنے والے کہاں باقی رہتے ہیں صرف ان کی یاد باقی ہوتی ہے۔ بزرگوں میں اب ایسا کون ہے جس نے مفتی عبداللہ ٹونکی اور مفتی عبدالستار کی آنکھیں دیکھی ہوں اور موخرالذکر کے لئے مفتی عزیز الرحمان کو فتوے نویسی کرتے دیکھا ہو جوان سے عزیز الرحمان کہہ کر مخاطب ہو اور اصل بات تو یہ ہے کہ مفتی عزیز الرحمان کی خواہش بھی کچھ اور ہے۔ وہ چاہتے ہوں گے کہ انہیں اس نام سے وہ پکاریں جو دنیائے ادب میں ان کے ہم مشرب ہیں، ہم عہد ہیں اور ان کے مرتبے سے آشنا لیکن ایسا کرے تو کون؟ کسی کو انہوں نے کبھی اس سلسلے میں کچھ بتایا بھی ہو۔ رہے سادھو سنت تو ان کا اپنا محاورہ ہوتا ہے اپنا لہجہ ہوتا ہے۔ کبھی بچے کو بابا کہہ کر پکاریں کبھی بوڑھوں کو "بچہ" یہ روشن ضمیر ہوتے ہیں۔ جہاں تک بندے بشر کی ذات کا تعلق ہے ان کے نزدیک بس ایک ہی نسبت معتبر ہے۔ رحمان کا گنہگار بندہ۔

اب ہم وہاں آگئے ہیں جہاں بجھارتوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ تو قصہ یوں ہے کہ ڈاکٹر انور سدید جو ہفت خوان ادب کے رستم ہیں ایک ایسے مسافر ہیں کہ کوئی گوشہ، کوئی طلسم اس ملک کا

ان کی دسترس سے باہر نہیں۔ جہاں چاہتے ہیں بے خطر چلے جاتے ہیں اور دور دور کے علاقوں کی خبریں لاتے ہیں۔ کچھ عرصہ پیشتر انہوں نے رحمان مذنب سے ایک تفصیلی گفتگو کی تھی اور روئیداد اس کی اوراق میں شائع کی تھی۔ پھر حال میں انہوں نے ''علامت'' میں یہی سلسلہ دہرایا ہے۔ گفتگو کے آغاز میں ڈاکٹر انور سدید نے رحمان مذنب کے خاندانی پس منظر کے حوالے سے یہ سوال کیا تھا کہ وہ تربیت جو انہیں اس مذہبی ماحول میں نصیب ہوئی، اس کے اثرات ان کی تخلیقات میں نہیں ابھرے تو کیوں اور ابھرے ہیں تو کس رنگ میں۔ رگوں میں دوڑتا ہوا پاکیزہ خون، سماعت کے پردوں پر قال اللہ وقال الرسول کی گونج، گھر میں اپنے وقت کے جید علماء کی محفلیں، بھوپال میں اپنے عزیزوں کے ہاں علمی ادبی محفلوں میں شرکت کچھ اتنا بے وقعت سرمایہ بھی نہیں کہ اسے بازار میں لٹا کر آدمی خالی ہاتھ اور خالی دامن ہو جائے۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ رحمان مذنب کسی سے دبتے نہیں۔ کہنے کی بات برملا کہتے ہیں اور برسرِ بزم۔

ذہانت اور فطانت کا جوہر ان کو وافر مقدار میں ملا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر حالات نے یاوری کی ہوتی اور انہیں تعلیم مکمل کر کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کا موقع مل جاتا اور وہ کسی بڑے عہدے پر فائز ہوتے تو ان کے علم وفن کے قصیدہ خواں گنتی میں نہ آتے۔ کم از کم ان کے ٹی وی کے کھیل ''پتن'' کے لئے انہیں نظرانداز تو نہ کیا جاتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا افسر بن کر پتن لکھ سکتے۔ ساتھ ہی دوسرے لمحے یہ خیال بھی آتا ہے کہ بیشک اس ملک میں علم وفن کی جانچ کا پیمانہ بھی ''کرسی'' ہے تاہم رحمان مذنب نے کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ اب جن مقامات کا ذکر بلاتکلف کر جاتے ہیں پھر شائد ان کا ذکر کرنے سے کنی کترا جاتے۔ اس ''بازار'' کی بات ہم تک نہ پہنچا سکتے۔ کرسی کی بات میرے ذہن میں اس وجہ سے بھی آئی کہ افسانے کے فن میں انہیں جو تخصیص حاصل ہے اس کو بھی ابتداء میں زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ لوگوں نے ان کے فن کو سمجھنے کی کوشش تک نہیں کی۔ سرسری انداز میں ''جنس'' کی تہمت ان کے ذمے دھر کے چلتے بنے لیکن جنس کا چٹخارہ ان کے افسانے میں نہیں ہے۔ ان کا موضوع تو ایک ادارہ ہے لاکھ بدنام سہی لیکن بہرحال موجود ہے۔ کہتے ہیں بھلے وقتوں میں اس ادارے میں شرفاء اپنے بچوں کو آدابِ مجلس کی تربیت کے لئے بھیجتے تھے۔ پھر اس پر زوال آیا۔ ادارے کی روایات باقی نہ رہیں۔

آغا بابر نے لکھا ہے کہ حکیم احمد شجاع کے ہاں ایک شادی کی تقریب میں ہیرا منڈی کے لوگ بھی اسی طرح مدعو کئے گئے تھے جس طرح شہر کے شرفاء اور خدا لگی یہ ہے کہ رونق کچھ انہی کی طرف زیادہ تھی۔ پھر انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ملک کے سرکردہ سیاسی خاندانوں کے حالات کی صحیح اندازہ دانی بھی کچھ انہی لوگوں کا حصہ ہے۔ بہر حال یہ ایک اور داستان ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ رحمان مذنب نے طوائف کے ادارے کی نقشہ کشی کی ہے لیکن یہ نکتہ سوجھا بھی تو کہیں دیر کے بعد، وزیر آغا اور ان کے مکتبِ فکر کے علمبرداروں کو۔ ان کو اگر رحمان مذنب یوں کہیں کہ

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

تو ان کا دعویٰ اتنا ہی معتبر ہوگا جتنا خود میر کا لیکن دونوں کو اپنی شناخت کے لئے بہت دیر انتظار کرنا پڑا۔ میر صاحب بھی ''پسنش غائت پست'' کا ایک مدت تک ہدف بنے رہے۔

میں بھی بہت گیا ہوں۔ بات تو اس تربیت کی تھی، اس ماحول کی تھی جس کا مرکز مفتی عزیز الرحمان کا گھر تھا اور میں بے دھیانی میں بازار کی طرف نکل گیا۔ رحمان مذنب صرف افسانہ نگار نہیں ہیں اگرچہ اپنی جگہ یہ بھی کچھ ایسا کم اعزاز نہیں ہے جسے نظر انداز کیا جائے یا جس پر کسی کو خفت کا احساس ہو۔ بطور افسانہ نگار ان کو ایک خاص مقام یا انفرادیت حاصل ہے۔

ڈاکٹر وزیر کا قول سند کا درجہ رکھتا ہے۔

''انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی شاہکار افسانے لکھ کر اہلِ نظر کو چونکا دیا۔ ان کا محبوب موضوع طوائف کا موحول تھا۔ اس خاص میدان میں ان کا کوئی حریف بھی نہیں تھا۔ سعادت حسن منٹو بھی نہیں...... دوسری طرف رحمان مذنب تھے اس تصادم سے اوپر اٹھ کر طوائف اور اس کے پورے ماحول کو ایک ادارے کی صورت میں پیش کرتے ہوئے اس کے سارے پیچ وخم کو آئینہ کر دیا۔ رحمان مذنب کے اسلوب میں بھی ایک انوکھا ڈرامائی عنصر تھا۔''

تاہم رحمان مذنب کی خالص علمی فتوحات بھی ایسی نہیں کہ ان کے افسانے کے سامنے

دب کر رہ جائیں۔" انہوں نے ڈرامے لکھے، ترجمے کیے، تحقیقی اور علمی مقالات لکھے، اخبارات اور ڈائجسٹوں میں لکھا۔ جناب صابر لودھی نے صرف داستان کی سرخیاں لکھی ہیں، اصل داستان حیرت انگیز حد تک طویل ہے۔ انہوں نے اسلام، مذاہب کا تقابلی مطالعہ، دبستان ساحری، یونانی تھیئٹر اور اساطیر وغیرہ کے متعلق بھرپور مقالے یا کتابیں لکھی ہیں۔ ایک قصہ عبرت انگیز ہے اور رحمان مذنب کے عزم اور حوصلے کی گواہی بھی۔ انہوں نے "مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے" کے عنوان سے ایک کتاب کا ترجمہ کیا۔ اس کتاب کی حیثیت کا اندازہ صرف ایک بات سے ہو جاتا ہے کہ یہ 1971ء کی انعام یافتہ کتاب ہے لیکن ناشر نے پہلا مسودہ گم کر دیا۔ رحمان مذنب نے دوبارہ ترجمہ کیا اور پھر یہ کتاب "تہذیب و تمدن اور اسلام" کے نام سے شائع ہوئی۔ اب یہ کتاب تقریباً نایاب ہے۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ سیرت النبی ﷺ پر ان کی کتاب اشاعت کی منتظر ہے۔

انہیں مطالعہ کا شوق ہی نہیں بلکہ ایک طرح کا روگ ہے کہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ وہ جس موضوع پر ہاتھ ڈالتے ہیں اس میں ممکنہ حد تک کمال کو پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نایاب کتابیں حاصل کرنے کی سعی میں لگے رہتے ہیں۔ کتاب ملتی ہے تو اسے لفظاً لفظاً پڑھتے ہیں اور ہر لفظ پر ٹھٹکتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے بوطیقا کا ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا تو انہیں یہ محسوس ہوا کہ یونانی ڈرامہ کے مطالعہ کے بغیر یہ ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یونانی ڈرامہ پڑھا اور اب یہ منزل سامنے آئی کہ ڈراموں میں جو ساز و سامان نظر آتا ہے وہ آنکھ کے سامنے ہو تو کردار کا صحیح روپ ظاہر ہو۔ چنانچہ اب وہ اس راہ پر چل نکلے۔ پھر یونانی دیومالا کا مطالعہ بھی ناگزیر ٹھہرا۔ غرض اس ضمن میں انہوں نے یہ استعداد بہم پہنچائی کہ ان کے مقالے "اقبال" جیسے علمی رسالے میں مدیر محترم کی تحسین کے ساتھ شائع ہوئے بلکہ تقاضا ہوا کہ یہ مضامین "اقبال" کے لئے مختص کر دیے جائیں کہیں اور نہ چھپوائے جائیں۔ اس ضمن میں ایک قصہ بعض احباب سے سن رکھا ہے کہ کسی محفل میں یونانی ادبیات یا دیومالا کی بات ہو رہی تھی، رحمان مذنب سے موضوع پر روشنی ڈالنے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے فی البدیہہ معارف و معلومات کا وہ مظاہرہ کیا کہ ڈاکٹر وزیر آغا جو خود اس موضوع پر کامل دستگاہ رکھتے ہیں، یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ "رحمان مذنب تو یونانی دیومالا کے حافظ ہیں۔"

یہ تو خیر ادب اور ادب سے متعلقات کی بات تھی۔ رحمان مذنب نے جب واپڈا کے

رسالے کی ادارت سنبھالی تو انہوں نے ماحولیات Hydrology Hydraulics وغیرہ سائنسی علوم پر قابلِ قدر کام کیا۔ یہاں وہ نہ مفتی عزیز الرحمان تھے نہ رحمان مذنب افسانہ نگار بلکہ ایک تیسری شخصیت۔

'دیکھا جائے تو انسان کو عمل پر ابھارنے والے محرک دو ہی ہیں، ذوقِ جمال اور ذوقِ کمال۔ مشقت دونوں میں یکساں پڑتی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ پہلی صورت میں مشقت مقصود بالذات ہوتی ہے، دوسری صورت میں مشقت صرف ایک وسیلہ مقصود۔ شاعر کی زبان میں ذوقِ جمال کی روداد یوں ہے۔

علی الصباح کہ مرداں بہ کاروبار روند
بلا کشان محبت بہ کوئے یار روند

انسان کوچہ کوچہ پھرتا ہے، رسوائیاں سمیٹتا ہے، پتھر کھاتا ہے لیکن طبیعت کے طور سے مجبور کوچہ گردی چھوڑ نہیں سکتا۔ غالب نے مجنوں کو ذوقِ جمال کا نمائندہ سمجھا تھا اور فرہاد کو ذوقِ کمال کا۔ مجنوں کے لئے صحرانوردی ہی مقصود و مطلوب تھی۔ محمل کی جھلک تو ایک بہانہ تھا۔ فرہاد نے بیستوں کاٹا تو شیریں کو حاصل کرنے کے لئے۔

غالب بساطِ عشق ہیں مجنوں سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا جاں تو دے سکا

رحمان مذنب کے ہاں یہ دونوں محرکات یکساں سرگرم رہے ہیں۔ ایک قصہ مجھ سے سنیے، دوسرے کا تذکرہ ان کی زبانی۔

رحمان مذنب کی عمر ابھی زیادہ نہیں ہوگی کہ ان کے گھر کے سامنے سے ایک بارات گزری۔ اس زمانے میں باراتیں دولہا کے گھر سے دلہن کے گھر تک پیدل جاتی تھیں۔ دولہا گھوڑے پر سوار ہوتا تھا۔ آگے آگے بینڈ بجانے والے دھنیں بکھیرتے ہوئے چلتے تھے۔ رحمان مذنب کو دھن کچھ ایسی اچھی لگی کہ سُر تال پر قدم بڑھاتے ہوئے بارات کے پیچھے پیچھے شاہ عالمی دروازے تک پہنچ گئے۔ اس زمانے کی شاہ عالمی کی پر پیچ تنگ گلیوں کا تصور کیجئے اور سوچئے کہ واپس گھر پہنچنے کی سبیل کیا رہی ہوگی۔ بہر حال دن اچھے تھے۔ کسی بھلے مانس نے انہیں

انگلی لگایا اور گھر چھوڑ گیا۔ ادھر گھر والے پریشان۔ والد صاحب قبلہ نے روداد سنی تو بید نکال لیا۔ اب رحمان مذنب صاحب پٹتے ہیں لیکن ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ نہ گزشتہ پر ندامت کا اظہار کیا نہ آئندہ کے لئے توبہ۔ مفتی صاحب مرحوم و مغفور سمجھ گئے کہ اس بچے کے لئے کوچہ گردی خدا کے مقدرات میں سے ہے، خود ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ نہ کوئی نصیحت کی نہ آئندہ کے لئے روک ٹوک چنانچہ رحمان مذنب گلی کوچوں کی سیریں دیکھتے رہے۔ کوٹھوں پر گئے۔ رسوائیوں کے تماشے دیکھے۔ دلوں کے سودے ہوتے دیکھے۔ اہلِ دل لٹتے رہے۔ تماشبین اجڑتے رہے لیکن کسی نے عبرت نہ پکڑی۔ رحمان مذنب مشاہدات سے دل و نظر کی آبادی کا سامان مہیا کرتے رہے۔ کبھی عزیز تھیٹر میں بزم سجائی، کبھی داستان سرائی کا بازار گرم کیا۔ اس ساری مشقت میں انہوں نے کیا کھویا کیا پایا۔ بس یوں سمجھ لیجئے :

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر

''علمی و ادبی کام خواہ کیسا ہی ہو میرے لئے چیلنج کی صورت پیدا رہی۔ افسانے یا ڈرامے کی تخلیق ہو، تحقیق ہو، ترجمہ یا کچھ اور ہو میں نے چیلنج سمجھ کر ہی قلم اٹھایا۔ خوب جان ماری، خوب مشقت کی، مطالعہ کیا کتابوں اور افسانوں کا، ہر بندہ اور کتاب مانند میرے لئے علم و فن کا سرچشمہ ہوتا۔ کتاب اور آدمی کو ایک ساتھ جانا پہچانا۔ پھر جب خود کو مقابلے کے قابل جانا تو قلم اٹھایا۔ ''بنگلی جان'' اور ''یونان کا عہدِ جاہلیت اور دیومالا کا ارتقاء'' کے لئے یکساں طور پر محنت کی، زندگی اور علم و فن کی گردانی اور آگاہی کے سلسلے میں مقدور بھر پسینہ بہایا۔ اللہ کی عنایت شاملِ حال رہی اور پھر سرخرو ہوا۔ پھر اگر کسی مجلس یا ادارے نے کسی کام کی کھلے بندوں دعوت دی تو بلاتوقف مقابلے کے لئے ڈٹ گیا۔ ایسے میں خوشی کا کوئی اندازہ نہ ہوتا کیونکہ اس طرح اظہارِ ذات کا موقع میسر آتا اور یہ بھی پتہ چلتا کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔ مجھے اپنی ذات پر جو اعتماد ہوتا وہ اپنی جگہ لیکن اس طرح اپنا لوہا منوانے کی بات ہوتی۔ میرا مشن علم و ادب کی خدمت کرنا، علم و ادب کی روایت کو برقرار رکھنا، اسے بڑھانا اور علم و ادب کے ذخیرے میں اضافہ کرنا اور اسے Enrich کرنا ہے۔

یہاں میں علمی وادبی مقابلوں کا کچھ حال بیان کرتا ہوں............

قیام پاکستان سے بہت پہلے کی بات ہے۔ محمود نظامی لاہور ریڈیو کی روح ورواں تھے۔ ریڈیو کے لئے اردو ڈرامے طلب کئے گئے۔ باقاعدہ مقابلے کا اعلان کیا گیا۔ میں نے ڈرامہ لکھا اور بھیج دیا۔ منصفوں کی تعداد تو مجھے معلوم نہیں اتنا ضرور پتہ چلا کہ فیصلہ کرنے والوں میں ماہنامہ ''ہمایوں'' کے ایڈیٹر میاں بشیر احمد اور ریڈیو کے محمود نظامی شامل تھے۔ محمود نظامی کی شرکت تکنیکی ضرورت کی خاطر تھی۔ میرا ڈرامہ منتخب نہ ہوسکا۔ محمود نظامی کا نہایت مفصل خط موصول ہوا جس سے یہ راز فاش ہوا کہ ڈرامے کا ایک کردار پختونی لہجے میں مکالمے ادا کرتا ہے ورنہ میاں بشیر احمد نے میرے ڈرامے کو بہت سراہا ہے۔ چونکہ منتخب ڈرامہ ریڈیو پر پیش کرنے کے لئے تھا اس لئے تکنیکی لٹھ نے کمر توڑ دی۔ اس دور ہی میں نہیں بلکہ آج بھی تکنیکی اور اخلاقی الجھنیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ٹی وی نے تو خیر جوں توں کر کے بندھن توڑے ہیں لیکن اب یہ شتر بے مہار ہو رہا ہے۔ کلاشن کوف کلچر خوب مقبول ہے۔

یہ پہلا مقابلہ تھا۔ دوسرا مقابلہ پاکستان سائنس فاؤنڈیشن کی جانب سے منعقد ہوا۔ پاکستان سائنس فاؤنڈیشن ملک کا نہایت معتبر اور وقیع ادارہ ہے۔ انہوں نے ''وادئ سندھ کا ماحول'' کے موضوع پر مقالہ لکھنے کی دعوت دی۔ تب اکالوجی کا موضوع ہمارے یہاں غریب تھا۔ اس کا چرچا نہ ہونے کے برابر تھا۔ حسنِ اتفاق سے میں اکالوجی کا مطالعہ پہلے سے کر رہا تھا۔ میں نے اس موضوع پر امریکن لائبریری کی تمام کتابیں پڑھ لی تھیں۔ ہڈسن بے کی بحالی کی دستاویز بھی دیکھی تھی۔ Animal Ecology کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ یونیسکو کی کتاب Plant in Peril میرے چھوٹے سے کتب خانے میں موجود تھی۔ ای کارپوف اور راس نیلسن کی Indus Valley کا مسودہ ترجمے کی غرض سے میرے تحویل میں تھا۔ میں اس کا ترجمہ واپڈا کے جریدے ماہنامہ ''برقاب'' میں شائع کر رہا تھا۔ پاکستان سائنس فاؤنڈیشن کے اعلان سے میری بن آئی۔ میں نے قلم اٹھایا اور 34 کروڑ سال قبل سے وادئ سندھ کے ماحول کا آغاز کیا۔ یہ زمانہ بہت اہم ہے کیونکہ تب ہمالیہ کا سلسلہ کوہ نمودار ہوا اور جوں جوں یہ ابھرتا گیا، اس کی جڑ بنیاد خالی ہوتی گئی اور اس کی جگہ لینے کے لئے پنجاب کی مٹی سرکتی گئی۔ اس لینڈ سلائیڈ سے یہاں بہت بڑا گڑھا پیدا ہوا۔ دریائے

شوالک کے دھارے (پنج ند) یہاں گار لانے اور اپنا پانی انڈیلنے لگے۔ اس طرح پنجاب ساگر معرضِ عمل میں آیا۔ گنگا الٹی بہنے لگی اور ہمالیہ کے سلسلے نے دریاؤں کے دھارے تتر بتر کر دیئے۔ الحمدللہ میرا مقالہ اوّل آیا اور بعدازاں جو تعریفی خط ملا اس سے معلوم ہوا کہ اس مقابلے میں 73 حضرات نے حصہ لیا۔ 72 سائنس دان تھے، میں Non-Scientist تھا اور مقابلہ جیت گیا۔

"یہ مولا کا کرم تھا۔"

ایک اور موقع پر پاکستان رائٹرز گلڈ اور پاکستان ترقی ادب (کراچی) کے اشتراک سے بچوں کے ناولٹ لکھنے کی دعوت گئی۔ اب اگر آپ حوصلہ کر کے رحمان مذنب کی نثری تصنیفات پر ہی نظر ڈال لیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ انہوں نے جتنا کچھ لکھ ڈالا ہے۔ اسے تو پڑھنے کے لئے بھی ایک عمر چاہیئے۔ وہ موضوعات یا وہ علمی و ادبی شعبے جن میں انہوں نے کام کیا۔ ان کی تفصیل ملاحظہ کیجئے:

1۔ ناول 2۔ ڈرامہ 3۔ افسانہ 4۔ ڈرامہ اور تھیٹر کی تاریخ 5۔ تحقیقی مقالے 6۔ ترجمہ 7۔ خاکہ نگاری 8۔ آپ بیتی 9۔ شاعری 10۔ بچوں کیلئے کہانیاں 11۔ جاسوسی کہانیاں 12۔ یونانی تھیٹر اور بعض یونانی ڈرامہ نگار 13۔ دین ساحری 14۔ ریڈیو فیچر 15۔ اسلام اور جادوگری 16۔ بوطیقا کا پنجابی ترجمہ مع دیباچہ و حواشی۔

دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان میں سے صرف افسانے کے حوالے سے "بقدر لب و دندان" یاروں نے کلام نکالا لیکن دوسرے مضامین کو وہ پذیرائی نصیب نہ ہوئی جس کے وہ حقدار تھے۔

ایسی جنس فراہم کرنی جس کا گاہک کوئی نہ ہو
لادے لادے پھرتا ہوں پشتارہ اک ارمانوں کا

اب اتنا جھوٹ بولنے پر مجبور نہ کیجئے کہ میں کہوں کہ میں نے رحمان مذنب کی سب تصانیف پڑھ رکھی ہیں۔ میں تو اوپر یہ اعتراف کر آیا ہوں کہ یہ سب کچھ پڑھنے کے لئے تو ایک عمر چاہیئے البتہ یہ دعویٰ کسی شخص کے منہ سے سچا لگے گا کہ وہ ڈاکٹر انور سدید ہیں۔ رہی یہ بات کہ ان کی علمی اور فنی مہارت کے متعلق کچھ کہنا تو یہ حق بھی اس کو پہنچتا ہے جس نے سب پڑھا ہو اور پھر ان علوم پر دسترس بھی رکھتا ہو جن پر رحمان مذنب نے لکھا ہے۔ بعض لوگوں کی فتوحات کچھ ایسی ہوتی ہیں کہ اپنی خواہش کے باوجود آپ ان کے متعلق لکھنے سے اپنی خامکاری کی وجہ سے جھجکتے ہیں ان

میں نمبر ایک ڈاکٹر وزیر آغا ہیں پھر ڈاکٹر فہیم اعظمی یا پھر رحمان مذنب۔ خدا جانے رحمان مذنب نے اتنا کچھ کیسے لکھ لیا۔ کوئی کمپیوٹر یا بھلے زمانے کا کوئی جن ان کے قابو میں ہے کہ ادھر ان کے ذہن میں کوئی مضمون آیا ادھر کھٹا کھٹ مضمون، افسانہ، ڈرامہ، کہانی، جاسوسی ناول، تحقیقی مضمون، بچوں کے لئے کہانیاں، علمی اور خالص سائنسی موضوعات پر دقیع مضمون لکھا لکھایا سامنے آگیا۔ یہ سب کچھ ہے لیکن ایک بڑی بات جس کی طرف احباب نے عموماً توجہ نہیں دی، وہ رحمان مذنب کی کشادگی ظرف ہے۔ اتنا کچھ لکھ چکنے یا لکھ لینے کے باوجود انہوں نے کبھی کسی ادعا یا ہچو ما دیگرے نیست قسم کے رویئے کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کبھی کبھی وہ بپھر جاتے ہیں اور اس کے دو سبب ہوتے ہیں بلکہ ایک ہی سبب ہوتا ہے، وہ ہے غلط بیانی۔ لوگوں نے انہیں جنس نگار کہا، وہ چڑ گئے۔ انہوں نے وضاحت کی، بھائی میں جنسی جنون، شغف یا خبط Complex کا مریض نہیں ہوں۔ میں نے تو طوائف کے ادارے کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے کوائف افسانوں میں ڈھالے ہیں۔ بات ان کی درست ہے۔

مرحوم شہزاد منظر نے اپنی کتاب ''پاکستان اردو افسانے کے پچاس سال'' میں ان کا ذکر صرف تین مقام پر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''لیکن 50 کے عشرے میں عزیز احمد، ضمیر الدین احمد، آغا بابر اور رحمان مذنب ایسے افسانہ نگار ہیں۔ خصوصاً آخر الذکر تینوں افسانہ نگاروں نے جنس کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا'' باقی دونوں جگہ افسانہ نگاروں کی فہرست میں ان کا نام تو شامل ہے لیکن ان کے فن یا موضوعات کے متعلق ایک لفظ تک نہیں لکھا۔ اب اگر رحمان مذنب یہ کہیں تو وہ حق بجانب ہیں۔ ''اردو تنقید'' بالخصوص اردو افسانے کے حوالے سے عصبیت کا شکار رہی۔ پہلے ایک گروہ آیا، اس نے گنگا جمنی فنکاروں کو خوب خوب اچھالا اور مجھ ایسے افسانہ نگار، ڈرامہ نویس اور محقق کے افسانے، ڈرامے اور مقالے حلقۂ ارباب ذوق کی نشستوں میں بیٹھ کر سنے لیکن جھوٹ موٹ بھی کلمہ خیر منہ سے نہ نکالا۔ حلقے کے کسی نقاد نے مجھ پر مقالہ نہیں لکھا۔ الغرض اپنوں اور پرایوں کی ذاتی مصلحتیں اور پیشہ ورانہ رقابتیں نیز میری بے نیازی یا درویشی مجھے کھا گئی۔

(رحمان مذنب سے ایک طویل ملاقات ڈاکٹر انور سدید اوراق جون جولائی 1995ء)

یا اگر سراج منیر پر گرفت کریں تو اس میں غلط کیا ہے:

''جب انہوں نے اروِن گھوش کی کتاب The Dance of Shiva کا حوالہ دیا تو میں نے انہیں پکڑ لیا۔ یہ حوالہ دے کر انہوں نے باقی حوالے بھی مشکوک کر دیئے۔ سراج منیر ہمہ دانی کا شوق پورا کرنے کی نیت سے غلط ملط حوالے دیا کرتے ہیں۔'' (خط بنام ڈاکٹر انور سدید ایضاً)

اس سلسلے میں میرا بھی ایک تاثر ہے۔ کہتے ہیں بد سے بدنام برا۔ چنانچہ حلقہ کے کم از کم دو افراد کے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یار لوگوں نے کبھی سنجیدگی سے ان کے متعلق بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک مرحوم شاد امرتسری تھے اور دوسرے رحمان مذنب۔ اس پر ستم ظریفی دیکھئے کہ جس دن حلقہ کے پروگرام میں رحمان مذنب کا افسانہ پروگرام میں شامل ہو۔ اس دن ٹھٹھ کی ٹھٹھ لگ جاتے تھے، نشستیں کم پڑ جاتی تھیں۔ حلقے میں عموماً یہ تاثر (غلط ہی سہی) جڑ پکڑ گیا تھا کہ یہ دونوں صاحبان ''خوش وقت'' قسم کے واقعہ ہوئے ہیں۔ یہ لفظ غالباً نظیر اکبر آبادی نے پہلے استعمال کیا تھا۔ کچھ اس طرح خوش وقت ہوئے، دل شاد ہوئے اور چل دیئے۔ یعنی یہ کہ زندگی ان کے لئے کوئی سنجیدہ حقیقت نہیں ہے۔ تقابل کسی کی تنقیص یا تحقیر مقصود نہیں صرف ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ریاض قادر مرحوم انگلینڈ میں زیرِ تعلیم تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے باعث انہیں تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔ انہوں نے حلقہ میں ''المیہ'' کے متعلق ایک مضمون پڑھا جس پر انہیں بے حد داد دی گئی۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ یہ تو ان کے کلاس سیمسٹر کا ایک جز و تھا۔ رحمان مذنب نے یونانی ڈرامہ اور یونانی اساطیر پر زبردست مقالے لکھے لیکن آج شائد کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ مقالے لکھے گئے اور اقبالؒ جیسے وقیع علمی اور تحقیقی رسالے کی زینت بنے۔ اسی طرح ایک نشست میں شاد امرتسری نے جو اپنی لاابالی کھلنڈری طبیعت کی وجہ سے بدنام تھے۔ حیات و موت پر اس قدر گہری باتیں کیں کہ اس مجلس سے واپسی پر میں نے یہ شعر گھڑا......

سنا ہے درد کی شمعیں جلائے بیٹھے ہیں
وہ میرے دوست کہ ہیں دیکھنے میں خام بہت

اس میں خام تو وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کو خام سمجھتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ نکتہ میری سمجھ میں آئے رحمان مذنب نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا اس میں ان کی عظمت کا ایک اور پہلو نکلتا ہے۔ ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ ''مقام و مرتبہ'' کے تعین کا وہ بھونڈا انداز ہے جو پاکستان میں

بالعموم رائج ہے۔ کبھی بڑا عہدہ، کبھی P.R میں مہارت بعض لوگوں کو خواہ مخواہ اہم بنا دیتی ہے اور پھر وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں اس پر واہ، واہ ''سبحان اللہ'' کے ڈونگرے برستے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کو البتہ یہ توفیق ارزانی ہوئی ہے کہ انہوں نے اگرچہ ''بت شکنی'' پر تو زیادہ زور نہیں دیا لیکن جہاں کسی کے صحیح Image کو واقعی ابھارنے کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں انہوں نے دریغ نہیں کیا۔

رحمان مذنب کی ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے جس کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ اگلوں کو تو سب مانا کرتے ہیں لیکن جیسے غالب کو کہنا پڑا کہ ''مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست'' ایک روش ہمارے ہاں یہ چل نکلی ہے کہ چھوٹے بندے بڑا بول بول کر اپنے ہم عصروں کی پگڑی اچھالیں تو بہت اہمیت مل جاتی ہے۔ کچھ لوگوں نے اس ہنر سے خوب فائدہ اٹھایا اور بڑے کہلائے۔ اس کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ فی زمانہ اخبار کے ادبی ایڈیشنوں میں بعض نو آموز شاعروں یا نقادوں کے ''انٹرویو'' چھاپے جاتے ہیں جس میں وہ ایک یا بعض اوقات پوری نسل کے شاعروں یا ادیبوں کو یک قلم مردود، مقہور اور غلط کار وغیرہ کہہ دیتے ہیں اور یوں ان کا بونا قد اونچا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ رحمان مذنب کی ایک کمزوری یا خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے پیش روؤں اور ہم عصروں کی اہمیت کا اعتراف کھل کر کیا ہے اور یہ اس بات پر دال ہے کہ وہ کمتری یا برتری کی نفسیاتی الجھن سے محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے نام اپنے خط مورخہ 11 دسمبر 1975ء میں انہوں نے کتنے ہی نام ایک سانس میں گنوائے ہیں جنہیں وہ ستاروں کی درخشاں کہکشاں قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید سے ایک ملاقات میں بھی انہوں نے اس کا اعادہ کیا ہے۔ (انٹرویو ''علامت'' فروری 1998ء)

یہی نہیں بلکہ انہوں نے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ ملاحظہ ہو غلام الثقلین نقوی کا مضمون ''اللہ کا گنہگار بندہ'' اس میں سے دو اقتباسات کرنے کی گستاخی کروں گا۔

''وہ عیب جوئی کے دلدادہ نہیں، ہنرش نیز بگو کے قائل ہیں۔ مجھے معلوم ہے ان کے سینے میں بڑے بڑے بزرجمہروں کے راز دفن ہیں۔ وہ ان رازوں کو باہر لانے کے لئے تیار نہیں۔''

''رحمان مذنب نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔''

''رحمان مذنب کی کوئی لابی نہیں، وہ پروپیگنڈے اور گروہ بندی کو ادب کے لئے

اچھا نہیں سمجھتے۔''

بات کو طول دینے سے کیا حاصل، غالب نے بھی یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دی تھی۔

شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

یہ بات کسی نیک ساعت میں ان کے منہ سے نکل گئی ہو گی کہ سچ ثابت ہوئی۔ رحمان مذنب تو اتنا کہنے کے بھی روادار نہیں۔ وہ پڑھتے ہیں، لکھتے ہیں کہ یہ مشقت ان کے نام لکھی جا چکی ہے۔ کوئی انہیں مانے نہ مانے، انہیں تو مشقت کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ان کے علمی اور تحقیقی مقالہ جات کو جب ان کے افسانوں کی شہرت کے پلڑے میں تولتا ہوں تو پھر غالب یاد آتا ہے۔

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مفتی عزیزالرحمان کے حسب و نسب کا تقدس برحق، ان کے علمی اکتسابات کا احترام واجب، تاہم ان فضیلتوں کے حامل تو اور بھی مل جائیں گے، نہیں ملے گا تو اس شہر مینو سواد کے ایک تہذیبی ادارے کا افسانہ 'سر' اور وہ حسن تکلم جو اس داستان سرائی کے لئے لازم ٹھہرتا ہے۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگی چشم حسود تھا

رحمان مذنب کا سینہ گہرہائے راز کا دفینہ ہے۔ میں ان بزرجمہروں کے رازوں کا تذکرہ نہیں کر رہا جن کا حوالہ پروفیسر غلام الثقلین نقوی دیتے ہیں۔ میں تو گہرہائے راز کی بات کرتا ہوں۔ خدا رحمان مذنب کو توفیق اور مہلت عطا فرمائے کہ وہ ان کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیں۔ بے شک رحمان مذنب بہت خوش گفتار ہیں، اردو اور پنجابی دونوں میں، انگریزی کی میں کہہ نہیں سکتا لیکن ان کا فن بہرحال تحریر ہے تقریر نہیں۔

..................O..................

اللہ کا گنہگار بندہ

غلام الثقلین نقوی

رحمان مذنب سے ادبی شناسائی تو بہت پرانی ہے لیکن باقاعدہ رابطے کی ابتداء 1970ء پی اینڈ ٹی کالونی چوبرجی لاہور کے بنگلے میں ایک محفل سے ہوئی جہاں اعجاز فاروقی صاحب ڈپٹی پوسٹ ماسٹر جنرل لاہور کی حیثیت سے مقیم تھے۔ اس محفل میں اعجاز فاروقی اور رحمان مذنب کے علاوہ عارف عبدالمتین، صلاح الدین ندیم، صادق حسین، صابر لودھی، فرخندہ لودھی اور راقم الحروف شریک تھے۔ اس یادگار محفل میں ''نئی ادبی تنظیم'' کی بنیاد رکھی گئی۔

شکل وصورت اور صحت کے اعتبار سے آج سے بیس اکیس سال پہلے کے رحمان مذنب اور آج کے رحمان مذنب میں مجھے کوئی فرق نظر نہیں آتا حتٰی کہ ان کے ارادوں کی جوانی اور خوابوں کی شادابی میں بھی کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ آج 78 ویں سال میں قدم رکھ چکے ہیں۔ حال ہی میں ان کے افسانوں کے تین مجموعے، پتلی جان، رام پیاری اور بالاخانہ شائع ہوئے ہیں۔ رام پیاری اور بالاخانہ کے ناشر ملک مقبول صاحب تھے۔ میں نے کہا، ''آپ نے رحمان مذنب کو پھر سے جوان کردیا ہے۔''

''وہ بوڑھے ہی کب ہوئے تھے۔'' ملک صاحب بولے۔

ابھی انہی دنوں ڈاکٹر انور سدید کے ہاں ان سے ملاقات ہوئی ہے۔ سفید رنگ کی جیکٹ اور نہایت خوش رنگ شلوار قمیض میں ملبوس رحمان مذنب کے چہرے پر تلطیر بددور شباب تازہ کی چمک نظر آئی۔ ابھی تحسین وتعریف کے الفاظ میرے ہونٹوں پر نہیں آئے تھے کہ ڈاکٹر صاحب بولے، ''رحمان صاحب! تجدید جوانی کا نسخہ ہمیں بھی بتائیے۔''

وہ تو ہنس کر خاموش ہو گئے لیکن میں نے کہا،"اس کے پیچھے بہت سے عوامل ہیں۔فوری عامل تو تیلی جان، رام پیاری اور بالا خانہ کی اشاعت ہے،ایک عامل دواء المسلک اور خمیرہ گاؤزبان عنبری جواہر والا ہے۔"

"مجموعے تو ہمارے بھی شائع ہوتے رہے ہیں اور گزشتہ پانچ سال سے ہم ان کی تقلید میں خمیروں والا نسخہ بھی آزمار ہے ہیں۔نتیجتاً آپ کے چہرے پر بڑھاپا بڑھتا رہا اور میری جوانی بھی لوٹ کر نہ آئی۔" انور سدید صاحب بولے۔

"ایک عامل اور بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"رجائیت اور اپنی ذات پر کامل اعتماد۔"

ان کے افسانوں کے مجموعے بہت دیر سے چھپے ہیں۔اپنے وقت پر چھپتے تو یقیناً ادبِ اردو کا غیر جانبدار مورّخ ان کا نام منٹو کے ساتھ لیتا۔رسالوں میں بکھرے ہوئے افسانوں کو کون یکجا کرتا ہے۔کم از کم اردو کا مورّخ اور نقاد تو یہ زحمت گوارا نہیں کرتا۔اچھے بھلے محقق کو بھی اتنی محنت سے عار ہوتا ہے چنانچہ اردو افسانے کے نقادوں نے کہ جن کی گنتی انگلیوں پر ہو سکتی ہے، انہیں کم ہی قابلِ اعتنا جانا۔

اس میں زیادہ قصور ان کی سہل انگاری کا نہیں بلکہ اصول پرتی کا ہے جسے ادیبانہ ضد کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ان کا ایمان ہے کہ ادیب کو اس کی ہر کاوش کا معاوضہ ملنا چاہیے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ لوگ اپنے خرچ پر کتابیں شائع کرتے ہیں اور اس پہ نام کسی ناشر کا ڈال دیتے ہیں۔اپنے اثر ورسوخ سے کتابیں بکواتے ہیں اور انہیں اصل زر بھی وصول نہیں ہوتا۔انہوں نے اپنا پہلا مجموعہ ایک ناشر کو دیا اور اس سے رقم وصول کی لیکن چھپا وہ دس گیارہ سال بعد۔ رحمان مذنب کی ضد پوری ہو گئی۔اصول قائم رہا لیکن زمانے کی مار کھا گئے۔

رحمان مذنب سے میری پہلی ملاقات آج سے تقریباً 35 سال پہلے ایک ناشر کے ہاں ہوئی۔اس ملاقات کو میں نے اسی رابطے کے لئے بچا کر رکھا ہوا ہے۔رحمان مذنب نے بھولے سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔وہ اس ملاقات کو یقیناً بھول چکے ہوں گے لیکن جس حوالے سے یہ

ملاقات ہوئی وہ اتنا اہم ہے کہ میں اسے نہیں بھول سکا۔

ہوا یوں کہ 1955ء میں، میں نے ایک ناول ''ایک منزل ...... بکھری راہیں'' کے عنوان سے لکھا۔ میں نے سمجھا کہ میں نے بہت بڑی تخلیق کی ہے، اسے منظرِ عام پر بھی آنا چاہیے۔ ایک سفارش موصوف ناشر تک رسائی کے لئے حاصل ہوئی۔ انہوں نے کمال مہربانی سے مسودہ رکھ لیا اور کہا کہ ایک مہینے کے بعد آیئے، اس وقت تک میں کچھ فیصلہ کرلوں گا۔ اس دن میرے ایک نہایت عزیز دوست شفیق احمد سیال مرحوم بھی میرے ہمراہ تھے۔ ناشر صاحب بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ بیٹھنے کو کہا، چائے بھی منگوائی۔ ناشر صاحب کی میز پر ان کے عین سامنے ایک سانولے رنگ کے نہایت بانکے سے ایک نوجوان بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

ناشر صاحب بولے، ''رحمان صاحب! یہ ناول تو دیکھیے۔''

وہ بولے، ''ابھی؟''

ناشر صاحب نے کہا: ''ہاں!''

''یہ کیسے ممکن ہے کہ پورا مسودہ آپ کے سامنے دیکھ ڈالوں۔ میں گھر لے جاؤں گا۔ ہفتے عشرے بعد پڑھ کر کچھ مشورہ دے سکوں گا۔''

اب ممکن ہے کہ یہ میرا واہمہ ہو لیکن میں نے دیکھا کہ ناشر صاحب نے جو خاصے بزرگ صورت تھے، رحمان صاحب کو آنکھ ماری اور کہا، ''دیگ میں سے ایک دانہ ہی چکھتے ہیں یا پوری دیگ؟''

رحمان صاحب نے بادل ناخواستہ ناول ہاتھ میں لیا، الٹا پلٹا اور ایک باب پڑھنے لگے۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا۔ یہ وہ باب تھا جس میں ہیرو کے پہلے شیر خوار بیٹے کی وفات کا ذکر تھا اور اس میں ہیرو کے رویئے پر اس کا اثر دکھایا گیا تھا۔ میں نے رحمان صاحب کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش بھی کرتا رہا لیکن افسوس کہ سنولاہٹ ہر تاثر کو ڈھانپ لیتی ہے۔

پورا باب پڑھنے کے بعد بولے، ''صاحب! تحریر تو خوبصورت ہے۔''

''لیکن یہ بھی دیکھیے نا رحمان صاحب کہ طوالت کتنی ہے!'' ناشر صاحب چڑ کر بولے۔

''ہاں! طوالت تو ہے۔''

''پھر آپ کا کیا فیصلہ ہے؟'' ناشر صاحب بولے۔

''اس پر نظرِ ثانی ہو سکتی ہے۔''

ناشر صاحب خوش ہو کر کہنے لگے، ''مسودہ لے جائیے۔ نظرِ ثانی کر کے لے آیئے۔ پھر کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔''

میں نے ناول کا مسودہ واپس لے لیا۔

جب ہم جانے کے لئے اٹھ رہے تھے تو ناشر صاحب بولے، '' آپ مایوس نہ جائیں۔ ایک صورت میں ناول چھپ سکتا ہے کہ آپ کی بجائے کسی لڑکی کا نام لکھ دیا جائے۔ کیوں رحمان صاحب؟'' ناشر صاحب کے اس استفسار کا رحمان صاحب نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ منہ پھیر لیا۔ ناشر صاحب کی پیشکش بھی بلا جواز نہ تھی کہ ان دنوں خواتین کے ناولوں کی بہت مانگ تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک پیشہ ور ناولسٹ مجبوراً خود لکھ کر ناول اپنی بیوی کے نام سے شائع کرتے تھے۔

شفیق صاحب نے پوچھا، ''یار! یہ بھیا کون تھا؟''

رحمان مذنب صاحب اتنے شین قاف سے درست لہجے میں اردو بولتے رہے کہ شفیق صاحب کو ان پر ''بھیا'' ہونے کا گمان گزرا۔ ویسے مجھے اب تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ''بھیّے'' ہیں یا ''ماجھے''۔ تفصیل بعد میں......

ناول کے متعلق رحمان صاحب کا فیصلہ بجا تھا، مکتبہ جدید کے ادبی مشیر حنیف رامے نے بھی نظرِ ثانی کا مشورہ دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں آج تک اس پر نظرِ ثانی نہیں کر سکا۔

شفیق صاحب کو میں نے بتایا کہ یہ صرف رحمان نہیں بلکہ مذنب بھی ہیں اور مشہور و معروف افسانہ نگار اور ڈرامانویس ہیں۔ ریڈیو سے اکثر ان کے ڈرامے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ ان دنوں دیال سنگھ کالج میں آفس انچارج ہیں۔ یہ بات مجھے اپنے ایک نہایت پیارے دوست حنیف بھٹی نے بتائی تھی جو دیال سنگھ کالج میں ڈی پی ای تھے اور شفیق صاحب کے اور میرے مشترکہ دوست ہیں۔ ڈی پی ای میں ان کے سوا مجھے کسی ادب شناس سے سابقہ نہیں پڑا۔ وہ رحمان صاحب کے چاہنے والوں میں سے ہیں۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ رحمان مذنب ناشر صاحب کے ہاں اچانک ملیں گے تو میں بھٹی صاحب سے سفارشی رقعہ لے لیتا لیکن یقین ہے کہ ناول پھر بھی نہ چھپتا۔

''نئی ادبی تنظیم'' کے قیام کے بعد رحمان مذنب سے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔ اتفاق سے ہمارے گھروں میں کچھ زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ میں بلال گنج میں رہتا تھا اور وہ کچاراوی روڈ کے ایک دومنزلہ مکان کی اوپر کی منزل میں۔ میں تقریباً ہر اتوار کو ان سے ملنے جاتا۔ نیچے کی منزل کی ایک کوٹھڑی میں ایک فلمی شاعر صاحبِ فراش تھے۔ کوٹھڑی سے باہر چارپائی پر تکیے کے سہارے بیٹھے ہوئے فکرِ شعر کرتے رہتے تھے۔ میں گھنٹی بجاتا تو وہ کہتے'' آیئے! دیکھیے! رحمان صاحب کس غضب کا گیت لکھا گیا ہے۔'' رحمان صاحب پڑھ کر بہت تعریف کرتے۔ یہ صاحب ایک میوزک ڈائریکٹر کے سسر تھے اور وہ انہیں اسی طرح بہلاتے رہتے تھے۔ رحمان صاحب بھی تعریف کے دو جملے کہہ کر اس کارِ خیر میں شریک ہو جاتے۔ یہ شاعر دو تین قبول صورت بیٹیوں کے باپ بھی تھے۔ ان سے مل کر دیر تک میرا دل غمگین رہتا!

رحمان صاحب لاہور کے پیدل آدمی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان دنوں وہ واپڈا میں افسر تعلقات عامہ تھے۔ پیدل دفتر جاتے اور پیدل ہی واپس آتے۔ مجھے بھی اتنا پیدل گھماتے کہ پنڈلیوں میں درد ہونے لگتا۔ جب میں رحمان مذنب صاحب کی راہنمائی میں کی ہوئی سیر سے لوٹتا تو دھم سے پلنگ پر گر پڑتا۔

میری بیوی کہتیں'' کیجئے سیر۔''

''کیا کروں رحمان صاحب کہیں بیٹھتے ہی نہیں کہ آرام کرلوں۔ خود تو تھکتے نہیں اور دوسروں کو تھکا کر چور چور کر دیتے ہیں۔''

''کیا وہ لوہے کے بنے ہوئے ہیں؟'' میری بیوی پوچھتیں۔

''اللہ بہتر جانتا ہے، ان سے پوچھوں گا۔''

اس سیر کی کچھ جھلکیاں جو مجھے یاد رہ گئی ہیں، پیش کرتا ہوں ...... کچاراوی روڈ ...... جناح پارک ...... پتنگوں کے اڑانے اور کٹنے کا منظر ...... اس زمانے میں نئی طرز کا پارک نہیں بنا تھا ...... ایک بزرگ پتنگ باز سے گفتگو جو کبھی کبھی ملتے ...... میں غنیمت جان کر ان کے پاس سبزے پر بیٹھ

جاتا۔ رحمان صاحب کھڑے رہتے...... بزرگ پتنگ باز کا گلہ کہ اب لوگوں کو پتنگ بازی کے آداب بھول گئے ہیں...... رحمان صاحب تشریح کرتے کہ آج کے پتنگ باز فاؤل کھیلتے ہیں......
اس میدان میں کبھی پتنگ اڑانے کا مقابلہ ہوتا تو یہ بزرگ ریفری کا پارٹ ادا کرتے...... وہاں سے شاہی مسجد اور قلعے کے درمیان سے گزر کر شاہی محلے کی سیر...... شام کا وقت...... بازار میں خاصی رونق...... پھولوں کے گجرے...... ہوٹلوں سے کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو...... کباب اور مرغ کی روسٹ ٹانگیں...... شربت شیرے کی بوتلوں کی رنگینیاں...... خالی پیٹ کا احتجاج...... خالی جیب کی معذرتیں...... بالا خانوں پر رونق معدوم...... رحمان صاحب کی ٹھنڈی یا گرم آہیں......
نقوی صاحب! وہ زمانہ آپ نے نہیں دیکھا جب اس بازار میں زندگی اپنے عروج پر ہوتی تھی......
طبلے کی گھمک اور گھنگھروؤں کی چھنک...... یہ بازار رات کو جاگتا تھا...... میں تو اس بازار کا باسی تھا...... اب اس بازار کا ماضی ہوں...... جواب میں میرا بھی ٹھنڈی آہ بھرنا کہ زندگی کے ایک نادر مشاہدے سے محروم رہا...... میں تھک ہار کر کہتا کہ اب تو کہیں بیٹھ کر چائے پینی چاہیے......
رحمان صاحب کا دیکھ بھال کر ایک ایسے ہوٹل کا انتخاب کہ باہر سے اور اندر سے بھی اتنا غلیظ کہ داخل ہوتے ہوئے شرم آئے اور نکلتے ہوئے پاؤں لڑکھڑائیں...... تام چینی کی پرانی کیتلی اور ہاف سیٹ چائے دانی...... ٹوٹے کناروں والی پیالیاں...... اور رات کے وقت بھی مکھیوں کی بھنبھناہٹ...... چائے [illegible] کڑک کہ معدہ اتھل پتھل ہو جائے...... چائے لانے والا اتنا ضعیف و قدیم کہ پیالیاں اس کے ہاتھ میں کڑکڑ بجتیں...... رحمان صاحب کہتے کہ اس بازار کے کلچر کی یہ واحد نشانی باقی رہ گئی ہے...... کبھی یہ بابا اس بازار کا جوان طناز تھا کہ گشتیاں اسے ساتھ لے کر چلنے میں فخر محسوس کرتیں...... میں دنیا کی بے ثباتی پر اتنا غم زدہ ہو جاتا کہ آئندہ رحمان مذنب کے ساتھ سیر سے اجتناب کا فیصلہ کر لیا لیکن اگلے اتوار آوارہ گردی کی رگ پھر پھڑک اٹھتی۔

کبھی کبھار رحمان مذنب کے کوئی پرانے دوست بھی مل جاتے۔ ان کے اکثر دوست اس دنیا سے گزر چکے تھے، کوتاہئ حیات کے ہاتھوں نہیں، افیون، چرس اور شراب کے توسط سے۔ ان کے ایک دوست جو گیاہ ضعیف قسم کے لاغر تھے کہ پھونک ماریں تو اڑ جائیں کبھی کبھار لڑکھڑاتے ہوئے نظر آتے۔ رحمان صاحب ان کا نام پکارتے تو وہ ٹیڑھی بھینگی آنکھوں سے دائیں

بائیں دیکھتے اور پھر لڑکھڑانے لگے۔ آخر رحمان مذنب صاحب انہیں جا لیتے۔ '' مجھے پہچانا، میں رحمان مذنب۔'' دیر بعد وہ انہیں پہچانتے لیکن کسی گرم جوشی کا اظہار نہ کرتے۔ رحمان صاحب میرا تعارف کراتے تو وہ کہتے، '' صاحب! یوں تو میں نواب آف ...... کا جائز وارث ہوں لیکن انہوں نے مجھے تسلیم نہیں کیا۔ میری ماں زہبی جب فوت ہوئیں تو ان کے نکاح میں تھیں۔'' پھر وہ رونے لگے اور کہتے، '' رحمان مذنب! اب تو میں اتنا کنگال ہو چکا ہوں کہ آپ کو چائے کی ایک پیالی بھی نہیں پلا سکتا۔ ماں کا جو مکان تھا، وہ بھی بیچ کھایا ہے۔''

رحمان صاحب مجھ سے آنکھ بچا کر پہلے جیب میں ہاتھ ڈالتے اور پھر ان سے ہاتھ ملاتے۔ یہ میرا گمان ہے یا واہمہ لیکن اس دن میں اس بازار کے ماضی کے یادگار ہوٹل میں چائے پینے ضرور پہنچ جاتا۔ رحمان صاحب بتاتے کہ کبھی اس کی ماں زہبی گانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ واقعی وہ ایک نواب صاحب کی داشتہ تھی اور بڑی صاحب جائیداد ڈیرادارنی۔ لڑکپن میں اور پھر جوانی میں میری اس شخص سے گاڑھی چھنتی تھی۔ اسے ہر روز پانچ روپے جیب خرچ کے لئے ملتے تھے۔ یار لوگ خوب گلچھرے اڑاتے تھے اور پھر بھی وہ پانچ روپے ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔

کبھی رحمان صاحب مجھے ایسی گلیوں میں لے جاتے جہاں دن کو بھی رات کی سیاہی کا سماں ہوتا اور جو تنگ ہوتے ہوتے معشوق کی کمر کی طرح معدوم ہو جاتیں۔ میں بھنچ سا جاتا اور میرا دم گھٹنے لگتا۔ اوپر نظر اٹھاتا تو آسمان دکھائی نہ دیتا اور گمان گزرتا کہ یہ چھجا ابھی مجھ پر گرا کہ گرا۔ رحمان صاحب مجھے اس گلی میں سے صحیح سلامت گزار لے جاتے تو سانس بحال ہوتا۔ ایک خاص دکان سے وہ جوشاندہ وغیرہ خریدتے تھے۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے جس بازار میں سے گزرنا پڑتا، اس میں راہگیروں کو لال مرچ کی دھونی مفت میں ملتی۔ یہ تو خیر تھی کہ اس زمانے میں مجھے سانس کی تکلیف نہیں تھی ورنہ کسی دکان کے پھٹے پر ضرور ڈھیر ہو جاتا۔

پیدل چلنے والی اس دوستی کا خاتمہ بالخیر اس وقت ہوا جب میں پونچھ ہاؤس کے ایک سرکاری کوارٹر میں منتقل ہو گیا۔ اب ان سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی تھی۔ '' نئی ادبی تنظیم '' کی زندگی بھی بہت مختصر تھی۔ اعجاز فاروقی اسلام آباد چلے گئے تو تنظیم بھی ختم ہو گئی۔ رحمان مذنب بھی واپڈا سے ریٹائرڈ ہو چکے تھے اور فری لانسنگ میں مصروف تھے یا کہیے کہ روزی کی تلاش میں

سرگرداں تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کے لئے یہ نہایت مشکل زمانہ تھا لیکن مجال ہے، انہوں نے اپنی مالی مشکلات کا ذکر بھی کیا ہو۔ اسی مشکل دور میں عزیزان زرّیں بخت، شکیل احسن اور دو بچیاں سکولوں اور کالجوں میں تعلیم بھی حاصل کر رہے تھے۔ یہ مشکل دور نہ صرف انہوں نے خوش اسلوبی سے بسر کیا بلکہ اتحاد کالونی میں اپنا مکان بھی تعمیر کر لیا۔

1980ء میں، میں نے بھی ستلج بلاک علامہ اقبال ٹاؤن میں **5** مرلے کے پلاٹ پر مکان بنالیا اور ہم پھر سے ہمسائے ہو گئے یعنی دو اڑھائی فرلانگ کے فاصلے کی ہمسائیگی مل گئی لیکن صحیح ہمسائیگی اس وقت ہوئی جب مئی **1983**ء میں، میں ریٹائرڈ ہو کر پونچھ ہاؤس سے علامہ اقبال ٹاؤن اٹھ آیا۔ اس ہمسائیگی کو زیادہ تقویت عزیزم شکیل احسن کی وجہ ملی کیونکہ میرا بیٹا مشیر عباس اور وہ دونوں ایک جینئس لیکن سیماب فطرت عزیز شاگرد اختر حیات کی مہربانی سے جنگ اخبار کے کمپیوٹر سیکشن میں ملازم ہو گئے اور ان کی دوستی نے میری اور رحمان مذنب کی دوستی کو نئی جہت عطا کی یعنی اب گھر والوں کا بھی آپس میں ملنا جلنا ہو گیا۔

تاہم آوارہ گردی والی دوستی کی تجدید نہ ہو سکی۔

کچھ دنوں بعد ڈاکٹر انور سدید صاحب نے بھی ستلج بلاک میں اپنا مکان تعمیر کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب، صابر لودھی اور میرا مکان ایک ہی گلی میں واقع ہے۔ صابر لودھی صاحب گورنمنٹ کالج کیمپس کی ایک کوٹھی میں اٹھ گئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب بھی ریٹائر ہو چکے ہیں۔

انسان بھی عجیب جانور ہے، تھان پر باندھ کر آپ اسے ہر قسم کی آسائش مہیا کریں لیکن دوسرے انسانوں سے ملنے نہ دیں تو وہ جنت کو جہنم جانتا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہم تینوں کے باغ ہرے بھرے ہیں، بیٹے اور بہوئیں خدمت گزار ہیں۔ آنگنوں میں پوتے دو ہتے کھیلتے ہیں، اودھم مچاتے ہیں اور داداؤں کی کتابوں اور کاغذوں کا ستیاناس بھی کرتے ہیں اور قلم دوات تو اکثر غائب رہتے ہیں، پھر بھی ہم میں سے کسی کو تھان پر بندھنا پسند نہیں۔ ہفتے میں ایک بار ضرور ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی ہے اور ادبی چغلی بخیلی سے دل کا غبار صاف کر لیتے ہیں۔ یہ ایک ذہنی اور روحانی رابطہ ہے جو ہم میں قائم ہے۔

کبھی ڈاکٹر انور سدید صاحب کے ہاں محفل جمتی ہے، کبھی رحمان مذنب صاحب کے ہاں، کبھی میں میزبان بنتا ہوں۔ زیادہ تر ڈاکٹر صاحب کے ہاں ان کے کتب خانے میں بزم آرائی ہوتی ہے۔ کتابوں سے لدی الماریوں میں رگر کریوں لگتا ہے جیسے ہم بھی کسی شیلف پر لگی کسی کتاب میں حلول کر گئے ہیں۔ گفتگو کا موضوع بھی ادب ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے فعال آدمی ہیں، کالم لکھتے ہیں، ادبی محفلوں میں شریک ہونے کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ ان کے پاس خبر کی فراوانی ہوتی ہے۔ قدرت نے انہیں انرجی بھی وافر عطا فرمائی ہے۔ ہمیں بھی وہ کوئی نہ کوئی ہوم ٹاسک دیتے رہتے ہیں اور سختی سے اس کی تعمیل بھی کرواتے ہیں۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ اس ہمسائیگی نے ہمیں نئی زندگی دی ہے۔

اب میں رحمان صاحب کی طرف لوٹتا ہوں کہ یہ رابطہ ان سے مخصوص ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، رحمان مذنب اس سچائی کے شدت سے قائل ہیں کہ جو لکھا جائے، اس کا معاوضہ ضرور ملنا چاہیے۔ ڈاکٹر انور سدید کا نظریہ ہے کہ ملے نہ ملے، لکھنا ضرور چاہئے۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ کاغذ اور قلم کا رابطہ ضرور برقرار رہنا چاہیے کہ اسی سے ادیب کی زندگی ہے۔ اب ہم نے رحمان صاحب کو بھی قائل کر لیا ہے کہ وہ ادیب کی حیثیت سے اپنی زندگی کا ثبوت ضرور دیتے رہیں۔

افسوس کہ رحمان مذنب سے میرا تعلق اس وقت قائم ہوا جب وہ جوانی کی ہر رنگینی کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ وہ اپنی گھریلو زندگی سے، بہت مطمئن ہو گئے تھے یا ان کا گھر اتنا حسین تھا کہ باہر کی زندگی میں جو چمک دمک تھی، وہ ان کی نگاہوں میں جچتی ہی نہ تھی۔ میں نے انہیں بہت کریدا کہ وہ اپنے ماضی پر سے تھوڑا سا پردہ سرکائیں لیکن وہ قابو میں نہ آئے۔ بازار حسن سے جو انہیں قرب حاصل رہا ہے، اس کی کوئی جھلک کبھی کبھار پیش کرتے تھے لیکن ان کی گفتگو سے ان کے افسانے یا وہ دیباچہ جو انہوں نے ''پتلی جان'' کا لکھا ہے زیادہ روشن اور واضح ہیں۔

کبھی کہا کرتے تھے کہ میں اپنی سوانح لکھ رہا ہوں، اس میں سب کچھ لکھوں گا لیکن مجھے امید نہیں کہ وہ سب کچھ لکھ سکیں گے۔ ہمارے قلم پر بہت سے پہرے ہیں۔ ایک پہرہ تو اولاد کا ہے، ہم اپنی اولاد سے بھی ڈرتے ہیں کہ جو چہرہ ہم انہیں دکھا رہے ہیں، وہ ہمارا اصل چہرہ نہ ہو۔ اس سلسلے میں ...... جوش ملیح آبادی نے کچھ جرأت سے کام لیا تھا لیکن اکثر اسے ناپسند کیا گیا۔

اگر چہ ان کی کتابیں بہت بکی تھی۔ پھر بھی وہ "کیسانووا" تو کیا، اردو خود نوشت سوانح میں روسو اور آسکر وائلڈ بھی نہ بن سکے۔

تاہم رحمان مذنب اردو کے اکثر افسانہ نگاروں سے زیادہ بے باک ہیں۔ وہ بازار حسن کو موضوع افسانہ بناتے ہیں اور بیان میں خاصے کھل جاتے ہیں۔ پھر بھی ذوق لطیف کو ٹھیس نہیں لگنے دیتے۔ ان کے بیان میں بہت لطافت ہوتی ہے۔ عام گفتگو میں وہ بہت محتاط ہوتے ہیں۔ میں نے کبھی ان کی زبان سے کوئی کثیف لفظ نہیں سنا۔

وہ پنجابی بولتے ہیں لیکن اس میں بھی شین قاف درست رکھتے ہیں۔ لاہور میں پیدا ہوئے، یہیں پلے بڑھے لیکن لب و لہجے میں لاہوریت غائب ہے۔ لاہور کو لہور اور چڑیا گھر کو چڑیا گھر نہیں کہتے۔ کبھی کبھی تو یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ پنجابی نہیں "اردو نژاد" ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ علماء کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ٹکسالی دروازے کی اونچی مسجد سے ملحقہ مکان میں جنم لیا۔ ان کے والد بزرگوار مفتی تھے اور شاہی مسجد میں ہر صبح حدیث کا درس دیتے تھے۔ گھر میں صبح شام اللہ رسول کی باتیں ہوتیں۔ قرآن و حدیث پڑھے جاتے۔ شمس العلماء مفتی محمد عبداللہ ٹونکی سے ان کی عزیز داری تھی۔ شمس العلماء کے صاحبزادے اور نسخہ حمیدیہ کے مرتب مفتی انوار الحق بھوپال میں وزیر مالیات تھے۔ رحمان مذنب کچھ عرصہ بھوپال میں رہے۔ اندور اور دہلی میں بھی کچھ زمانہ گزارا۔ بھوپال، اندور اور دہلی میں یقیناً اردو بولتے رہے ہوں گے۔ اگر چہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے باقاعدہ عربی نہیں پڑھی لیکن عالم و فاضل باپ کی زبان سے عربی سنی اور ان کا شین قاف پختہ ہو گیا۔ عربی اور اردو کے ملاپ نے ان کی پنجابی کو جولب ولہجہ دیا وہ ان کی تحریر اور گفتگو دونوں میں عجیب مزہ دیتا ہے۔

میں حیران ہوں کہ اتنے عالمانہ ماحول میں تربیت پانے والا سعید و رشید بچہ جونہی لڑکپن کی سرحد میں پہنچا، اتنا بگڑ کیوں گیا۔ اسے تو یقیناً مولوی ہونا چاہئے تھا۔ چلئے مولوی نہ بنتا، مولوی نما تو ضرور ہوتا۔ اگر منہ پر ڈاڑھی نہ ہوتی، اندر تو ہوتی، لمبی اور گھنی نہ سہی، خشخشی سی سہی، جہاں تک میرا ناقص تجربہ کام کرتا ہے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جس طرح وہ باہر سے کلین شیو ہیں، اسی طرح اندر سے بھی ہیں۔ شین قاف کی درستی کے سوا ان کی عام گفتگو، معاشرتی رویوں اور

علمی پسند ناپسند سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مولویت سے انہیں قطعاً لگاؤ نہیں حالانکہ ہمارے ادبی حلقوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو روشن خیالی اور ترقی پسندی کے ادعا کے باوجود اپنی مولویت ترک نہیں کر سکے۔ مولویت کا ایک مظہر جنگ وجدل اور تغلب Aggressiveness ہے، جو رحمان مذنب میں مفقود ہے۔

اس حیران کن انحراف کی جو وجہ انہوں نے بیان کی ہے، میں انہیں کی زبان میں لکھتا ہوں۔ (یہ جملے میں نے ''تکی جان'' کے دیباچے سے چنے ہیں)

الف) میری جائے پیدائش ایسی تھی کہ ادھر اذان کی آواز کان میں پڑتی اور ادھر مغنیہ کی تان سنائی دیتی۔

ب) گھر سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر عزیز تھیٹر تھا، جہاں سارا سال ناٹک کمپنیوں کی آمد ورفت رہتی۔

ج) مجھے تضاد و تصادم کے ایسے مہیب سنگم سے سابقہ پڑا کہ میرے کم وبیش ستر سال خود کو دولخت ہونے سے بچانے میں گزر گئے۔

د) عزیز تھیٹر سے ملحق ہیجڑوں کی بیٹھکیں تھیں۔ چند قدم پر نکیائیوں کی گلی (ٹبی) اور ڈیرادارنیوں کا بازار تھا۔

ہ) میں ٹکسالی دروازے کی اونچی مسجد سے ملحقہ مکان میں پیدا ہوا۔ آس پاس کے گلی کوچے اپنی تمام جلوہ سامانیوں ...... خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ میری زندگی میں داخل ہوئے۔ میں سود وزیاں کی سوچ کے بغیر ان میں داخل ہوا۔ یہ داخلہ ناگزیر تھا، اس کے سوا چارہ نہ تھا۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ یہ داخلہ ناگزیر تھا لیکن میں حیران ہوں کہ ان کے والد محترم نے انہیں اس داخلے سے کیوں نہ روکا۔ رحمان مذنب نے کبھی بھولے سے بھی ''خیر وشر'' کی اس کشمکش میں اپنے زاہد و پارسا والد سے اپنے تصادم کا ذکر نہیں کیا یقیناً یہ تصادم رونما ہوا ہوگا۔

چونکہ میں رابطہ لکھ رہا ہوں اور ان کا نفسیاتی تجزیہ مقصود نہیں اس لئے پٹری بدلتا ہوں۔

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے انہیں ''ادبی دنیا'' کے ایک ادارتی نوٹ میں

''مخلص فنکار'' کہا ہے اس لئے کہ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں، اسے عین اسی طرح اپنے ناظرین تک پہنچا دیتے ہیں یعنی مصلحت سے کام نہیں لیتے۔

میں انہیں ''مخلص فنکار'' اس لئے کہتا ہوں کہ جو کچھ لکھتے ہیں، اسے خالص ادبی سطح پر رکھتے ہیں۔ اس کی تشہیر کرانے کا فن انہیں نہیں آتا۔ میں حیران ہوں کہ حلقہ اربابِ ذوق کے ابتدائی ارکان میں شامل ہونے کے باوجود انہوں نے ''من تراحاجی بگویم، تو مراحاجی بگو'' والی پالیسی کیوں نہ سیکھی یعنی اپنا کوئی گروہ نہ بنایا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ کہ وہ ''مخلص فنکار'' ہیں اور سمجھتے ہیں کہ فن اپنے آپ کو خود منوالیتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ داد دینے کے معاملے میں وہ کچھ زیادہ ہی کفایت شعار واقع ہوئے ہیں۔

''تتلی جان'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں: ''حلقہ اربابِ ذوق (ادبی) کی پینتیس سالہ رفاقت بھی قابلِ قدر ہے کہ مجھے اس کی ہفت روزہ مجالس میں سب سے زیادہ افسانے، ڈرامے اور مقالے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ نیز بحثوں میں موثر کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔ ان احباب کا بھی ممنون ہوں جو گروہ بندی کے ماہر تھے۔ ہمہ وقت اپنی تعریف وتوصیف کے طلبگار رہتے اور حسبِ ضرورت تنقید کے ضمن میں اپنے رفقاء کو جلسے کے دوران یا قبل از وقت گائیڈ لائن بھی دیتے۔ مجھے ان کے مبلغ علم سے سروکار نہیں، مجھے تو انہی کی بدولت اپنے ارادے میں پختگی پیدا کرنے کی توفیق ہوئی۔''

میں رحمان صاحب سے پوچھتا ہوں کہ ان احباب کی جو گروہ بندی کے ماہر تھے، کیا آپ نے بھی تعریف وتوصیف کی۔

وہ کہیں گے ''ہرگز نہیں۔''

میں کہوں گا ''اسی کا خمیازہ تو آپ اب تک بھگت رہے ہیں۔''

''نئی ادبی تنظیم'' کی محفلوں میں میں نے دو تین افسانے پڑھے جن کی مجھے داد ملی مثلاً ''زرد پہاڑ'' اور ''نہیں جی'' وغیرہ۔ رحمان صاحب نے داد دی نہ بیداد یعنی میرا لحاظ کرتے رہے۔ صاحبانِ صدر کے اصرار پر لب کشائی بھی کی لیکن ادھر ادھر کی کہہ کر چپ ہو گئے۔

انہوں نے افسانہ ''گشتی'' پڑھا تو میں دل ہی دل میں اس سے محظوظ ہوا لیکن کوئی رائے نہ دی۔ صاحبِ صدر کے اصرار پر میں نے بھی ادھر ادھر کی ہانک دی اور دل کی بات لب پر نہ آنے دی۔

صرف فرخندہ لودھی وہ خوش قسمت افسانہ نگار ہیں، جن کے مشہور افسانے ''شرابی'' کا انہوں نے لمبا قصیدہ پڑھا اور اب تک پڑھ رہے ہیں۔

تیسری وجہ ہے کہ رحمان مذنب نے ''اس بازار'' پر اپنا قبضہ جما لیا ہے۔ اس لحاظ سے نہیں کہ کوئی اس میں داخل نہ ہو بلکہ اس لحاظ سے کہ جو اس میں داخل نہیں ہوا، اسے کوئی حق حاصل نہیں کہ اس کا فائدہ اپنی نگارشات میں اٹھائے اور وہ بھی مفت میں۔ وہ منٹو کی طوائف نگاری کو اس لئے مستند نہیں مانتے کہ وہ اس بازار کو بہت دور سے اور اپنے بالا خانے کہ کھڑکی کے پردے کی اوٹ سے دیکھتے رہے اور رحمان مذنب یہاں اہلِ خانہ کی طعن و تشنیع کئے بغیر بے روک ٹوک پھرتے رہے اور حقیقت کو آئینے میں نہیں بلکہ براہ راست دیکھتے رہے۔

ایم اسلم نے بھی طوائف پر لکھا ہے۔ رحمان مذنب کہتے ہیں کہ اگر چہ ان کی حویلی اس بازار کے قریب تھی لیکن اس طرف کی کوئی کھڑکی بھی انہوں نے کھلی نہ رکھی تھی اور اپنی مطالعہ گاہ کو انہوں نے زنداں کی کوٹھڑی بنایا ہوا تھا۔

میں نے اپنے افسانے ''نہیں جی'' میں ایسے ہی طوائف کا ذکر کر دیا۔ نہ بھی کرتا تو کوئی فرق نہ پڑتا، اس افسانے پر جو بحث ہوئی، اس میں انہوں نے بادل نخواستہ حصہ لیا۔ صرف اتنا کہ مشرقی پاکستان کے المیے کے حوالے سے اس افسانے کو اچھا قرار دیا جا سکتا ہے۔ بعد میں ہم جب چائے کی میز پر بیٹھے تو فرمانے لگے'' نقوی صاحب! کبھی آپ اس بازار میں گئے ہیں؟''

''میرا مطلب یہ نہیں۔''

''جو آپ کا مطلب ہے، اس کے مطابق تو میں کبھی اس بازار میں نہیں گیا۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر آپ کو افسانے میں طوائف کا ذکر نہیں کرنا چاہیئے تھا۔''

''سرِ راہے بھی؟'' میں نے پوچھا۔

''جو کوچہ دیکھا نہ ہو، اس کا سرِ راہے ذکر بھی مناسب نہیں۔''

''کبھی کسی گاؤں میں آپ کو مہینہ دو مہینہ رہنے کا موقع ملا ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

حیران ہو کر بولے ''نہیں تو۔''

''فرض کیجئے آپ بس پر کہیں جا رہے ہیں۔ ایک جگہ آپ کی بس خراب ہو جاتی ہے، آپ کو پیاس بہت لگی ہے، سڑک سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں ہے۔ وہاں جاتے ہیں تو گاؤں کے باہر کنویں پر ایک لڑکی ڈول کھینچتی ہوئی آپ کو نظر آتی ہے۔ آپ اس سے پانی مانگتے ہیں۔ وہ شرما کر آنکھیں چرا کر ڈول کا پانی آپ کی اوک میں ڈالنا چاہتی ہے اور وہ پانی ادھر ادھر بہہ جاتا ہے اور آپ پیاسے رہ جاتے ہیں۔ کیا اس ''پیاس'' پر آپ افسانہ نہیں لکھیں گے؟''

''ضرور لکھوں گا۔'' وہ بولے۔

''لیکن میں نہیں لکھنے دوں گا، جب آپ نے دیہات دیکھا ہی نہیں، تو اپنی ہی منطق کی رو سے آپ اپنے افسانے میں اس کا ذکر کرنے کے مجاز نہیں۔''

وہ میری دلیل سے قطعاً قائل نہ ہوئے البتہ میں قائل ہو گیا۔ میں نے تین افسانے ضائع کر دیئے جو ابھی صفحہ قرطاس پر منتقل نہیں ہوئے تھے۔ ایک افسانہ ان دو لڑکیوں کے بارے میں تھا جو تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں نے چہرے سے برقع اٹھایا ہوا تھا گویا میر تقی میر کے برقع اٹھنے والے شعر میں ایک نہیں دو چاند نکلے ہوئے تھے۔ میرے متوازی ایک اور صاحب بھی سائیکل چلا رہے تھے۔ تانگے کی اگلی سیٹ پر جو عورت بیٹھی تھی، موٹی اور بھدی سی، کالے رنگ کی، منہ میں پان کی پیک، وہ ان کی نائکہ تھی اور ان کی نمائش کر رہی تھی۔ ان چہروں کی معصومیت نہ جانے مجھے کہاں کہاں لے گئی۔ کیا پتا یہ کسی آبرومند گھرانے کی بیٹیاں ہوں جنہیں اغوا کر لیا گیا ہو۔ یا ممکن ہے کہ بھوک اور ننگ نے انہیں کوٹھے پر چڑھا دیا ہو۔

جب وہ تانگہ ٹکسالی گیٹ کی طرف مڑ گیا، تو میرے ساتھی نے میری طرف دیکھ کر آہ بھری اور کہا ''بس جی تماشا ختم!''

گویا انہوں نے مجھے بھی اپنی طرح تماش بین جانا تھا۔

اچھا ہوا کہ یہ افسانہ ضائع ہو گیا۔ اس موضوع پر کئی افسانے پہلے بھی لکھے جا چکے ہیں۔ امراؤ جان ادا بھی اسی طرح کوٹھے پر پہنچی تھی۔ اس موضوع پر کئی فلمیں بن چکی ہیں اور ایک دو ٹی وی سیریز بھی اسی موضوع کی مرہونِ منت ہیں۔ میں کون سا نیا تیر مار لیتا۔

دوسرا افسانہ بھی دو لڑکیوں کے بارے میں ہے۔ یہ ہمارے ہی نواح کے ایک قصبے میں رہتی تھیں۔ یہ قصبہ کبھی خاندانی گانے والی طوائفوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ جب انہیں دور دراز قصبے میں اپنا مستقبل مخدوش نظر آیا تو اس خاندان کی یادگار دو بہنیں لاہور اٹھ آئیں۔ ان کا بھائی قصبے ہی میں رہ گیا جہاں اس نے پچیس تیس ایکڑ زمین خرید لی اور ایک کھاتا پیتا کاشتکار بن گیا۔ اس کی دو لڑکیاں تھیں جنہیں اس نے پڑھایا لکھایا لیکن جب وہ سن بلوغت کو پہنچیں تو لاہور سے اس کی بہنیں آئیں اور کہا کہ لڑکیوں کو ہمارے سپرد کر دو۔ ہم انہیں گانا ناچنا سکھائیں گی۔ اس نے کہا کہ دیکھو! میں اب شریف زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر انہوں نے کہا ''ہم تو .... ساری کمائی تمہیں بھیجتی رہیں اور تم شریف بننا چاہتے ہو۔ پھر بھی لوگ تمہیں شریف کنجر ہی کہا کریں گے۔'' وہ ڈائنیں لڑکیوں کو لاہور لے آئیں۔ انہیں ناچنا گانا سکھایا۔ کچھ عرصے کے لئے ان کے کوٹھے کو بہت شہرت ہوئی۔ پھر ایک لڑکی کو ایک تماش بین اڑا لے گیا۔ دوسری کا حال مجھے معلوم نہیں۔

اس پلاٹ پر ایک دلچسپ ناولٹ کی تعمیر ہو سکتی تھی لیکن موضوع تو پھر بھی نیا نہ ہوتا۔ یوں کوئی موضوع بھی نیا نہیں ہوتا۔ میں انہیں کوٹھے پر تو پہنچا سکتا تھا اور کوٹھے پر جو کچھ ہوتا ہے، اس کے لئے رحمان مذنب کے پاس جانا پڑتا۔ پھر یہ افسانہ میرا تو نہ رہتا! اچھا ہوا کہ یہ افسانہ بھی ضائع ہو گیا۔

تیسرا افسانہ مجھے رحمان مذنب کی معیت میں پیش آیا۔ جب ایک شام سیر کرتے کرتے ہم اس بازار میں سے گزر رہے تھے تو رحمان مذنب مجھ سے کچھ آگے نکل گئے۔ ایک منحوس صورت آدمی نے میرا راستہ روک کر کہا ''ملک صاحب! بڑا فسٹ کلاس دانہ ہے۔ خدا کی قسم بدن ایسا کہ ہاتھ لگانے سے میلا ہو۔ کوئی گھپلا نہیں ہوگا۔ جو دکھائیں گے وہی بستر پر آئے گا۔'' میں تو شل ہو کر رہ گیا، منہ سوکھ گیا اور زبان اکڑ کر تالو سے جا لگی تاہم میں آگے بڑھ گیا۔ رحمان مذنب اپنے خاص ہوٹل کے سامنے کھڑے تھے۔ دیر کی وجہ پوچھی تو میں نے واقعہ عرض کیا اور پوچھا ''حیران ہوں کہ اس نے مجھے تماش بین کیوں سمجھا؟''

وہ ہنس کر بولے ''اس کالی شیروانی اور اس خضاب کی وجہ سے جو آپ کے سر پر لگا ہے۔''

میرا خیال ہے کہ یہ افسانہ ضائع نہیں گیا۔ اس رابطے کا حصہ بن کر بھی افسانہ ہی رہا ہے۔

میں تو کیا اس ضمن میں رحمان صاحب بڑے بڑوں کا لحاظ بھی نہیں کرتے! 23 مئی

1988ء کو قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں ایک عشائیے میں مدعو تھیں۔ رحمان مذنب اور مجھے بھی اس محفل میں شمولیت کا فخر حاصل ہوا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے میرا اور رحمان مذنب کا تعارف ان سے خاصی وضاحت سے کرایا لیکن مجال ہے کہ وہ ٹس سے مس ہوئی ہوں یا ہمارے ساتھ بھولے منہ بھی بات کی ہو۔

ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

باتوں باتوں میں ان کا مشہور ناول ''گردش رنگ چمن'' موضوع گفتگو بنا۔ اس میں لکھنوی تہذیب وثقافت کے زوال کو موضوع بنایا گیا ہے اور اس کا محور ایک طوائف اور اس کی بیٹی ہیں۔ طوائف کا ذکر ہوا تو رحمان مذنب صاحب بحث میں کود پڑے اور قرۃ العین حیدر سے پوچھنے لگے ''کیا ناول لکھنے سے پہلے آپ نے اس بازار کو دیکھا؟ کیا آپ طوائف کے کوٹھے پر گئیں؟''

وہ تو سٹپٹا گئیں کہنے لگیں: ''کیا ایسا کرنا ضروری تھا؟''

''کیوں نہیں...... اگر آپ نے وہ ماحول ہی نہیں دیکھا تو آپ کے ناول میں حقیقت کہاں سے آئے گی؟''

''میں نے تحقیق کی، کتابیں پڑھیں، اس ماحول کو جاننے والے لوگوں سے ملی۔'' قرۃ العین نے کہا۔ رحمان مذنب مزید کچھ کہنے ہی والے تھے کہ میں نے انہیں روک دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ سخت برہم ہیں۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے انتظار حسین سے مخاطب ہو کر کہا ''یہ صاحب کون ہیں اور کیسی باتیں کر رہے ہیں۔''

انتظار حسین نے جواب دیا ''یہ رحمان مذنب ہیں، یہ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں، میں انہیں حلقہ اربابِ ذوق کے زمانے سے جانتا ہوں۔''

''گردش رنگ چمن'' ہاتھ آیا تو اتنا دلچسپ لگا کہ دو تین نشستوں میں پڑھ ڈالا۔ اس میں طوائف کے کوٹھے کا ذکر تو ہوا ہے لیکن اس ماحول کی نقشہ کشی اس کا مقصد نہیں تھا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، رحمان مذنب کو اپنے فن پر حق الیقین کا مرتبہ حاصل ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہے۔

الف) ''خودستائی نہیں حقیقت ہے۔ مولا کریم کی عنایت سے اردوادب کو اعلیٰ پائے کے افسانے، ڈرامے اور مقالے دیئے ہیں۔'' (تپلی جان کا فلیپ)

ب) ''میں اس دور کا واحد افسانہ نگار ہوں جس نے سات دہائیوں کے ''بازار'' کو اپنی روایات اور تفصیلات کے ساتھ بھرپور انداز سے محفوظ کیا ہے۔'' (تپلی جان)

ج) ''حقیقت کے اعتبار سے میں نے روایتی افسانے کو جس قدر مستحکم کیا ہے، ادب کا غیر جانبدارانہ مورخ مجھے ضرور کریڈٹ دے گا۔'' (تپلی جان)

د۔ ''تپلی جان'' اس تاریخ کا علاحدہ مگر مستقل باب ہے، یہ ایک ایسا افسانہ ہے کہ جسے منٹو، بیدی، عصمت چغتائی، غلام عباس یا کرشن چندر لکھتے تو پیشہ ور نقاد اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے۔''

رحمان مذنب بہت وسیع المطالعہ ادیب ہیں۔ ان کے مطالعے میں ''تنوع'' بھی بہت ہے۔ اگر ایک طرف وہ مصریات، یونانیات، ماحولیات اور سوشل انتھروپالوجی کے موضوعات پر ورک وافر رکھتے ہیں تو دوسری طرف قرآن اور سیرت کا مطالعہ بھی بہت گہرا ہے۔ یونانی تھیئٹر اور یونان کے کلاسیکل ڈرامے پر بھی ان کی نظر بہت گہری ہے۔ تین درجن سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔ بعض پر انعام بھی ملا ہے۔ ''دینِ ساحری'' پر ان کی دو کتابیں طبع ہوئی ہیں۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ ''بوطیقا'' کا پنجابی ترجمہ ہے لیکن میرے نزدیک ان کا اصل میدانِ عمل افسانہ ہے۔

15 جولائی 92ء کو ان کی 78 ویں سالگرہ تھی۔ آئی اور گزر گئی۔ کسی ادارے نے ان کی سالگرہ نہیں منائی، کوئی منائے گا بھی نہیں۔ کسی کتاب پر کوئی فنکشن نہیں ہوا، ہوگا بھی نہیں۔ اس لئے کہ رحمان مذنب نے اپنا کوئی حلقہ نہیں بنایا اور آج کے زمانے میں جب غیر جانبدار مورخ اور نقاد کی نسل ہی منقطع ہوگئی ہے۔ ان کی حال ہی میں چھپنے والی کتابوں پر کوئی ڈھنگ کا تبصرہ بھی شائع نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر انور سدید البتہ ضرور لکھیں گے۔

رحمان مذنب کا تخلص بھی اکثر موضوع بحث بنتا ہے۔ اس تخلص پر کئی ثقہ لوگ ناراض نظر آئے۔ ایک صاحب نے مجھ سے بھی کہا کہ اپنے دوست سے کہیں، وہ اپنا تخلص بدل لیں۔

اس ترکیب میں ''رحمان'' کی تفحیک ہوتی ہے۔ رحمان مذنب صاحب کہتے ہیں کہ یہی تو میری ''شخصیت'' ہے، اسی نام سے مجھے ''تشخص'' حاصل ہے لیکن وہ اس کی وضاحت نہیں کرتے۔

رحمان مذنب میں جو تضاد ہے وہ خیر وشر کے تصادم کی علامت نہیں بلکہ ایک سنگم ہے...... جس کا نام انسان ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے نام اور تخلص کے سنگم پر کھڑے رحمان مذنب ایک متوازن انسان ہیں۔ وہ منافقت سے کوسوں دور ہیں، بناوٹ ان میں نام کو نہیں۔

وہ جو کچھ ہیں، آپ کے سامنے ہیں۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو رحمان مذنب کی طرح عمر خیام کی زنِ فاحشہ کے جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ:

میں جو کچھ ہوں، تمہارے سامنے ہوں۔

....

شیخے بازن فاحشہ گفتا ستی کز خیر گزستی و بہ شر پیوستی

زنِ گفت چناں کہ می نمایم ہستم تو نیز چناں کہ می نمائی ہستی؟

(ایک شیخ نے ایک زنِ فاحشہ سے کہا کہ تو مست ہے کہ خیر سے رشتہ توڑ کر شر سے پیوستہ ہوگئی ہے۔ زن نے کہا کہ میں جو کچھ نظر آتی ہوں وہی ہوں۔ کیا تو بھی وہی ہے، جو نظر آتا ہے؟)

..................O..................

رحمان مُذنب

ایک قد آور علمی وادبی شخصیت

احمد شجاع پاشا

رحمان مذنب کو میں اس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ شبلی بی۔کام (بعد ازاں ایم۔اے) کے زیرِ ادارت رسالے ماہنامہ ''عالمگیر'' میں افسانے، ڈرامے اور مقالے لکھتے تھے۔ تب انہوں نے دو بڑے معرکے کے ڈرامے لکھے۔''مقدس پیالہ'' (لارڈ ٹینی سن کے ڈرامے The Cup کا ترجمہ) اور ''اندھی مالن'' کے نام سے The Last Days of Pampei کو اردو میں منتقل کیا۔ یہ آج سے کم وبیش ساٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ وہ 1950ء سے بھی پہلے سے افسانے اور ڈرامے لکھ رہے ہیں۔ میں نے بطورِ خاص لکھا ہے۔ وہ شائستہ، مخلص اور مہذب ہیں۔ دیرینہ روایت کے پابند ہیں لیکن یہ ان کا ایک روپ ہے۔ اگر وہ گلزار بائی، وزیر بائی، سردار بائی یا کسی اور بائی کے مجرا خانے میں ہوں کہ ماضی کے اس دور میں حاجی لق لق اور اختر شیرانی کے قریب ہیرا منڈی کے معدوم کلال خانے میں امرتسر کے ''مٹھ مالٹا'' کا پوا لئے گندی اور بدبودار فضا میں بیٹھے اختر شیرانی کا یہ شعر گنگنا رہے ہوں تو اس میں کوئی تعجب نہیں ؎

ہر جام میں رقصاں ہے پری خانۂ مستی
ہونٹوں سے لگا کر یہ پری خانہ نچے جا

ایسے میں تو وہ بالکل ہی اور شخص ہوتے ہیں۔ اس روپ میں تو اللہ دتہ، عبدالرحیم، عبداللطیف، عبدالرحمان فاروقی، عنایت بائی ڈھیروں والی کے بھائی عنایت اور بعض دوسرے دوستوں ہی نے دیکھا ہوگا۔ ایسے میں وہ ماجا ساجا تا جانوع کی کوئی چیز ہوں گے۔ پھر جب حلقہ اربابِ ذوق میں قیوم نظر، امجد الطاف، شہزاد احمد، ریاض احمد، عابد علی عابد، عبادت بریلوی،

ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، ڈاکٹر سعید اللہ، ڈاکٹر اجمل اور ایسے ہی دیگر جید علما اور محققین کے سامنے اپنے تحقیقی مقالات، ڈرامے کی ابتداء، یونان کا تھیئٹر، یونان کا عہدِ جاہلیت اور دیو مالا کا ارتقاء اور کتنے ہی دوسرے تحقیقی مقالات بڑے اطمینان سے پڑھتے ہوں گے تو وہ ایک بلند پایہ اور بے مثل محقق ہوں گے۔ ان کا زیرِ اشاعت مسودہ ''ڈرامے اور تھیئٹر کا دورِ اوّل'' ان کی خاص تحقیق اور کاوش کا نتیجہ ہے۔

اس شخص کے اندر روشنیوں کی ہفت پہلو شمع فروزاں ہے۔ وہ بیک وقت درجہ خاص کے افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور محقق ہے۔ ڈرامے تھیئٹر، اکالوجی (ماحولیات) دیو مالا، دینِ ساحری، یونانیات، مصریات اور جنسیات کے مطالعے اور مقالات کے حوالے سے درجہ خاص میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انہیں قدر و منزلت کے اس پیمانے سے نہیں ناپا گیا جس کے وہ مستحق ہیں اور ان سے کہیں کمتر درجے کے ادیبوں اور محققوں کا ان سے کہیں زیادہ چرچا ہوا اور قدر و منزلت سے نوازا گیا۔

اردو ادب اور علم و فن کو enrich کرنے میں رحمان مذنب کی خدمات بیش بہا اور فتوحات قابلِ رشک ہیں۔ وہ پوری لگن اور جذبے سے کام کرنیکے عادی ہیں۔ شور مچانا اور اپنی ڈفلی بجانا ان کا مسلک نہیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو یقیناً تضیع اوقات کے مجرم ہوتے اور افسانوں، ڈراموں اور تحقیقی مقالوں کا اتنا بڑا ذخیرہ اردو ادب کے حوالے نہ کر پاتے۔

انہیں ہندوستان کے بہت بڑے عالمانہ قبیلے کا فرد ہونے کا جو موقع ملا انہوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ان کی کتابیں ''تہذیب و تمدن اور اسلام'' ''اسلام اور جادوگری'' خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ''قتل کے چند تاریخی مقدمات'' (سقراط سے ممتاز بیگم امرتسری تک) ان کی وسعتِ مطالعہ کا زندہ ثبوت ہیں۔ ان کے بے شمار مسودے شائع ہو چکے ہیں اور کتنے ہی الماریوں میں بند پڑے ہیں۔ کوئی علم و فن کا دوست، عالی دماغ اور کشادہ دل پبلشر رحمان مذنب کے مسودوں کو طبع کرنے کی جسارت کرے تو وہ علم و ادب کے حوالے سے بے پایاں خدمت انجام دے گا۔

O

لاہور کا چیلسی

حکیم احمد شجاع

اس مضمون میں بعض بزرگوں کے علم وفضل کا تذکرہ محض اشارۃً کیا گیا ہے لیکن اس میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے کمالات کا بیان کسی قدر تفصیل چاہتا ہے۔ یہ تفصیل اگر اختصار کے ساتھ بیان کردی جائے تو مناسب ہے۔ اس سے ان بزرگوں کی یاد بھی تازہ ہو جائے گی اور اس مضمون کی تاریخی حیثیت میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

مفتی محمد عبداللہ ٹونکی فقہ اسلامی کے بہت بڑے عالم تھے۔ اسلامی قانون اور شرعی تنازعات میں ان کا فتویٰ ناقابلِ تردید سند متصور ہوتا تھا۔ وہ بہت کم بولتے تھے لیکن جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا برہان قاطع کا حکم رکھتا تھا۔ یہ ہر شام حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آ بیٹھتے تھے اس مجلس میں بیٹھنے والوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا پیشہ وکالت تھا اور کچھ ایسے بھی جن کو قرآنی احکام کی حکمتوں کو سمجھنے کا شوق تھا۔ اس باب میں مفتی محمد عبداللہ ٹونکی کی رہنمائی ان لوگوں کے بڑے کام آئی۔

شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی ۱۸۵۳ء میں اورینٹیل کالج میں عربی کے مدرس مقرر ہوئے اور ۱۸۸۷ء میں مولانا فیض الحسن کے انتقال کے بعد عربی کے صدر مدرس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ ہمارے مکان کے دیوار بہ دیوار رہتے تھے۔ ان کے صاحبزادے مفتی انوار الحق اور میرا بچپن ساتھ ساتھ گزرا ہے۔ مفتی انوار الحق بھوپال میں ایک مدت تک ناظمِ تعلیمات رہے۔

مفتی محمد عبداللہ بہت دبلے پتلے انسان تھے۔ پان ہر وقت چباتے رہتے تھے اور جب بات کرتے تو منہ پر رومال رکھ کر بات کرتے تھے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اس

ناتواں جسم میں علم وفضل کا اتنا ذخیرہ ہے کہ کوزے میں دریا بند ہونے کی مثل ان پر صادق آتی ہے۔ ۳۴ سال تک اورینٹیل کالج میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور لاہور کو جسے وہ اپنا دوسرا وطن کہا کرتے تھے داغِ مفارقت دے گئے۔

شرع محمدی پر چار جلدوں میں ان کی کتاب اردو زبان کا ایک قابلِ قدر سرمایہ ہے۔ کئی مسائل پر ان کے فتاویٰ رسالوں کی صورت میں شائع ہوئے اور تشنگانِ رموز ونکات شرع اسلامیہ نے ان سے بڑا فیض پایا۔ لاہور سے جا کر کچھ عرصہ تک دارالعلوم ندوہ میں کام کیا اور اس کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۰ میں رحلت فرمائی۔ ان کی وفات سے عربی زبان ایک فاضل اَجل اور اسلامی شریعت ایک بے نظیر نکتہ دان ان کی ذات سے محروم ہو گئیں۔ سید سلیمان ندوی کے قول کے مطابق وفات کے وقت مفتی محمد عبداللہ[1] کی عمر کوئی ستر برس کے قریب تھی۔

............O............

روزنامہ ''مشرق'' لاہور، مورخہ 28 جون 1966ء

---

[1] مفتی محمد عبداللہ ٹونکی رحمان مذنب کے والد مفتی عبدالستار کے چچا اور رحمان مذنب کی نانی کلثوم بی کے عم زاد بھائی بھی تھے اور رضاعی بھائی بھی۔ ان کے صاحبزادے مولف نسخۂ حمیدیہ غالب مفتی انوار الحق مفتی محمد عبداللہ کے کلکتہ یونیورسٹی چلے جانے کے بعد بھوپال چلے گئے۔ پہلے انسپکٹر آف اسکولز، پھر وزیر تعلیم اور آخر میں وزیر مالیات بنے، وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

دو افسانہ نگار

رحمان مُذنب ...... قتیلِ شیوۂ آذری

صابر لودھی

رحمان مذنب کا نام میں نے پہلی بار 1954ء میں سنا۔ عجیب سا لگا۔ رحمان کے معنی مجھے آتے تھے، مذنب سے ابھی واقف نہ تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ مذنب، گنہگار کو کہتے ہیں۔ حیرت ہوئی کہ رحمان کے ساتھ مذنب کو کیوں ملحق کر دیا گیا۔ وقت گزرتا گیا۔ حلقہ ارباب ذوق میں رحمان مذنب سے ملاقات ہوتی رہی۔ متناسب قد، چھریرا جسم، چوڑی پیشانی، اٹھی ہوئی گردن، گلے تک قمیض کے تمام بٹن لگے ہوئے۔ دوسروں کی تحسین وتنقید سے بے نیاز، اپنے خیالات کے اظہار پر قادر اور مطمئن...... سنجیدہ اور علمی مضامین پر وہ قدیم تہذیب اور ساحری کے حوالوں سے کھل کر بات کرتے...... کبھی کبھی قربانی کا تذکرہ بھی لے بیٹھتے۔ اگر کسی مقالے میں قدیم تہذیب کا حوالہ آتا اور قربانی اور ساحری کا ذکر نہ ہوتا تو وہ اپنی طرف سے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتے۔ میرے ذہن میں ان کی شخصیت کا یہی تصور رہے گا کہ وہ جادوگر ہیں اور ساحری کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھتے ہیں۔

1958ء میں میرے دوست اور ہم جماعت کامریڈ عبدالغفور قریشی نے پیسہ اخبار کی منہاس سٹریٹ میں ''ناشرین'' کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا اور محدود بجٹ کے ساتھ لامحدود کتابیں چھاپنے کا پروگرام بنایا۔ فیض احمد فیض سے درخواست کی گئی کہ وہ History of Courtship کا ترجمہ ''تاریخِ عاشقی'' کے عنوان سے کر دیں۔ احمد ندیم قاسمی سے ''برگ حنا'' چھاپنے کے حقوق حاصل کئے۔ امجد حسن معیدی نے مصری مصنف کی ایک طنزیہ کتاب ''ارض النفاق'' کا ترجمہ باون گزے کے نام سے کیا (''باون گزے'' کا عنواں امجد الطاف نے

تجویز کیا تھا)۔ رحمان مذنب نے ''جادو اور جادو کی رسمیں'' طباعت کے لئے دی۔ ''تاریخ عاشق'' کے سواتینوں کتابیں مصور جالی کے سرورق کے ساتھ چھپیں اور مقبول ہوئیں۔ کامریڈ غفور کی مثالیت پسندی، ایمانداری اور منصور قیصر کی ایک منفی شرارت کے سبب ادبی کتابوں کا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا لیکن اس ادارے کے ذریعے مجھے رحمان مذنب کے قریب ہونے اور ان کے وسیع مطالعے سے مستفید ہونے کا موقع مل گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب رحمان مذنب کے افسانے ''پتلی جان'' کی ادبی حلقوں میں بڑی دھوم تھی۔ پروفیسر قیوم نظر نے حلقہ اربابِ ذوق کے ترجمان مجلّے ''نئی تحریریں'' میں رحمان مذنب کا یہ افسانہ شائع کیا تھا۔ اس افسانے میں ایک دلربا ہیجڑے پتلی جان کی دلگداز کہانی بیان کی گئی تھی۔ اس شمارے میں آغا بابر کا ایک افسانہ 'چارلس ہیجڑا' بھی شائع ہوا تھا لیکن جو فنی پختگی پتلی جان میں تھی اس سے چارلس محروم تھا...... یہ پختگی کہاں سے آئی تھی اور رحمان مذنب کے نام کا ایک اسرار تھا۔ اس کا اندازہ **1991**ء میں ہوا جب رحمان مذنب کے افسانوں کا پہلا مجموعہ چھپ کر بازار میں آیا اور رحمان مذنب نے اپنے مختصر تعارف میں لکھا کہ ''میری جائے پیدائش ایسی تھی کہ ادھر اذان کی آواز کان میں پڑتی اور ادھر مغنیہ کی تان سنائی دیتی۔'' رحمان مذنب کے والد بزرگوار مفتی محمد عبدالستار شاہی مسجد کے مفتی تھے۔ ہر صبح حدیث کا درس دیتے۔ ان کے کتب خانے میں عربی اور فارسی کی کتابوں کا وقیع ذخیرہ تھا۔ علمی اور دینی حلقوں سے تعلق رکھنے والے متین وفطین حضرات ان سے ملنے آتے۔ مفتی عزیزالرحمان کو بھی علم کی دولت اسی ماحول سے ملی لیکن جب وہ گھر سے باہر نکلتے تو ان کے ایمان میں خلل پڑنے کی صورت پیدا ہو جاتی۔ اس علاقے میں واقع مسجدوں کے زیر سایہ ہیجڑوں کی بیٹھکیں تھیں۔ نکیائیوں، کسبیوں، نوچیوں اور ڈیرہ دارنیوں کے بازار اور بالا خانے تھے۔ نیچے سے اوپر تک دید کا سامان پوری حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھا۔ مفتی عزیزالرحمان کہاں تک نیچی نگاہ کیے رکھتا، اس لئے افسانوں کی اس دنیا میں وہ بھی اک افسانہ بن گیا اور مفتی عزیزالرحمان کے بجائے رحمان مذنب کے نام سے مشہور ہوا۔ ''میری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی۔''

رحمان مذنب اپنے گھر میں مفتی عزیزالرحمان بنے رہے۔ بابا کے کتب خانے سے

اپنے علم میں اضافہ کرتے اور فتوے کی عبارت حفظ کر کے اپنے اباجی کی طرف سے فتوے لکھتے رہے لیکن جونہی وہ گھر سے باہر قدم رکھتے رحمان مذنب بن جاتے کہ ''تِتلی جان'' اور ''گشتی'' ان کے راستے کے چراغ تھے۔ عزیز تھیٹر ان کی منزل تھا۔ یہیں سے انہیں آوارگی کی عادت پڑی اور یہ آوارگی انہیں جگہ جگہ لئے پھری۔ عزیز تھیٹر میں ان کا لکھا ہوا ڈراما ''جہاں آرا'' ناکام ہوا تو ان کے اندر کئی ڈراموں نے جنم لیا۔ انہیں کتابیں اور رام پیاریاں جہاں نظر آتیں ادھر چل پڑتے۔ رام پور، اندور، بھوپال، بمبئی، لکھنو اور دلی میں ان کے پھیرے نظر بازی ہی کے لئے تو تھے۔ یہ نظر بازی ان کی شخصیت کو کم کرنے کے بجائے ان کی تعمیر کرتی رہی...... فتوے لکھنے والا بڑا مضبوط دل ہوتا ہے، وہ جذبات کے دھارے پر کبھی نہیں بہتا...... وہ تماشا دیکھتا ہے، تماشا نہیں بنتا...... رحمان مذنب نے اربابِ نشاط کو قریب سے دیکھا...... بالا خانوں پر بار بار چڑھے اور اترے لیکن اپنے ذہن پر کسی کو سوار ہونے اور اپنے دل میں کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہ دی۔ ویسے بھی رحمان مذنب جاگیردار اور نواب نہ تھے کہ کسی کو اپنے لئے ''پابند'' کرتے یا عارضی سا رشتہ استوار کرتے اور محض قتیلِ شیوۂ آذری تھے۔ ان کا گناہ اگر کوئی تھا بھی تو وہ نگاہوں کا گناہ تھا۔ راجوں مہاراجوں اور فرنگیوں نے اس زمانے میں مجروں کو عام کر دیا تھا۔ میلوں ٹھیلوں میں بھی بزم آرائیاں ہوتیں۔ اربابِ نشاط اپنی روزی کا سامان کرتے اور شرفا ان کی سرپرستی کرتے۔ رحمان مذنب نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ ان کے افسانوں کی جزئیات سے اس فطری کمزوری کا اظہار ہوتا ہے لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی نگاہیں سیر ہو کر مطمئن ہو گئیں۔ جوں جوں عمر بڑھی رحمان مذنب کی نگاہوں میں پیاس کی جگہ خلوص اور بے نیازی جھلکنے لگی۔ ان کے پاس لٹانے کے لئے دولت نہ تھی۔ وہ تو تکیے پر بیٹھا ایسا سائیں تھا جو محبوب کے سیاہ تل کے بدلے سمرقند اور بخارا دوسروں کو بخش دیتا ہے...... کوباں، گوہری، دلبری، زیباں اور بالی تو باہر کی عورتیں تھیں۔ وہ تماشا تو دکھا سکتی تھیں، اپنے عارض کی تپش سے اسے پگھلا نہیں سکتی تھی۔ رحمان مذنب کے اندر ایک مفتی کتاب کھولے بیٹھا تھا...... کتابیں مفتی جی کے کردار کی حفاظت کرتی رہیں اور انہیں نہ تو گمراہ ہونے کی ضرورت پیش آئی اور نہ احساسِ گناہ کا شکار ہونے کی۔ رحمان مذنب آج بھی کمپلیکس میں مبتلا نہیں البتہ اس رویئے نے رحمان مذنب کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ طوائف کے درد کو محسوس کرے۔

داغ اور حفیظ کی شاعری میں اور منٹو، غلام عباس اور آغا بابر کے افسانوں میں بھی طوائف اپنا عشوہ غمزہ دکھاتی ہے۔ کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ یہ شاعر اور ادیب اس کے زیادہ ہی قریب آ گئے ہیں۔ رحمان مذنب نے اپنے افسانوں میں طوائف ہی کو موضوع بنایا ہے لیکن ایک جگہ بھی داغ کا یہ انداز پیدا نہیں ہوا کہ......

ساتھ ان کے مری نگاہ گئی جب نگاہ تھک گئی تو آہ گئی

رحمان مذنب نے نگاہ ان کے لئے رکھی اور آہ اپنے دل کے نہاں خانے میں محفوظ کر لی۔

رحمان مذنب کے ساتھ وقت گزارا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ بلند ہے اور وہ اپنے نفسِ امارہ پر اس طرح قابو رکھتے ہیں جس طرح شہ سوار سرکش گھوڑے کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے...... نگاہ کی بلندی کا اندازہ گلے کی گھنڈی سے ہوتا ہے جسے وہ ہمیشہ کالر کا بٹن لگا کر چھپائے رکھتے ہیں اور ضبط کی کیفیت ان کی گفتگو سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ ایک فقرہ بھی ایسا نہیں بولتے جس میں شائستگی نہ ہو۔ گھٹیا لطائف اور سوقیانہ جملے ان کی زبان پر نہیں آتے۔ انہیں موضوع کی مناسبت سے جو کہنا ہوتا ہے اپنے افسانوں میں کہہ دیتے ہیں۔ ان کی نگاہوں نے جو کچھ دیکھا اور اس دید سے جو کرب محسوس کیا اسے وہ کرداروں کی زبان سے ادا کرتے ہیں اور فن کی صورت میں شخصیت سامنے لاتے ہیں۔ عام بول چال میں رحمان مذنب کہیں اِور ہوتا ہے اور مفتی عزیز الرحمان اپنا مافی الضمیر اپنی علمی زبان میں ظاہر کرتا ہے۔ رحمان مذنب کے ضبط کا یہ عالم ہے کہ جب تک ان کے والد زندہ رہے انہوں نے اپنا کوئی افسانہ نہیں چھپوایا۔ ڈراما نویسی، مضمون نگاری اور صحافت کو ذریعہ معاش بنائے رکھا۔ **1935**ء میں ان کی والدہ اور **1937**ء میں والد محترم کا انتقال ہوا۔ **1937**ء کے بعد ہی مفتی عزیز الرحمان نے اپنے تجربوں کو فن میں ڈھالنا شروع کیا۔ تکی، گوہری، جہری، کوباں اور زہرہ کی باتیں اور پھول سائیں، رحیمے اور سلطان کے قصے انہیں اس وقت یاد آئے جب انہیں سرزنش کا خوف نہ رہا۔

رحمان مذنب کی بلند نگہی اور بلند ہمتی انہیں کارزارِ حیات سے ستیزہ کار رہنے کا عزم بخشتی رہی۔ وہ فکرِ معاش میں بھی لگے رہے اور اپنی توانائی اپنی تعمیر میں بھی صرف کرتے رہے۔ انہوں نے ڈرامے لکھے، ترجمے کیے، تحقیقی اور علمی مقالات لکھے۔ اخبارات اور ڈائجسٹوں میں لکھا،

لیکن جو بھی لکھا اپنے ذوق کے مطابق لکھا، اپنے رنگ اور اپنے مزاج کے لوگوں کے ساتھ کام کیا...... عابد علی عابد جب دیال سنگھ کالج کے پرنسپل تھے، رحمان مذنب دفتر کے سربراہ تھے۔ روزی کا مسئلہ بھی حل ہوتا تھا، ذوقِ جمال کی تسکین بھی ہوتی تھی۔ عابد علی عابد ''افرودائتی'' کے مترجم تھے...... ''روپ متی باز بہادر'' کے مصنف تھے تو رحمان مذنب بھی رام پیاری کے خالق تھے۔ یونانی جمال کے کئی مجسمے ان کے دل میں بسے ہوئے تھے۔ وید عابد علی محفل آرائی کے دلدادہ تھے۔ ان دنوں میں لاہور کا دانشور طبقہ اور جمال پرست نوجوان دیال سنگھ کالج کی مجالس کی رونق تھی۔ رحمان مذنب بھی اس چشمے سے سیراب ہو رہے تھے۔ سید عابد علی عابد کالج سے گئے تو خزاں کا دور آگیا۔ رحمان مذنب نے بھی نیا آشیانہ ڈھونڈا۔

احمد شجاع پاشا سے محبت بڑھی تو صنعت کاروں کے ایک ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں احمد شجاع پاشا کی حکمرانی تھی۔ رحمان مذنب ان کی نگرانی میں کام کرنے لگے اور بھول گئے کہ ادب کے میدان میں انہیں آگے بڑھنا ہے۔ ان کی سوئی بہی کھاتوں پر اٹک گئی۔ میری ان سے ملاقات ہوئی۔ پوچھا کام کیسا ہے؟ ''بہت اچھا...... تنخواہ اچھی ملتی ہے......'' ''برقاب'' میں روشنی نظر آئی تو 'واپڈا' کے تعلقات عامہ کے شعبے سے وابستہ ہو گئے۔ پرچے میں بجلی اور پانی کی باتیں اور افسروں کی تصویریں چھپتیں۔ رحمان مذنب بڑے شوق اور جوش کے ساتھ پرچہ نکالتے اور تنخواہ لے کر گھر آجاتے۔ انہیں تو کام سے غرض رہی۔ محنت شاقہ ان کے کمال کا ایک پہلو ہے۔ انہوں نے جہاں بھی کام کیا، دل لگا کر کام کیا اور ایسی محبت سے کام کیا کہ دفتر کی فائلیں افسانوں کی طرح دلچسپ ہو گئیں۔

عملی زندگی میں قدم رکھا تو رحمان مذنب ایک بار پھر مفتی عزیز الرحمان بن گئے۔ اللّے تللّے ختم ہوئے، نظر بازیاں معدوم ہوئیں۔ شادی کی، بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ ان کی اچھی تربیت کی۔ ایک بیٹے نے فوج میں کمیشن لیا، دوسرے نے صحافت کے پیشے کو اپنایا۔ ان بچوں کو حوصلہ مند اور دلیر بنایا لیکن باطن میں چھپا ہوا مفتی بھی باہر نکل آیا...... 1970ء کے الیکشن ہوئے تو رحمان مذنب پریزائیڈنگ آفیسر مقرر ہوئے۔ الیکشن کے قواعد کی پوری تفصیل پڑھی۔ ایک کاغذ پر اہم نکات کو سرخیوں کی صورت میں لکھا۔ میری بھی یہی ڈیوٹی تھی اس لئے ہدایات کی تلخیص کی

ایک کاپی مجھے بھی دی۔ دو سرخ جھنڈیاں...... مجھے دکھائیں:

''پولنگ سٹیشن پر بلوہ ہو جائے تو چھت پر چڑھ کر انہیں ہلانا۔ ہیلی کاپٹر چکر لگا رہا ہو گا...... فوراً نیچے اترے گا......''

''لیکن چھت پر کیسے چڑھیں گے، ہر جگہ سیڑھیاں تو نہیں ہوتیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہاں...... یہ تو ابھی نہیں سوچا......''

بہرحال وہ غور و فکر میں ڈوب گئے۔ ان کی ڈیوٹی شہر سے بہت دور ایک دیہاتی حلقے میں لگی تھی اس لئے اپنا ووٹ کاسٹ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے آبائی حلقے میں مولانا عبیداللہ انور الیکشن لڑ رہے تھے، مقابلے میں پیپلز پارٹی کا امیدوار تھا۔ رحمان مذنب نے اپنی بیوی سے وعدہ لیا (بلکہ وصیت کی کہ الیکشن سے سلامت لوٹ آنے کی امید کم تھی) کہ ووٹ ضرور کاسٹ کرنا اور مولانا عبیداللہ انور کے نام کے سامنے نشان لگانا۔ رحمان مذنب ڈیوٹی پر چلے گئے اور بیوی نے اپنے ضمیر کی روشنی میں اپنا ووٹ پیپلز پارٹی کے امیدوار کو دے دیا۔ الیکشن کے بعد رحمان مذنب مجھے ملے تو افسردہ تھے کہنے لگے۔

''پیپلز پارٹی کو جیتنا تھا۔ اس معاملے میں تو بیویوں نے بھی حکم عدولی کی۔''

مجھے خوشی ہوئی کہ ان کی بیگم نے اپنی خواہش کے مطابق اپنے ووٹ کا استعمال کیا لیکن زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ رحمان مذنب کے اندر کا مفتی پوری توانائی سے زندہ رہا۔ کالیداس نے ''شکنتلا'' میں لکھا ہے:

''دیکھو...... کنول کا پھول کیچڑ میں رہ کر بھی کنول کا پھول ہی رہتا ہے...... خوبصورت اور سپید۔''

رحمان مذنب کنول کے پھول کی طرح اجلے رہے۔

ناچ گانے، تھیٹر، بالا خانے، راگ رنگ کی محفلیں ذہنی سفر کی ابتدائی منزلیں تھیں۔ ان منزلوں پر وہ اپنے مزاج کی افتاد اور ماحول کے اثرات کے سبب تھوڑی دیر کے لئے رکے لیکن کتابوں کی محبت انہیں بلندی کی طرف لئے جا رہی تھی۔ اس لئے وہ آگے بڑھتے گئے۔ لائبریریاں، ادبی حلقے اور علم پرور احباب کی محفلیں ان کی منزل بنیں۔ ''ناشرین'' کا ادارہ ان کے

قیام کی ایک منزل تھی...... ''جادو اور جادو کی رمیں'' کی کتابت اصغر کر رہے تھے۔ ان کا خط بہت اچھا ہے۔ ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں۔ (ان دنوں قرآن پاک کی کتابت کر رہے ہیں اور ان کے چہرے پر عجیب طمانیت اور روشنی پھیلی نظر آتی ہے) اس لئے کتاب پر تبصرہ بھی کرتے رہتے۔ اس ادارے میں علم الاصنام اور جمال الدین افغانی کے افکار پر زیادہ بحث ہوتی۔ رحمان مذنب پورا مقالہ منہ زبانی سنا دیتے، پھر چائے آتی۔ ہم چائے پیتے اور کامریڈ عبدالغفور پان کی دو تین گلوریاں ایک ساتھ کھا کر بیڑی کا لمبا کش لیتے۔ علم الاصنام کی بحث دوبارہ شروع ہو جاتی۔ ساتھ ساتھ رحمان مذنب اصغر کو سمجھاتے رہتے۔ کون سا حرف کیسے لکھنا ہے؟ شوشا کہاں کہاں آتا ہے؟ شوشے والے 'س' کو، بغیر شوشے والے 'س' کو 'ذ' سے کیسے ملایا جاتا ہے۔ املے کا کیا کام ہے۔ ادغام کہاں ہوتا ہے؟...... کتنی ہی باتیں رحمان مذنب ہمیں سمجھاتے، یہاں تک کہ وہ یہ بھی سمجھاتے کہ اگر چٹ پر کچھ لکھ کر جیب میں رکھو تو چٹ کو اس طرح تہہ کرو کہ لکھی ہوئی عبارت باہر ہوتا کہ یاد رہے...... اصغر کو عمدہ کتابت پر ''پاپوش رقم'' کا خطاب دیا گیا۔ ایک دن انہیں 'پاپوش رقم' کے معانی سمجھ میں آئے تو ہم پر برس پڑے۔

3 جنوری **1969**ء کو ''نئی ادبی تنظیم'' کا پہلا اجلاس وائی ایم سی اے کے بورڈ روم میں ہوا۔ اس تنظیم کے محرک اور سیکرٹری اعجاز فاروقی تھے۔ جوائنٹ سیکرٹری کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی۔ رحمان مذنب، عارف عبدالمتین، صادق حسین، غلام الثقلین نقوی، صلاح الدین ندیم اور فرخندہ لودھی اس کے بنیادی اراکین میں شامل تھے۔ اس تنظیم میں سے زیادہ دلچسپی رحمان مذنب نے لی۔ یہاں تک کہ ایک سال کے اندر اندر تنظیم کے سیکرٹری بن گئے۔ ''نئی ادبی تنظیم'' کا تنقیدی اجلاس مہینے میں ایک بار ہوتا۔ تنظیم کے اجلاسوں میں بہتر تخلیقات تنقید کے لئے پیش کی جاتیں۔ لمبی بات کرنے والوں میں...... عارف عبدالمتین، صلاح الدین ندیم اور رحمان مذنب سرفہرست ہوتے، تاہم جب اجلاس کی روداد ایک ماہ بعد پڑھی جاتی تو عارف عبدالمتین اور صلاح الدین کو اپنے اپنے کہے ہوئے تمام فقرے یاد ہوتے اور رحمان مذنب سب کچھ بھول کر تازہ تخلیقات پر تنقید کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہوتے...... رحمان مذنب کی شخصیت کا یہ پہلو بڑا دلچسپ ہے۔ وہ ماضی میں زندگی بسر نہیں کرتے، حال میں جیتے ہیں۔ وہ مستقبل کا کوئی خواب بھی نہیں دیکھتے۔

رحمان مذنب غیور ہیں، انا پرست نہیں۔ ماضی کے کتنے حسین دریچوں میں انہوں نے جھانکا، ان کا دل جانتا ہے...... زندگی کے کتنے ہی کٹھن لمحے جوانہوں نے پل صراط سے گزرنے کی کیفیت میں گزارے، ان کی آنکھوں سے جھانکتے ہیں...... لیکن وہ خاموش رہتے ہیں۔ شانت سمندر کی طرح کہ ساری خوشیاں، سارے غم ان کے اپنے وجود کا حصہ ہیں۔ وہ اس نگار خانے کا نظارہ خود ہی کرتے رہتے ہیں۔ ع موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال۔ کبھی کبھی گمان گزرتا ہے کہ وہ زینو کے شاگرد ہیں اور روایتی فلسفے کو زندگی کا لازمی عنصر خیال کرتے ہیں۔ جولیس سیزر کے قاتل دوست 'بروٹس' کی طرح اپنے وجود میں گم، اپنے ہی درد کا لطف لیتے ہوئے نہ تو المیے پر آنسو بہاتے ہیں نہ اپنی فتح مندی پر قہقہہ لگاتے ہیں۔ نگاہوں کے راستے جو تصویریں اور نقش و نگار ان کے دل میں ابھرے، وہ انہیں کسی کو دکھانا نہیں چاہتے...... انہیں زوال کا خوف بھی نہیں۔ زوال کا خوف لذت پرستوں کو ہوتا ہے۔ وسیع مطالعے نے زندگی کی حقیقت ان پر واضح کردی ہے۔ ہمارے ملک کے اکثر ادیبوں اور شاعروں کو عمر کے ڈھلتے ہی احساس ہونے لگتا ہے کہ انہیں بقدر ظرف انعام واکرام نہیں ملا۔ رحمان مذنب کو ایسی کوئی شکایت نہیں۔ انہوں نے ادب کو طلبِ زر کا ذریعہ سمجھا ہی نہیں۔ کسی کتاب کی رائلٹی مل گئی تو خوش ہوکر لے لی نہ ملی تو فکرِ روزگار سے نجات پانے کے لئے اور کام کرلیا۔

وہ عیب جوئی کے دلدادہ نہیں۔ 'ہنرش نیز بگو' کے قائل ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کے سینے میں بڑے بڑے بزرجمہروں کے راز دفن ہیں۔ وہ ان رازوں کو زبان پر لانے کے لئے تیار نہیں۔ آنکھ نے جو کچھ دیکھا اس کو انہوں نے طلسم خیال ہی تصور کیا وگرنہ آگے بڑھنے کے سبھی راستے مسدود ہوجاتے۔ داستانوں کی خوفناک صدا جسے مڑکر سننے سے انسان پتھر بن جاتا ہے، ماضی ہی تو ہوتا ہے جو مسافر سے آگے بڑھنے کی صلاحیت چھین لیتا ہے...... رحمان مذنب ایسی خوفناک صدا نہیں سنتے۔

رحمان مذنب نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ''نئی ادبی تنظیم'' کے ماہانہ اجلاس میں وہ ہمیشہ کوشش کرتے کہ ایک تخلیق نئے لکھنے والے کی ضرور ہو۔ میں نالائق تھا پھر بھی انہوں نے 'جدید افسانے' پر ایک تنقیدی مضمون مجھ سے لکھوالیا۔ مستنصر حسین تارڑ نے جب سفر

نامہ لکھنا شروع کیا تو رحمان مذنب نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں سفر نامے کی ایک قسط پڑھنے کی دعوت دی۔ **2** جولائی **1971**ء کو مستنصر حسین تارڑ نے ''نیلی آبشار'' کے عنوان سے ایران سے متعلق اپنے سفر نامے کا ایک باب 'تنظیم' کے اجلاس میں پڑھا۔ تارڑ کی (غالباً) یہ پہلی تحریر تھی جو کسی ادبی حلقے میں پڑھی گئی۔ رحمان مذنب نے ہوا پہلے ہی باندھ دی تھی۔ بیان میں بہاؤ بھی تھا اس لئے یہ تحریر پسند کی گئی۔ مستنصر حسین تارڑ سے زیادہ رحمان مذنب نے اطمینان کا سانس لیا۔ قبولیت کی سند پا کر تارڑ رواں ہو گئے اور رحمان مذنب دوسرے سفر ناموں اور افسانہ نگاروں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ نئی ادبی تنظیم کے اجلاس جاری رہتے تو وہ کئی لکھنے والوں کو متعارف کراتے اور ان کی تربیت کرتے۔

رحمان مذنب کی کوئی لابی نہیں۔ وہ پروپیگنڈے اور گروہ بندی کو ادب کے لئے اچھا نہیں سمجھتے۔ اس کی دوستی ہر اس شخص سے ہو جاتی جو کتابوں کا دوست ہے اور علم او ادب میں دلچسپی لیتا ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد نے 'ادبی دنیا' کے ذریعے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی اور ادب کا ایک معیار قائم کیا۔ اس لئے وہ مولانا کے عاشق ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے صلاح الدین احمد کی علمی روایت کو آگے بڑھایا اور ان کی یاد میں ''اوراق'' جاری کیا تو انہیں آغا صاحب سے عقیدت ہو گئی۔ رحمان مذنب نے ''اوراق'' کے لئے کئی خوبصورت افسانے لکھے اور نئے لکھنے والوں کی تخلیقات کی تحسین کی۔ غلام الثقلین نقوی اور ڈاکٹر انور سدید اوراق کے ذریعے ان کے دوست بنے۔ ان کی دوستی درویش مزاج ادیبوں اور شاعروں سے رہی۔ کوئی ادیب افسرانہ رویہ اختیار کرے یا کوئی افسر زبردستی ادب کے حریم میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو رحمان مذنب کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ وہ آزاد مملکتوں کی طرح برابر کی سطح پر بات کرنے کے قائل ہیں۔ وہ جس طرح چپ چاپ مطالعہ کرتے ہیں اسی طرح چپ چاپ دوستی نبھائے جاتے ہیں۔ حلقہ بنائے بغیر، غیبت کیے بغیر ان کا کھانا ہضم ہوتا رہتا ہے۔

رحمان مذنب ماحول کا افسانہ لکھتے ہیں اور ماحول ہی کا افسانہ پسند کرتے ہیں۔ طوائف کے موضوع پر انہوں نے جتنے افسانے لکھے ان میں ماحول ہی سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔ کرداروں کی تخلیق ماحول ہی کو دکھانے کے لئے کی گئی ہے۔ ماحول ٹوٹتا ہے اور کوہاں کی جنت

اجڑتی ہے تو سارے شہر پر عذاب نازل ہو جاتا ہے۔ فرخندہ لودھی کے افسانے 'شرابی' پر رحمان مذنب نے ایک طویل مضمون لکھا ہے اس لئے کہ یہ افسانہ بھی ماحول کا افسانہ ہے...... فلموں میں ایکسٹرا گرلز سپلائی کرنے والا گھرانا 'شرابی' کا موضوع ہے اور یہ موضوع رحمان مذنب کے لئے دلچسپی کا باعث ہے۔ رحمان مذنب نے جتنے افسانے لکھے وہ زوال پذیر معاشرے کے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہیں۔ 'شرابی' بھی اینگلوانڈین گھرانے کی آخری ہچکی ہے۔ شاید اسی لئے انہیں یہ افسانہ پسند ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد نے انہیں ''مخلص فنکار'' کے خطاب سے نوازا تھا۔ ہمارے عہد میں 'مخلص فنکار' کے فن کے قدر دان بہت کم ہیں۔ مخلص عیار نہیں ہوتا اور اخباروں کی خبروں اور کالموں میں راہ پانے کے لئے عیاری کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ رحمان مذنب نے اپنے تعارف کے لئے دوسروں کو آواز نہیں دی...... جو کہنا تھا خود ہی کہہ دیا۔ شرع میں شرم کیسی؟ 'پتلی جان' کے پیش لفظ (قلم، کتاب اور زندگی) میں انہوں نے اپنے اور اپنے فن کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا۔ سیرت نبویؐ، ادب، ماحولیات، جنسیات، مصریات، دینِ ساحری، تصوف، فلم اور تھیئٹر کا تحقیقی مطالعہ کیا اور پھر ان موضوعات پر لکھا۔ تراجم میں بھی غیر معمولی دلچسپی لی۔ گلوریز آف اسلام اور ٹی ایس ایلیٹ کی کتاب ''پوئٹری اور ڈراما'' کو اردو میں منتقل کیا لیکن اپنے افسانوں کو وہ اپنے اظہار کا بہترین ذریعہ سمجھتے ہیں۔ شائد اس لئے کہ وہ شیوۂ آذری کے قتیل رہے ہیں اور جو لوگ ان کی زندگی میں شریک تھے وہی ان کے افسانوں کے کردار ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں ایک اہم دور کی تاریخ محفوظ کر دی ہے اور یہ معمولی بات نہیں!

............o............

رحمان مذنب-ایک بلند پایہ ادیب

کرم حیدری

مجھے یہ کہنے میں شمہ بھر باک نہیں کہ حضرت رحمان مذنب حلقہ ارباب ذوق کی رواں دواں شخصیت ہیں۔ان ایسے ہی معزز ارکان کی مساعی کے باعث اردو کی یہ عظیم ترین تنظیم وقیع خیال کی جاتی۔حضرت رحمان مذنب نہ فقط حلقے کے پروگراموں میں سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں ـــــ افسانہ، ڈراما اور مقالہ پڑھتے ہیں بلکہ تنقیدی بحث میں پیش پیش رہتے ہیں۔ ان کے سیر حاصل مطالعے اور مفکرانہ اسلوب سے سامعین کچھ پاتے ہیں۔نئی پود کی ذہنی تشکیل میں ان کا بھی حصہ ہے۔نئے لکھنے والے ان سے متاثر ہیں۔

جناب رحمان مذنب ایک خاصی شہرت رکھنے والے نثر نگار اور شاعر ہیں۔ ان کے مضامین، ڈرامے، افسانے اور دوسرے ادب پارے ملک کے مشہور ادبی جرائد میں شائع ہو کر اہلِ علم سے خراج تحسین حاصل کرتے رہتے ہیں۔ریڈیو پاکستان سے بھی ان کے فن پارے اکثر و بیشتر نشر کئے جاتے ہیں جنہیں سامعین بڑے ذوق وشوق سے سنتے ہیں۔حلقہ ارباب ذوق کے ایک پرانے رکن اور کارکن ہیں۔آج کل یہاں کی تنقیدی مجالس میں عام طور پر شامل ہوتے ہیں۔ان کی تنقید، علمی گفتگو، اور تحریر ہمیشہ پُر مغز، سنجیدہ اور بلند پایہ ہوتی ہے۔وہ ان متین اور سلجھے ہوئے اہلِ قلم میں سے ہیں جو دورِ حاضر میں اردو ادب کی تعمیر وارتقاء کے سلسلے میں نہایت مفید خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

اردو کے بلند پایہ نقاد حضرات ان کی تحریروں کا بالخاصہ ذکر کرتے ہیں۔انہیں فراموش کرنا محال ہے۔چنانچہ امسال سالنامہ ھمایوں میں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ایسے بلند پایہ نقاد نے اپنے مقالے میں ان کا ذکر کیا ہے اور سالنامہ ''ماہِ نو'' (۱۹۵۸ء) میں ایک مقالے میں بھی ان کا ذکر آیا ہے۔

حضرت رحمان مذنب باقاعدگی سے گذشتہ کم وبیش ربع صدی سے ریڈیو اور

رسائل و جرائد کے لئے لکھ رہے ہیں۔ ڈرامے کی ابتدا (مقالہ)، پتلی جان (افسانہ)، پھول سائیں (افسانہ)، ترقی پسند ادب کا مسئلہ (مقالہ)، اقبال ــــــ ایک شاعر (مقالہ)، جبرو (ڈراما)، انارکلی (ڈراما ــــــ پیروڈی)، زخمِ دل (ڈراما)، گوری گلاباں (افسانہ)، انقلاب اور معاشرہ (مقالہ)، ڈرامے کے تاریخی محرکات (مقالہ)، یونان کا تھیئٹر (مقالہ) اور بعض دیگر فن پارے اردو کا بہترین سرمایہ ہیں اور علمی اور ادبی حلقے میں نہایت وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

حضرت رحمان مذنب نے اپنی ادبی اور صحافتی زندگی میں برسوں کئی رسالے نہایت خوش اسلوبی سے ایڈٹ کئے۔ ادبی اور صحافتی دنیا میں ان کے ہر معروف شخصیت سے ذاتی روابط قائم ہیں۔ عابد علی عابد مرحوم ایم۔ ڈی۔ تاثیر فیض احمد فیض، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، محمود نظامی، مولانا صلاح الدین احمد، قیوم نظر، یوسف ظفر، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر وحید قریشی، شبلی بی۔ کام اور متعدد نامور شخصیتوں سے ان کے گہرے مراسم قائم ہیں۔ نئے لکھنے والے ان کا احترام کرتے ہیں۔

حلقہ اربابِ ذوق کے ارکان ان کے ساتھ ہیں اور ہر علمی اور فنی کام میں شریک و معاون۔

ان کی مدیرانہ صلاحیتیں گراں قدر ہیں۔

میں نے ان چند سطور میں کسی حد تک انہیں محیط کیا ہے۔

المرقوم ۲۵ اپریل ۱۹۵۸ء

..........O..........

The Courtesan Phenomenon

SARWAT ALI

WITH REHMAN MUZNIB THE COURTESAN BECOMES THE MOST IMPORTANT INSTITUTION WHICH MOVES THE WHEELS OF SOCIETY. HE IS NOT CONCERNED ABOUT WEIGHING HER IN THE SCALES OF GOOD AND EVIL. SARWAT ALI

From times immemorial courtesans have figured very prominently in our literature, and still continue to do in one way or the other. Rehman Muznib has made them a permanent theme in his short stories and novels. This is in sharp contrast to western literature where the courtesan has suffered a decline with the emancipation of women.

Courtesans where somehow placed at the centre of a great riddle of creation, perhaps because of their ability of to hold men hostage to a sense of wanton abandonment. They presented the other side of women, emphasising the procreative functioning, pleasure and ecstasy--- a world left totally un-tapped in a normal famillal relationship, to be filled in by women who have nothing to do with this normality; revelling only in pleasure, and thus inextricably linked to all that denies the trappings of being world wise, and guarantors of the perpetuation of life.

Manto has written about prostitutes in our contemporary literature but his emphasis is more on exploitation, the

process which makes respectable women take up this profession due to the lack of any other openings in society for single and resourceless women. And he attempts to be more objective in seeking positive values in these communities of fallen people--- the basic instinct of love and respect is not totally snuffed out in these citadels of sin. The entire question revolves around sociological and economic causes.

The question of sex and the quality of it's drive has very rarely been explored in our literature. Perhaps courtesans do present a good subject due to the absence of normal social and biological linkages in sexual activity. It is merely the erotic impulse working in total isolation, as if in laboratory, but the answers are not abstract inscriptions on a piece of paper but felt in the marrow of the bones.

The ambivalence of an institution as unreal as this attracts creative minds; this aspect of the sexual relationship is the subject of most of Rehman Muznib's work. He treats the institution of courtesans as it has existed without going into an analysis of why it came about. In a way, he is more like Bedi, who has not written exclusively on the prostitutes but has analysed the sexual relationship threadbare without seeking recourse to any external trappings.

In another well known writer Ghulam Abbas, prostitutes are of really fallen women but very much a normal constituent of society. There is nothing horrible or fatal about them for they only fulfil a vital function, which makes them part of the overall necessity of the human condition. This normally has its finest expression in "GARDESHE RANGE CHAMAN" by Quratual Ain Hayder as she traces the

linkages of this institution only to find that it is very much a part of the way life is lived.

With Rehman Muznib the courtesan becomes the most important institution, which move the wheels of society. He is not concerned about weighing her in the scales of good and evil but accepts her role as a living unit. He looks at it as an insider who observe the dynamics of a lifestyle which provides both protection and security to these women, and if looked at from the normal perspective, are a source of all vice. At times though, one gets the feelings that the institution is a barometer to gauge the changing value structures of society.

..................O..................

REHMAN MUZNIB

Dr. Shamim Hanfi

Rehman Muznib was a highly accomplished writer, exceptionally bold and perceptive. His story-telling and narrative capabilities are just unmatched. Urdu fiction, without him would never have been what it is today.

جامعہ دہلی

REHMAN MUZNIB

(A Writer of an Oustanding Merit)

I have known Mr. Rehman Muznib for a long time both as a litterateur and broadcaster. He is an Urdu writer of outstanding merit and his contribution in this field is very commendable. He has also been associated with the Halqa-e-Arbab-e-Zauq, Lahore, for a number of years and has served on the executive of this leading literary organization.

Apart from being a well-known figure in the world of Urdu literature, Mr. Rehman Muznib has also been making valuable contribution in the form of dramas, features, talks, etc., to the programmes of Radio Pakistan Lahore and Rawalpindi.

March 10, 1958

S.A.K. Raz

S.A.K. Raz Muradabadi

بے انت پیار تے احترام نال

اپنے دیرینہ بجن، رحمان مذنب ہوراں دی نذر...... جنہاں دی علمی بلندی تے جنہاں دا شخصی اچیراپن میرے دل وچ اونہاں لئی ہمیشاں عظمت بنی تھاں مخصوص کردا رہیا اے! رب اونہاں نوں لمی حیاتی عطا کرے تاں جے اوہ ادب تے علم نوں شدگارن دا انا اعزاز حاصل کردے رہن!

نمانا فقیر

عارف عبدالمتین

8اکتوبر 91ء

اردو اور پنجابی کے نامور ادیب، شاعر، نثر نگار اور عالم جناب عارف عبدالمتین کی تحسین جو انہوں نے اپنی پنجابی شاعری کا مجموعہ ''اکلاپے دا سفر'' نذر کرتے ہوئے سپرد قلم کی۔

رحمان مُذنِب

جمالِ فن کا قلمکار

طاہر لاہوری

یہ کائنات کی وسعت میں حسن کا دریا　　وفور وجد میں دیتا ہے رات دن یہ صدا
کوئی سحر میری موجوں کی دھڑکنیں سن لے　　کہ ان کے نغموں سے اٹھتی حسینوں کی ہے ندا
جو اپنے طرزِ نگارش میں چاند بھرتا ہے　　یہ چاند جو شب ہستی میں دے رہا ہے ضیا
اسی ضیا سے غمِ زندگی کی شاموں میں　　نگار خانۂ عالم میں جل رہا ہے دِیا
جمالِ فن کی زباں میں وہ بات کرتا ہے　　وہ ایک اونچا قلمکار ہے فسانے کا
مہ و نجوم کے سینوں کی دھڑکنیں سن کر　　ہجومِ حسن فلک کی دکھا رہا ہے ادا
نکھارتا ہے فلک تا فلک فضاؤں کو　　فسانۂ غم دوراں سے کر رہا ہے وفا
قلم کی عزت و عظمت کا پاسبان بھی ہے　　وفور عجز سے دیتا ہے بیکسوں کو صدا
وہ اپنے سانسوں کی خوشبو سے لکھتا رہتا ہے　　اسی لئے ہے فسانوں میں حسنِ گل کی ادا
نئے فسانہ نگاروں کی خیر ہو یارب　　یہ ایک پرانے فسانہ نگار کی ہے دعا

وہ پارسا ہے مگر نام رکھ لیا مذنب
مگر ہے خالقِ رحمان کے کرم کی نوا

والدِ گرامی

مفتی زرّیں بخت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! اپنے والدِ محترم مفتی عزیز الرحمان المعروف رحمان مذنب کی یاد میں تعزیتی مجلس کا اہتمام کرنے اور ان کی ہمہ جہت شخصیت پر مجھ ناچیز کو گفتگو کرنے کا موقع دینے پر میں آپ احباب کا شکر گزار ہوں۔ میرے لیے اس ادبی Elite کے روبرو کچھ کہنا ایک مشکل کام ہے اس لیے میری زبان کی لغزش اور Diction کو درگذر فرمائیے۔

والدِ محترم انتہائی شائستہ، شفیق، مہذب، صاف گو، بلا کے ذہین، حاضر جواب اور مستقل مزاج آدمی تھے۔ ان کے فیصلے اٹل ہوتے۔ اپنے پروگرام کے پابند رہتے۔ بہت کم اس میں تبدیلی کرتے۔ کسی چیز کے بارے میں رائے بہت سوچ سمجھ کر دیتے پھر اسے نہ بدلتے۔ مردم شناس تھے، بغیر لگی لپٹی منہ پر بات کرتے جسے بہت سے لوگ ناپسند بھی کرتے مگر انہیں اس سے غرض نہ ہوتی۔ منافقت پسند نہ کرتے، منافق کے قریب نہ پھٹکتے اور نہ اسے اپنے قریب آنے دیتے خواہ وہ قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو۔

میں نے جب سے شعوری آنکھ کھولی، انہیں مصروف کار پایا۔ ملازمت کے لیے منزلِ سفر مال پر واپڈا ہاؤس ہوتا جہاں وہ انفارمیشن آفیسر اور واپڈا کے ماہنامہ پرچے "برقاب" کی بطور ایڈیٹر نگرانی کرتے تھے۔ ان کا سفر بالعموم پیدل ہوتا، ہاتھ میں ایک چھوٹے Briefcase کے سائز کا چرمی تھیلا رکھتے۔ ماسوائے اتوار یہ ان کا پہلے پہر کا معمول ہوتا، دوسرے پہر اور رات کی مصروفیات مختلف تھیں۔ یہ ساٹھ اور ستر کی دہائی تھی۔

وہ بہت کم گو تھے مگر جب کسی چیز کی وضاحت کرتے تو بالتفصیل اور انتہائی اعتماد سے بولتے۔ انکی باتوں سے علم پھوٹتا۔ انکی بات چیت میں کوئی فالتو بات نہ ہوتی، To the point بات کرتے۔ آپ اسے ریکارڈ کرلیں یا چھاپ لیں، کچھ کاٹنا نہ پڑے گا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھنے یا پڑھنے میں مصروف رہتے۔ ایک دفعہ میرے بڑے ماموں خواجہ نذیر احمد مرحوم لاہور تشریف لائے تو ان کے معمولات اور لکھنے پڑھنے کے اوقات کار دیکھ کر مجھ سے بولے، ''یار کوئی وقت ہوندا اے، جدوں مفتی صاحب نال دو گلاں کرلیئے اے۔'' رحمان مذنب کے پاس واقعی ایسی عیاشی کے لیے کوئی وقت نہ تھا۔ صرف ان کے چند ایسے دوست تھے جن کے ساتھ بیٹھ کر وہ بات چیت کرتے لیکن ان کے دوست بھی تو زیادہ تر علمی اور ادبی حلقوں سے تھے۔

گھر میں ایک تخت پوش تھا۔ لکھنے کا کام اسی پر بیٹھ کر کرتے۔ ایک لکڑی کا تختہ اس کے علاوہ تھا جس پر کمر ٹیکتے البتہ پڑھنے کے لیے کرسی، جس پر فوم کی گدیاں بچھا لیتے یا صوفہ استعمال کرتے۔ چھوٹا سا گھر تھا، الماریاں کتابوں سے بھری پڑی ہوتیں، ذاتی مسودوں کی ایک لوہے کی بڑی الماری، ایک بڑا صندوق اور ایک صندوقچی اس کے علاوہ تھی۔ صندوق اور صندوقچی میں چند نایاب کتابیں بھی ہوتیں جو وہ اپنے مسودوں کے ساتھ رکھتے۔ گھر میں کوئی کونا کھدرا کتابوں سے محروم ہو، ایسا نہ تھا۔ شائد ہی کوئی کتاب کسی کو عاریتاً دیتے۔ کبھی رات آنکھ کھل جاتی تو ان کا کمرہ روشن پاتا۔ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے یا پڑھنے میں منہمک، گویا ان کی ان مصروفیات کا کوئی وقت متعین نہیں تھا مگر بعد از طعام کچھ دیر ضرور قیلولہ فرماتے۔ قلم اور کتاب ان کے رفیق و عزیز تھے، ہر چیز سے زیادہ اور شائد ہم بہن بھائیوں سے بھی زیادہ! والدہ ہمیں بتاتی ہیں کہ پچاس کی دہائی کے آخری سالوں میں وہ راولپنڈی میں انفارمیشن منسٹری میں انفارمیشن آفیسر تھے اور ہم سب سٹیلائٹ ٹاؤن میں رہتے تھے۔ میرے سے چھوٹے بھائی شاہین سکندر جو اس وقت ایک سال کے تھے، کچھ علیل ہوئے تو والدہ نے ڈاکٹر کے پاس جانے کو کہا۔ والدہ بتاتی ہیں کہ آفس سے آتے تو لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو جاتے، کسی تحقیقی کام میں بہ شدت مشغول تھے، ٹال مٹول سے کام لیتے رہے کہ ابھی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں، ٹھیک ہو جائے گا۔ والدہ امرت دھارا جیسی دوائیوں سے ٹونے ٹوٹکے کرتی رہیں۔ جب شاہین کی طبیعت زیادہ خراب ہونے لگی تو بچے کو ہولی فیملی ہاسپٹل

لے جایا گیا، بچے کی حالت دیکھ کر انگریز لیڈی ڈاکٹر نے والدہ کو بچے کو ایسی آخری Stage پر لانے پر سخت سست اور لاپرواہ کہا۔ شاہین کو فوراً گلوکوز کی ڈرپ لگائی گئی مگر میری ماں کا شہزادہ شاہین سکندر جانبر نہ ہو سکا، غم والدِ محترم کو بھی بہت ہوا۔ ساری زندگی جب شاہین سکندر کا ذکر کبھی ہوتا تو ان کے چہرے کا کرب واضح پڑھا جاتا۔ میری ماں کہتی ہیں کہ وہ ہم سب بہن بھائیوں سے زیادہ خوبصورت تھا۔ تو یہ تھی رحمان مذنب کی لکھنے پڑھنے سے وابستگی اور محبوبیت!

ان کا رویہ ہم سب بہن بھائیوں سے بہت مشفقانہ تھا مگر زیادہ پیار انہیں ہماری منجھلی بہن غزالہ پنکی سے تھا۔ ہم بہن بھائیوں کے دورِ طالب علمی میں انہوں نے کبھی بھی پڑھائی نہ کرنے پر سختی نہ برتی البتہ والدہ کی طبیعت اس معاملے میں سخت تھی۔ کبھی کسی بہن بھائی کو کسی مضمون میں وضاحت طلب ہوتی تو تفصیلاً سمجھاتے۔ کوئی موضوعِ حیات ان کی علمی دسترس سے باہر نہ تھا۔ بے دھڑک، بہ تسلسل بولتے۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ فوراً حل کر دیتے۔ جب تک بولتے رہتے کسی کی توجہ نہ بٹ سکتی تاہم ان سے فاصلہ رہتا۔ 90 کی دہائی سے کچھ بے تکلف ہوئے اور تمام بہن بھائیوں سے کھل کر بات چیت کرنے لگ گئے تھے۔ ہم چار بہن بھائیوں میں سے ایک ملک سے باہر، دو لاہور سے باہر اور مفتی شکیل احسن ان کے پاس رہتے۔ شکیل کم گو اور دفتری مصروفیات میں مشغول رہتے۔ جب کبھی ہم سب اکٹھے ہوتے تو محفل جمتی۔ بہن غزالہ ان کے پاؤں دابتی، ان کے کام کاج سنوارتی اور ڈھیروں دعائیں اور پیار سمیٹتی۔ وہ بولتے تو سب ہمہ تن گوش رہتے۔ ایسے میں پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی چاندی ہوتی، آنگن میں خوب غل غپاڑہ ہوتا۔ سادہ اور آسان گفتگو میں بہت سے کام کی باتیں کہہ جاتے۔ سادہ زندگی گزارنے کی ترغیب دیتے۔ ان کی یادیں ہمارا سرمایۂ حیات ہیں اور ہمیں احساس نہیں ہونے دیتیں کہ وہ ہم سے واقعی بچھڑ گئے ہیں، کچھ دیر کے لیے باہر گئے ہوں گے، کسی دوست کی طرف یا حلقۂ اربابِ ذوق، ابھی آتے ہی ہوں گے۔ والدہ تو گھر میں انہیں محسوس کرتی رہتی ہیں۔

انتہائی قناعت پسند تھے۔ دنیادار اور عجلت پسند نہ تھے۔ طبیعت میں بہت ٹھہراؤ تھا۔ منافقت اور جھوٹ سے نفرت تھی۔ بھری محفل میں کوئی بات ناگوار گزرتی برملا رائے دیتے، اثر چہرے پر عیاں ہوتا، حاضرینِ مجلس متنبہ ہو جائے۔ بغیر حاجت بات نہ بڑھاتے لیکن جب کسی

محفل میں بولنا پڑتا تو الفاظ نہ رکتے۔ عالی دماغ تھے، سنجیدہ اور نکتہ ور۔ حق پرست تھے۔ حق کی بات کرتے، اچھے کام کرنے کی تلقین کرتے اور اچھے کاموں کو سراہتے۔

ہمارے دادا مفتی عبدالستار مفتی و قاضی شاہی مسجد تھے۔ عالم بھی تھے اور درویش بھی۔ بقول والدِ محترم اپنے محلے میں خلیفہ جی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ جمعہ کے روز بے شمار سائل آتے، بعد از نماز جمعہ فتویٰ جاری کرتے۔ بادشاہی مسجد کے اندر داخل ہوتے ہی چھت تلے دونوں اطراف دائیں اور بائیں بالکلیاں ہیں۔ یہ ان کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ والد محترم بھی برابر میں بیٹھتے۔ یہ تیس کی دہائی تھی۔ دادا مرحوم فتویٰ لکھتے اور مفتی عزیز الرحمان مہر لگا کر تصدیق کرتے۔ فی فتویٰ 5 روپے وصول ہوتے اور والد صاحب کو اس کے علاوہ 2 روپے ملتے۔ شاہی مسجد سے گھر آنے تک خلیفہ جی کے پاس جو پیسے ہوتے وہ ضرورت مندوں اور فقراء کی نذر ہو جاتے۔ قریب میں حمید مرحوم کی کٹڑی تھی جہاں بہت سے کنبے آباد تھے۔ بقول والد محترم مشہور افسانہ نگار غلام عباس کا قیام بھی اسی کٹڑی میں تھا جہاں وہ اپنی والدہ کے ساتھ رہتے تھے۔ اس کٹڑی میں زیادہ تر غریب لوگ تھے۔ خلیفہ جی اس کٹڑی میں بھی چند گھروں میں روپیہ تقسیم کرنے جاتے۔ گھر کا خرچ چلانے کے لیے رحمان مذنب کی والدہ کے ہاتھ وہ روپے آتے جو رحمان مذنب کے پاس ہوتے۔ شمس العلماء، پروفیسر مفتی محمد عبداللہ ٹونکی صدر شعبہ عربی ادبیات اورینٹل کالج (رحمان مذنب کے نانا)، نسخہ حمیدیہ کے مولف مفتی انوار الحق (رحمان مذنب کے عم زاد) پروفیسر طلحہ، ڈاکٹر سر علامہ اقبال، حکیم احمد شجاع اور چند دوسرے نامور نام جن کے حوالے سے رحمان مذنب کافی باتیں کرتے تھے۔ ان تمام لوگوں کی بیٹھک مفتی عبداللہ اور حکیم شہباز دین کے ہاں رہتی جہاں رحمان مذنب گو کہ بچے تھے بھی بیٹھتے تھے اور بغور سنتے تھے۔

میرٹ کے عادی تھے اور سفارش پسند نہ کرتے تھے۔ ملکی برائیوں میں اسے لعنت گردانتے۔ انہوں نے زندگی کو بہت سنجیدگی سے لیا۔ محنت اور لگن سے کام کرنے کی تلقین کرتے۔ زائد از ضرورت روپے کی خواہش کو سختی سے رد کرتے اور ہمیں بھی یہی کہتے کہ بس اتنا ہی پیسہ ہونا چاہیے کہ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے، زیادہ روپیہ سکون برباد کرتا ہے اور خرابی لاتا ہے حالانکہ زائد روپے سے آپ اچھے کام بھی کر سکتے ہیں؟ قرضہ دینا اور لینا دونوں عمل ان کے

نزدیک ناپسندیدہ تھے۔ہاں! ضرورت مند کی ویسے امداد کرنے کو اچھا خیال کرتے۔

دوستوں کا بہت احترام کرتے۔گھر آئے مہمان کی ہر ممکن تواضع کرتے۔سخت سنجیدہ اور اپنے کام سے گہری وابستگی رکھتے تھے مگر حلقہ یاراں پھر بھی وسیع تھا جس میں تمام مکتبہ فکر کے لوگ شامل تھے۔چھوٹے بڑے،غریب امیر،سب سے ملتے،ہر ایک کی ذہنی سطح کے برابر بات چیت کرتے۔کسی Complex میں نہ رہتے۔عجز وانکساری ان کا شیوہ تھا،درویشانہ طبیعت پائی تھی۔ جوانی میں بہت خوش لباس تھے۔اجلے کپڑے پہنتے۔دوستوں کے کام آکر خوشی محسوس کرتے۔

بچپن اور جوانی میں ان کے پسندیدہ کھیلوں میں کبڈی اور مشاغل میں پتنگ بازی تھی۔ گھر میں ایک پرانا نیم کا درخت تھا۔ایک دن اس سے گرے تو بازو ٹوٹ گیا یوں کبڈی خیر باد ہوئی البتہ پتنگ بازی آخری وقت تک جاری رہتی۔دو ڈور کی چرخیاں،تین پنے اور بے شمار پتنگیں بطور نشانی ہم نے محفوظ کر رکھی ہیں۔پتنگ بازی میں ان کے ساتھ میں اور چھوٹے بھائی مفتی شکیل احسن ہوتے۔پتنگ بازی کے معاملے میں ان کی نظر میں،میں پھسڈی تھا جسے پتنگ اڑانی اور پیچ لڑانا نہ آتا تھا حالانکہ میں اپنے آپ کو خاصہ کاریگر سمجھتا۔

چہل قدمی بلکہ باقاعدہ exercise کے طور پر چلنا ان کا آخر دن تک معمول تھا۔ ان کے آخری دور میں یہ شغل گھر میں،صحن میں اور چھت پر ہوتا۔لکھنے پڑھنے کی ان کی نشست بالعموم طویل ہوتی۔مسلسل بیٹھک کے دوران بارہا اٹھتے۔صحن ہو یا چھت یا کمرہ،کچھ دیر کے لیے چلنا پھرنا لازم تھا۔پانچ سات منٹ خون کی گردش ہوئی اور وہ دوبارہ اپنے کام میں لگ جاتے۔ جب ہم سب بہن بھائی گھر میں کسی موقع پر اکٹھے ہوتے تو بہت خوش ہوتے،کڑاہی گوشت کی فرمائش کرتے،مگر ایسا کبھی کبھی ہوتا۔گو کہ ان کے دوست احباب کا گھر میں آنا رہتا مگر اپنے پیاروں کی بات ہی اور تھی ______ میں مری میں تعینات تھا،چھوٹا بھائی شکیل احسن بسلسلۂ ملازمت زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارتا۔بہن غزالہ بہاولپور اور سب سے چھوٹی بہن جدہ میں تھیں۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں وہ تنہائی تو ضرور محسوس کرتے ہوں گے۔

انتہائی ایماندار تھے۔جب واپڈا سے ریٹائر ہوئے تب واپڈا کے ملازمین کا پنشن کا استحقاق نہ تھا۔پاس تو کچھ تھا نہیں،جو تھوڑی بہت گریجویٹی ملی تو ایک پلاٹ خرید لیا۔ادباء اور

صحافیوں کے لیے LDA کے پلاٹ مختص ہوئے مگر انہوں نے پلاٹ کے لئے apply نہ کیا کیونکہ ان کے نام پر پلاٹ تھا۔ حالانکہ کچھ دوستوں نے کہا کہ پلاٹ بیوی کے نام کردو اور خود لے لو مگر وہ نہ مانے۔ اللہ پر بہت توکل تھا۔

ملکی لائبریریوں میں اچھے موضوعات پر کتابوں کے فقدان کی شکائت کرتے۔ قومی سطح پر قائم ادبی اداروں کے کردار سے بھی خوش نہ تھے۔ ان کے خیال میں ان اداروں کی بھاگ دوڑ deserving اور سنجیدہ افراد کے ہاتھ میں نہ تھی گویا اربابِ اقتدار کے لیے علم و ادب کی پرداخت کے یہ ادارے بھی خویش و اقارب اور خوشامد درآمد کرنے والے بونوں کونوازنے کے لئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ علم وادب کی ترویج کا کام پاکستان بننے کے بعد جس نہج پر ہونا چاہیے وہ نہیں ہورہا اور ہو بھی تو کیسے؟ اس کا ذمہ دار اربابِ بست وکشاد اور self-projected دانشوروں کو گردانتے جن کا مطمع نظر ذاتی مفادات سے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ سخن ور ماسواء اپنی ذات دوسروں کی ٹانگ کھینچتے اور جائز آدمی کو اس کا مقام نہ لینے دیتے۔ رحمان مذنب بنیادی طور پر optimistic تھے، کلی مایوس کبھی نہ ہوئے۔ ملکی و غیر ملکی سیاست پر گہری نظر رکھتے۔ اہم issues پر اخبارات و رسائل میں وقتاً فوقتاً لکھتے رہتے۔ پاکستان بننے کے چند دنوں بعد انہوں نے ''پاکستان کا آئین'' کے عنوان سے ایک وقیع مضمون لکھا جو 23 اگست 1947 کے نوائے وقت میں ایڈیٹوریل والے صفحہ میں نیچے والے آدھے صفحہ اور اگلے مکمل صفحہ پر چھپا۔ یہ تھا ان کا concern پاکستان کے مستقبل سے!

بہت صابر اور حوصلہ مند تھے، کبھی اپنی پریشانی share نہ کرتے تھے۔ والدہ کو پہلی کے پہلی گھر کا خرچ ملتا۔ ایسی ہی ایک پہلی خالی گئی۔ والد محترم گھر آئے تو والدہ نے روپوں کا تقاضا کیا، بولے، ''دفتر میں مصروفیت رہی، بنک نہ جا سکا۔'' اگلے دن والدہ کو روپے دیے۔ پورا ایک سال گزرنے کے بعد والدہ کو انکشاف کیا کہ پچھلے سال اومنی بس میں جیب کٹ گئی تھی، بتایا اس لئے نہیں، مبادا تم فکر مند ہو۔

سیر و تفریح اور نئی نئی جگہ دیکھنے کا شوق تھا مگر لاہور سے عشق کے کیا کہنے۔ لاہور سے باہر قیام سے بہت جلد ان کا دل بھر جاتا، فوراً لوٹتے۔ نوکری کے سلسلہ میں میری جہاں جہاں

تعیناتی رہی تو میری دعوت پر چند دنوں کے لیے آتے۔ جس جگہ بھی وہ میرے مہمان ہوئے، ان علاقوں کے بارے میں انہوں نے مضامین لکھے جو مختلف جریدوں میں چھپے۔ انہوں نے خضدار (بلوچستان)، گلگت، کوہاٹ، تاندہ باندہ اور کئی دوسری جگہوں کے بارے رپوتاژ اور سفر نامے لکھے۔ سفر میں چند کتب اور لکھنے پڑھنے کا سامان پہلی ترجیح ہوتا اور باقی چیزیں بعد میں الگ کرتے۔ کوئی اچھا مضمون یا کتاب ہو، حاشیے ان کے قلم سے نہ بچ پاتے، خوب تجزیہ کرتے، اچھے نکات سراہتے، غلطیوں کی نشاندہی کرتے، کبھی کبھار مضمون نگار کو خط بھی لکھتے۔

بہت سے اہلِ سخن کو شائد یہ پتہ نہ ہو، انہوں نے تیس اور چالیس کی دہائی میں باقاعدہ شعر کہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں اس وقت کے ادبی جرائد نیا دور، ہمایوں، نیرنگ خیال، صحیفہ وغیرہ میں چھپیں۔ عمر کے آخری عشرہ میں انہوں نے چند نعتیں بھی لکھیں جنہیں کبھی کبھی نہایت دلنشیں اور گداز آواز میں گنگناتے اور کبھی بلند آواز سے۔ ایسے میں والدہ محترمہ انگلی کے اشارے سے سب کو چپ رہنے کی تلقین کرتیں۔

مسئلہ دینی ہو یا دنیاوی، علمی یا تاریخی، وہ مشعلِ راہ تھے۔ تجربے میں بہت وسعت و گہرائی تھی۔ جب بولتے، دل چاہتا بولتے چلے جائیں، تھمیں نہیں۔ جامعہ اشرفیہ میں ضرورت مندوں کو فقہی مسائل پر مشورہ دیتے۔ ان کی وفات کے بعد ہر کبھی لوگ گھر میں فون کرتے مگر عزیز الرحمان تو اب تھے نہیں، ان کا یہ پہلو تو گھر والوں سے بھی چھپا ہوا تھا، نہ جانے کیوں؟

1972 کے شروع میں ریٹائر ہوئے لیکن خود کو بے کار نہ جانا، مصروفِ کار رہے، کہتے قید سے آزاد ہوا۔ دورانِ ملازمت بہت سوں کو ان کے دفتر دیکھا۔ احسان کر کے کبھی نہ جتلاتے اور نہ کوئی توقع حاجت روا رکھتے۔ کچھ ضرورت مند ان سے قرضِ حسنہ لیتے۔ باوجود چند دوستوں کی مالی حیثیت اور عادت سے واقفیت رکھنے کہ کبھی لیے روپے نہ لوٹائیں گے، انکار نہ کرتے۔

نوجوان ادباء و شعرا کی ہمت افزائی کرتے، ان کے گھر آنے پر کبھی ماتھے پر شکن نہ لاتے۔ بہت شاکر تھے اور ماسواء خدا کبھی کسی کو سہارہ نہ سمجھتے۔ دنیاداری سے بے نیاز، آخر دم قائم و دائم۔ چہرہ روشن اور صحت اتنی اچھی کہ کبھی شکایت نہ کی۔ کوئی خطرے کی گھنٹی نہ بجی اور ہمیں حیران کر گئے، رہے نام اللہ کا۔ گھر کے اگلے آنگن میں دن کے گیارہ بجے کرسی ڈال کر بیٹھے، میز پر

کتاب سجائے ماہنامہ ''علامت'' کے لیے افسانہ لکھ رہے تھے کہ دو بجکر بیس منٹ پر فرشتۂ اجل نے اچک لیا۔ ہاتھ پر بندھی گھڑی اس وقت پر تھم گئی۔ یہ گھڑی والدہ محترمہ کے پاس ہے۔ نہ یہ خود چلی اور نہ ہم نے بعد میں اسے چلانے کی کوشش کی ہے۔ محترم سعید شیخ مدیر ''علامت'' سے کیا وعدہ ایفانہ کر سکے، زندگی نے کب ان سے وفا کی! کرسی پر بیٹھے بیٹھے آرام سے ایک طرف ڈھلک گئے مگر قلم پر ان کی مخروطی انگلیوں کی مضبوطی قائم رہی۔ میز پر نہ کاغذوں کی ترتیب بکھری اور نہ ہی کوئی چیخ بلند ہوئی، سبحان اللہ!

لاہور میں پیدا ہوئے، یہیں دفن ہوئے۔ 85 سال ایک ماہ اور ایک دن عمر پائی۔ لاہور سے وفا کی، ایک آرزو پوری ہوئی۔

انا للہ وانا علیہ راجعون۔

اللہ جل شانہٗ ان کی مغفرت کرے اور ان پر اپنی برکتیں نازل فرمائے، آمین!

..................o..................

یہ مضمون پاک ٹی ہاؤس میں رحمان مذنب کے تعزیتی ریفرنس 20 فروری 2000ء بروز منگل پڑھا گیا۔

رحمان مذنب

(رحمان مذنب کے عظیم ذہن سے فلم انڈسٹری فائدہ حاصل نہ کر سکی)

چودھری اصغر علی وڑائچ

رحمان مذنب کا ذکر دراصل برصغیر کے ایک بڑے افسانہ نگار، ناول نگار اور واقعہ نگار کا ذکر کرنے کے مترادف ہے۔ ایک دور تو وہ تھا جب افسانے کی دنیا میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور کسی حد تک عصمت چغتائی کو بھی سعادت حسن منٹو کا مدِ مقابل تصور کیا جاتا تھا۔ خود کرشن چندر نے بڑی کوشش کی کہ وہ اس دور میں اپنے ایم اے ہونے کا نفسیاتی تعلیمی رعب ڈال کر منٹو سے اپنی شخصی اور فنی برتری منوا لیتے مگر سعادت حسن منٹو کا دماغ ان عناصر سے قدرت نے مرتب کیا تھا جن عناصر سے میر تقی میر، مرزا اسداللہ خان غالب اور حضرت وارث شاہ کے دماغ مرتب کئے گئے تھے۔ وہ فنِ تحریر و تخلیق کے میدان میں اپنی عظمت منوانے اور اپنے مدمقابل کو پیچھے چھوڑ دینے کے لئے کسی ڈگری کے محتاج نہ تھے، اس لئے کرشن چندر جیسے لوگ بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سعادت حسن منٹو کے توسن فن و شہرت کی گرد میں کھو گئے، پھر وہ دور بھی آیا جب رحمان مذنب کی مرضی کے خلاف محض ان کی افسانہ نگاری سے متاثر ہو کر انہیں سعادت حسن منٹو کا مدمقابل قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ ایک بحث کا آغاز ہوا جو کچھ مدت اسی طرح چلتی رہی جس طرح اس کا آغاز ہو چکا تھا گویا منٹو اپنے افق پر اور رحمان مذنب اپنے افق پر دمکتے رہے۔ ویسے بھی قدرت نے سعادت حسن منٹو کو مختصر زندگی لیکن اپنے ہم عصر کسی بھی دوسرے قلمکار سے زیادہ رفتارِ کار دی۔ وہ رحمان مذنب سے دو تین سال بڑے تھے مگر ان سے **45** سال پہلے **1955**ء میں اس جہان رنگ و بو سے رخصت ہوئے۔ رحمان مذنب **1915**ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے رگ و ریشہ میں خوشبوئے خاکِ لاہور رچی بسی تھی مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے

قلمکار ہوتے ہوئے بھی انہوں نے لاہور کی فلمی صنعت کو اپنی توجہ کا مرکز نہ بنایا۔ وہ تلاش روزگار کے لئے اور ضرورتِ معاش کے تحت دیال سنگھ کالج لاہور اور واٹر اینڈ پاور ڈویلپمنٹ اتھارٹی (واپڈا) میں ملازم تو رہے مگر فلم انڈسٹری کو اپنی کاوشِ قلم کے اظہار کے لئے منتخب نہ کیا۔ چند سال قبل ان کا ایک افسانہ بدر بہادر ڈکیت کے نام سے اردو ڈائجسٹ میں شائع ہوا۔ مجھے اس کے نام نے اپنی طرف کھینچا چنانچہ مطالعہ سے واضح ہوا کہ انہوں نے بدر بہادر ڈکیت کا مکمل ڈھانچہ ایک فلم سکرپٹ کے انداز میں استوار کیا تھا اور ذرا سی محنت سے اسے ایک مکمل فلم سکرپٹ میں ڈھالا جاسکتا تھا۔ پھر اس کے ڈرامائی ٹرن اور کردار نگاری کے تمام تقاضے بڑی سکرین کے لئے نہایت موزوں تھے، اس لئے مجھے حیرت ہوئی کہ اتنا بڑا رائٹر جو ایک مکمل فلم رائٹر بھی ہے فلم انڈسٹری کی نظروں سے کس طرح اوجھل ہے۔ اتفاق سے انہی دنوں ڈاکٹر انور سدید کے توسط سے رحمان مذنب سے ملاقات کا موقع مل گیا، چنانچہ میں نے بدر بہادر ڈکیت کے بارے میں ان سے گفتگو کی اور ان سے اجازت حاصل کر لی کہ اگر فلم کا کوئی پروڈیوسر یا ڈائریکٹر ان کے سکرپٹ کو فلمانے کے لئے تیار ہو جائے تو وہ خود اس کو فلمی کہانی کے ڈھانچے میں ڈھالنے کے لئے تیار ہو جائیں گے یعنی ہدایت کار کی ضروریات کے مطابق جہاں کہیں اس میں واقعات، کرداروں یا مکالموں کی کمی بیشی کی ضرورت ہوگی اس پر غور کریں گے اور بدر بہادر ڈکیت کو جس طرح انہوں نے سپردِ قلم کیا اس کو بہر حال قائم رکھنے پر اصرار نہیں کریں گے۔ وہ بڑی خوشی سے اس بات کے لئے تیار ہو گئے۔ چنانچہ میں نے پاکستان فلم ڈائریکٹرز ایسوسی ایشن کے چیئر مین اسلم ڈار سے بدر بہادر ڈکیت کا تذکرہ کیا کیونکہ ان کو ہمیشہ نئے دماغوں کی جستجو رہتی ہے اور وہ بڑے استحکام سے نئے متعارف ہونے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

جب میں نے اسلم ڈار سے "بدر بہادر ڈکیت" کا ذکر کیا تو اسلم ڈار جو ہر وقت تازہ خیالات کی تلاش میں رہتے ہیں، میری تجویز پر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے فرمایا کہ ہم اتنے بڑے رائٹر کے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی اتنے دور ہیں شاید ہمارے جذبہ جستجو میں کوئی کمی ہے۔ آپ ان سے ملاقات کا انتظام کیجئے۔ وقت طے ہو تو ہم حاضر ہوں۔ چنانچہ ایک شام ہم ان کی رہائش گاہ 18 غزالی سٹریٹ، اتحاد کالونی مجاہد روڈ علامہ اقبال ٹاؤن پہنچ گئے۔ 83 سالہ

رحمان مذنب جواب تک تتلی جان، بالا خانہ، رام پیاری، ارسطو سے بیگم ممتاز امرتسر والی تک اور لارنس سے ماتا ہری تک جیسی کتابیں سپرد قلم کر چکے تھے، ہمیں اپنے دروازے سے ڈرائنگ روم تک لے گئے۔ اس وقت ان کے صاحبزادے کرنل زریں بخت اور شکیل احسن بھی گھر پر موجود تھے مگر وہ اس محفل میں شریک نہ ہوئے۔ اسلم ڈار معمر تخلیق کار سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ کئی ملاقاتیں کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ رحمان مذنب نے ہر بات سے اتفاق کیا اور فرمایا کہ میری نہ تو کوئی تمنا ہے اور نہ ہی کوئی آرزو۔ آپ کو میری کتابوں میں سے جو کچھ پسند آتا ہے لے جائیے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کچھ کتابیں ڈار صاحب کو عطا کیں۔ رحمان مذنب صاحب جب کبھی میرے گھر کے قریب سے گزرتے تھے ضرور ملاقات سے سرفراز فرماتے۔ دراصل وہ ڈاکٹر انور سدید کے گہرے دوست تھے، مگر صورت یہ تھی کہ جب کبھی وہ انور سدید کو ملنے کے لئے نکلتے انہیں میرے گھر کے قریب سے گزر کر ان کے پاس جانا ہوتا، چنانچہ وہ مجھے بھی ہیلو کر لیتے۔ اسلم ڈار نے ان کا سکرپٹ بڑے اطمینان سے مطالعہ کیا مگر کئی وجوہ نے انہیں بدر بہادر ڈکیت کو ابھی تک فلمانے کی اجازت نہیں دی۔ رحمان مذنب کل 16 فروری کو علی الصبح خوش وخرم اٹھے۔ گھر کے سارے کام بھی وہ خود ہی نمٹاتے تھے۔ اس لئے بچوں نے جو کچھ کہا وہ انہوں نے کیا۔ ایک روز پہلے انہوں نے اپنے بیٹے کرنل زرّیں بخت کے ساتھ مری میں ٹیلی فون پر طویل گفتگو کی۔ گزشتہ اتوار پاک ٹی ہاؤس میں حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ ٹھیک ٹھاک نظر آرہے تھے البتہ کچھ روز پہلے انہوں نے اپنے فوجی بیٹے سے یہ ضرور کہا تھا کہ میرے سینے میں کبھی ہلکی سی ٹیس اٹھتی ہے۔ کبھی جلن ہو جاتی ہے۔ انہوں نے پروگرام بنایا تھا کہ وہ اپنے والد کا مکمل میڈیکل چیک اپ کرائیں گے۔ کل انہوں نے اپنے دوسرے بیٹے سے کہا کہ اپنی والدہ کو عزیزہ سے ملا لاؤ۔ اس کے بعد خود مکان کے برآمدے میں میز کرسی سجا کر اپنے روزانہ کے معمول کے مطابق لکھنے پڑھنے بیٹھ گئے۔ اس وقت ان کے ایک پڑوسی عالمِ دین قاری نور محمد کے صاحبزادے اپنے مکان کی چھت پر کھڑے تھے۔ ان کی نظر رحمان مذنب پر بھی پڑ رہی تھی۔ کچھ دیر تو انہوں نے دیکھا کہ معمر قلم کار اپنے کام میں ٹھیک طرح مصروف تھا، پھر اچانک صورتحال بدل گئی اس وقت تقریباً سہ پہر کے ڈھائی بجے تھے۔ نوجوان نے اچانک اپنے آپ سے کہا کہ یہ کیا ہوا، انکل تو ایک طرف

لڑھک گئے ہیں۔ ان کو گھر کے صحن میں یا کسی کمرے کے اندر باہر آتا ہوا کوئی اور فرد بھی نظر نہ آیا۔ چنانچہ وہ تیزی سے زینہ اتر کر رحمان مذنب کے گھر کے دروازے پر آئے جو اندر سے بند تھا۔ انہوں نے باقی لوگوں کو اطلاع دی اور دیوار پھلانگ کر اندر سے گیٹ کھولا۔ اس وقت رحمان مذنب کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی مگر ہاتھ قلم پر تھا۔ بہر حال 18 فروری کو تین بجے اس عظیم قلمکار کو آسودہ لحد کر دیا گیا۔ اس وقت پاکستان کے اہلِ قلم کی بھاری تعداد موجود تھی۔ وقت سب کو کھا جائے گا۔

ایک ہی قانون عالمگیر کے ہیں سب اثر
بوئے گل کا باغ سے گلچیں کا دنیا سے سفر

..........O..........

روزنامہ "پاکستان" لاہور، 18 فروری 2000ء

یادِ رفتگاں

افتخار علی عفی

کسی بھی معاشرے میں طوائف کو دھتکارا ہوا ایک ایسا طبقہ تصور کا جاتا ہے جو مسلسل نفرتوں میں گھرا ہوا ہے، مصر کی آئی اور یونان کی افرودائتی لافانی دیویاں تھیں۔ وہ تو مرمٹ گئیں لیکن ان ہی کے حوالے سے جنم لینے والی ہی طوائف ٹھہری اور آج کئی ہزار برس گزر جانے کے بعد بھی زندہ ہے، ہمیشہ کی طرح جدید دور میں بھی اس طبقے کو افسانوں کا موضوع بنایا اور خوب نام پیدا کیا گیا۔ رحمان مذنب اور سعادت حسن منٹو دونوں نے اس طبقے کے نہ صرف جسمانی بلکہ روحانی اور سماجی موضوعات پر بڑی جرأت اور گہرائی میں جا کر لکھا اور اس حوالے سے اپنا منفرد اور مخصوص مقام اہلِ فن سے منوایا۔ اگرچہ منٹو کو صاحبِ فن اور ''افسانہ ساز'' کا نام دیا جاتا ہے لیکن اس موضوع کے حوالے سے رحمان مذنب کا قلم بعض مقامات پر زیادہ توانا اور بے ساختہ ہو جاتا ہے۔

رحمان مذنب کے افسانوں کے مجموعے ''تیکی جان''، ''رام پیاری'' اور ''بالا خانہ'' بے حد مقبول ہوئے۔

رحمان مذنب نے طوائفوں پر جو افسانے لکھے ان میں ''کوہاں کی جنت''، ''باسی گلی''، ''بلوری بلبل''، ''چڑھتا سورج''، ''لال چوبارہ'' اور ''گشتی'' قابلِ ذکر ہیں۔

انہوں نے اس کے علاوہ دیگر عورتوں پر بھی افسانے لکھے جن میں پھول سائیں، پھرکی، زرینہ اور ہاشم، صحرا کا انتقام، رام پیاری، کباڑیا، توگالہ، کیسری لاچا، قیصراں، پرانا شہر، بدر بہادر ڈکیت، فرنگن، حسینۂ فلک، چلتا کھاتا اور نوکری وغیرہ شرفاء عورتوں کے افسانے ہیں۔

رحمان مذنب نے ''مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے کتاب پر حبیب بنک ادبی ایوارڈ

بھی حاصل کیا۔ ''دینِ ساحری''، ''اسلام اور جادوگری''، ''تہذیب وتمدن اور اسلام''، ''روس میں اسلام کا خطرہ'' پر علمی کتابیں لکھیں۔ انہیں ''وادی سندھ اور اس کا ماحول'' پر ایک تحقیقی مقالہ لکھنے پر پاکستان سائنس فاؤنڈیشن سے ایوارڈ ملا۔ بچوں کے ناول ''لکڑ ہارا اور چور'' کو رائٹرز گلڈ اور ترقی اردو بورڈ کراچی سے ایوارڈ ملا۔ مذنب نے ٹی وی کے لئے ''پتن''، ''ویہڑا'' اور ''تکون'' کے نام سے ڈرامہ سیریل لکھے جبکہ ریڈیو کے لئے تو سینکڑوں ڈرامے لکھے۔ بچوں کی ڈرامہ سیریل الف لیلیٰ کے لئے بھی کئی کہانیاں لکھیں۔ رحمان مذنب نے ''قتل کے چند تاریخی مقدمات'' اور ''لارنس سے ماتا ہری تک'' کتابیں لکھیں، اس کے علاوہ انہوں نے کئی فیچرز اور افسانے بھی لکھے لیکن انکا پسندیدہ موضوع صرف طوائف ہی تھا۔ انہوں نے صدی بھر کی حقیقتوں، گاتے ناچتے، چیختے چلاتے معاشرے کو کاغذ کے روپ میں ڈھال کر اپنی اور آنے والی نسلوں کے لئے سونپ دیا۔

رحمان مذنب **16** فروری **2000**ء کو لاہور میں انتقال کر گئے اور اس وقت بھی وہ ایک افسانہ لکھ رہے تھے۔

رحمان مذنب کے بارے میں مختلف اہل قلم اور دانشوروں کی آراء مختصراً پیش ہیں۔

اشفاق احمد

رحمان مذنب نہایت ہی شفیق انسان تھے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں طوائفوں کے بارے میں جو تفصیل دی ہے وہ سعادت حسن منٹو کے ہاں بھی نہیں ملتی۔

ڈاکٹر وزیر آغا

رحمان مذنب کے افسانوں کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد بھی اردو افسانے نے ارتقاء کی بہت سی منازل طے کی ہیں، اس میں کردار نگاری کے علاوہ جزئیات نگاری کی ایک ایسی روشن مثال پیدا ہوئی جو اردو افسانے کے مستقبل کے لئے ایک نیک فعال ہے۔

ڈاکٹر آغا یمین

رحمان مذنب انتہائی شفیق اور محبت کرنے والے انسان تھے، ایک کمیٹڈ انسان اور ادیب تھے۔

عطاء الحق قاسمی

رحمان مذنب بلاشبہ اردو ادب کے ایک اہم افسانہ نگار تھے، ان کے افسانوں میں کہانی پن ہوتا ہے اور کہانی پن کا یہ عنصر ان کے مضبوط کرداروں میں سے جنم لیتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید

رحمان مذنب ہمارے ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے اظہار فن کے لئے معاشرے کے دھتکارے ہوئے ایک بدنام طبقے کو موضوع خاص کے طور پر منتخب کیا اور پھر اسی موضوع پر تسلسل و تواتر سے افسانے لکھ کر اس موضوع کے منفرد اور انوکھے گوشے ابھارے۔

مقصود الٰہی (افسانہ نگار)

رحمان مذنب کی تحریروں کی شدت کو خون گرم رکھنے کا بہانہ سمجھ کر پڑھتا ہوں، ان کا فن اپنی نوعیت کا حامل ہے اور فن کسی سرکاری تصدیق کا محتاج نہیں ہوتا۔

منظر مفتی

رحمان مذنب تفلسوف آمیز تحریروں کے خالق تھے، ان کی نگارشات میں تحریر اور تجسس کے علاوہ اپنے عہد کی تصویر بھی ہے جس میں دورِ آئندہ کی تحریک کے نقوش مضمر ہیں۔

احمد شجاع پاشا

رحمان مذنب نہ صرف اچھے اور مخلص انسان تھے بلکہ وہ بہت ہی اچھا ادیب بھی تھے، وہ افسانوں اور مضامین کی نوک پلک سنوارے بغیر اشاعت کے لئے نہیں دیتے تھے۔

O

روزنامہ "جنگ" لاہور 19 جنوری 2001ء

علم سے محبت کرنے والا انسان

تنویر ظہور

رحمان مذنب مطالعہ اور علم سے محبت کرنے والے انسان تھے۔ انہوں نے تمام زندگی لفظ پڑھنے اور لکھنے میں گزار دی۔ جب انہوں نے آخری سانس لیا، اس وقت بھی ان کے ہاتھ میں قلم اور سامنے کاغذ تھا۔ تخلیق کرتے ہوئے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ 15 جنوری 1915ء کو لاہور میں پیدا ہوئے اور 16 فروری 2000ء میں وفات پا گئے۔ انہوں نے 85 برس کی بھرپور زندگی بسر کی۔ 60 برس سے زیادہ تصنیف و تالیف میں صرف کئے، بیسیوں کتابیں تصنیف کیں۔ سینکڑوں افسانے، ڈرامے، فیچر اور مقالے لکھے۔ چالیس برس تک مسلسل ریڈیو کے لئے اردو اور پنجابی ڈرامے، فیچر، تقاریر اور دستاویزی پروگرام لکھے۔ ڈراموں اور افسانوں کے علاوہ آپ نے چند علمی کتابیں بھی لکھیں جن میں دینِ ساحری، اسلام اور جادوگری، تہذیب و تمدن اور اسلام اور روس میں اسلام کا خطرہ شامل ہیں۔ وہ عاجزی اور انکساری کا پیکر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ''مذنب'' کو اپنے نام کا حصہ بنایا، یعنی گنہگار۔

قدرت نے انہیں بے پناہ تخلیقی جوہر عطا کر رکھے تھے۔ انہوں نے اس جوہر کو نہ صرف سنبھالا، نکھارا بلکہ پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ مذنب مرحوم نے دن رات ریاضت کی، آدابِ فن سیکھے اور ان پر تبحر پانے کے لئے بے پناہ مطالعہ کیا۔ انہوں نے ملکی اور غیر ملکی ادب کا مطالعہ کیا۔ ان کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تینوں مجموعے بے پناہ مقبول ہوئے۔ ان کے افسانوں میں کردار نگاری، ماحول کی عکاسی، انداز بیاں میں مہارت، انفرادیت اور ندرت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو سوشل انتھروپولوجی کا سنجیدہ طالب علم کہا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ 28 اگست 1951ء کو میں نے بابائے بشریات کی لافانی تالیف ''گولڈن بو'' کا پہلا ورق کھولا اور پھر یہ موضوع میری توجہ

سمیٹتا گیا۔ میرا پہلا ہدف یونانی ادب، یونانی دیو مالا، یونانی روایات و رسومات اور یونانی کلچر تھا۔ اس کے بھرپور مطالعے کے بعد میں نے اپنا تحقیقی مقالہ "یونان کا عہدِ جاہلیت اور دیو مالا کا ارتقاء" لکھا۔ مطالعے سے معلوم ہوا کہ یونان کا استاد تو مصر تھا اور وہیں سے یونان کو دیو مالا ملی۔ چنانچہ مصریات کا مطالعہ کیا، بھارت کی دیو مالا کا مطالعہ بھی اسی دوران کرتا رہا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ میرا موضوع اسلام اور قبلِ اسلام کے ادیان رہا ہے۔ پاکستانی ادب اور مائتھولوجی لازم و ملزوم تو نہیں لیکن ہمارا ادب ان محاوروں اور علامات سے خالی نہیں جو دیو مالا سے لی گئیں۔ پنیدورا کا پٹارا، جس کی لاٹھی اس کی بھینس، نمرود کی خدائی، فرعون کی خدائی، پرومی تھیوس، ایدی پس وغیرہ سب کا ماخذ قدیم دیو مالائی کہانیاں رہی ہیں۔ رحمان مذنب کو اردو کے علاوہ عربی، فارسی اور پنجابی زبانوں سے بھی محبت تھی۔ انہوں نے پنجابی میں بھی افسانے اور ڈرامے لکھے۔ ارسطو کی "بوطیقا" کا پنجابی زبان میں ترجمہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کوئی سیاست دان سیاسی یا مذہبی نظریے کے تحت پنجابی کی مخالفت کرتا ہے تو یہ ظالمانہ رویہ ہے۔ ہمیں انگریزی سے تو محبت ہے لیکن پنجابی سے نفرت ہے۔ اردو اور تمام صوبائی زبانیں ہمارے کلچر کا حصہ ہیں، ان کا فروغ ہماری تہذیبی سوچ کے فروغ کا باعث ہیں۔ ان سے یا ان میں سے کسی سے تعصب برتنا سخت افسوسناک ہے۔

رحمان مذنب تجریدی اور علامتی افسانے کو نہیں مانتے تھے وہ صرف بیانیہ افسانے کے قائل تھے۔ وہ علامت کو شاعری اور افسانے میں استعمال کرتے کہ اس سے حسن پیدا ہوتا ہے۔ علامت اعلیٰ نوع کی فنی جمالیاتی شے ہے۔

رحمان مذنب کو ان کی کئی کتابوں پر انعامات بھی ملے۔ مثلاً "وادی سندھ اور اس کا ماحول" پر پاکستان سائنس فاؤنڈیشن کا انعام، بچوں کے ناولٹ (لکڑہارا اور چور) پر پاکستان رائٹرز گلڈ اور ترقی اردو ادب بورڈ (کراچی) کا انعام "مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے" پر رائٹرز گلڈ ادبی انعام وغیرہ۔

ان کا کہنا تھا کہ ادیب سیم وزر کے انباروں سے برتر اور بالاتر ہوتا ہے۔ میرے نزدیک زندگی کا ہر لمحہ قیمتی ہے، اسے صرف اور صرف عظیم مشن کی تکمیل میں صرف کرنا چاہتا ہوں۔"

O

جنگ 25 فروری 2000ء

ہمیں سُو گئے داستاں کہتے کہتے

عرفان احمد خان

زندہ تحریروں کے خالق کبھی مرا نہیں کرتے۔ رحمان مذنب بھی زندہ تحریروں کی صورت میں بیش بہا سرمایہ اردو ادب کے نام کر دینے کے بعد 16 فروری 2000ء کو ہم سے رخصت ہو گئے۔ موت سے کسی کو مفر نہیں، مگر کچھ لوگ اپنی موت کے حوالے سے بھی قابلِ رشک ٹھہرتے ہیں۔ مرتے وقت رحمان مذنب کے ہاتھ میں قلم تھا اور ایک ادیب کے لئے اس سے زیادہ قابلِ فخر اور قابلِ رشک موت اور کیا ہوگی؟ وہ اپنی زندگی کے حوالے سے کتاب کا مسودہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی زندگی کی کتاب فرشتۂ اجل نے بند کر دی۔

رحمان مذنب نے اس زمانے میں افسانہ لکھنا شروع کیا جو اردو افسانے کا تابناک دور تھا۔ ان کے افسانوں نے اس سنہرے دور میں نہ صرف دھوم مچائی بلکہ ہر معیاری ادبی پرچے میں شائع ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی شناخت بھی بنائی۔ لاہور کی پون صدی کی طوائف کو افسانوں کی شکل میں محفوظ کر دینا رحمان مذنب کا ادبی کارنامہ ہے، جس پر اردو ادب اور ثقافت کے گڑھ، لاہور کو ہمیشہ فخر رہے گا۔ کیونکہ وہ تہذیب یافتہ طوائف کبھی کی مر چکی اور صرف رحمان مذنب کے افسانوں ہی میں سانس لیتی، ناچتی، تھرکتی اور ادائیں دکھلاتی نظر آتی ہے۔ افسانے نے رحمان مذنب کا اور رحمان مذنب نے افسانے کا ساری عمر پیچھا نہ چھوڑا اور اس دوڑ بھاگ میں دونوں بہت آگے نکل گئے۔ رحمان مذنب کے ساتھ مسئلہ صرف ایک ہی ہوا کہ ان کے افسانے کتابی شکل میں بہت تاخیر سے شائع ہوئے، جب افسانے کا دمکتا سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ اس نکتے کو رحمان مذنب بھی تسلیم کرتے تھے۔ اس مسئلے سے قطع نظر ان کی تحریر ہر لحاظ سے اعلیٰ نثری معیار کے ہر پیمانے پر پوری اترتی ہے۔

میری خوش قسمتی ہے کہ وہ میرے گھر سے قریب ہی رہتے تھے۔ قریباً ہر ہفتے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ان سے ملاقات کے لئے کبھی بھی مجھے وقت لینے جیسے تکلف سے گذرنا نہیں پڑا تھا۔ میرے پہلے ناول ''غازہ خور'' کا دیباچہ انہوں نے میرا پورا ناول، مجھ سے سننے کے بعد لکھا تھا۔ اسی دوران انہوں نے ناول میں جملوں کی نشست و برخاست اور تکنیکی خامیاں مجھے نوٹ کروائیں۔ ساتھ ہی ساتھ میرے تابناک ادبی مستقبل کی پیشن گوئی بھی کی۔ شاعر عموماً شاعروں کو دوست رکھتے ہیں اور افسانہ نگار، افسانہ نگاروں سے دوستی نبھاتے ہیں۔ میرے اور رحمان مذنب صاحب کے درمیان ایسی کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ میں محض ادب کا طالب علم تھا اور وہ استادانِ فن میں سے ایک تھے۔ مگر ان کی عظمت یہی تھی کہ ان کی باتوں سے کبھی بھی مجھے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ مجھے چھوٹا یا خود کو بڑا سمجھ رہے ہیں۔ وہ کسی بھی ادیب سے تعصب نہیں رکھتے تھے۔ ادبی محفلوں کے حوالے سے اکثر .... ضرور کرتے تھے۔ میں نے ان سے شعوری اور غیر شعوری طور پر بہت کچھ سیکھا ہے۔

وہ مجھے لاہور کی طوائف کے حوالے سے بہت سی باتیں اکثر سناتے تھے۔ کبھی کبھی یہ بھی کہتے تھے کہ تم ٹیپ ریکارڈ لے آیا کرو۔ ان باتوں کو لکھنے کا وقت تو جانے ملے یا نہ ملے۔ افسوس کہ میں ان کی باتیں ریکارڈ نہ کر سکا۔ شائد مجھے ان کے مرجانے کا یقین ہی نہیں تھا۔

وفات سے پہلے میں نے تین کتابوں کا ذکر بڑے تواتر سے ان کی زبانی سنا۔ ایک تو ان کی زندگی پر مرتب کردہ ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ''تجھے ہم ولی سمجھتے'' تھی۔ دوسری کتاب ''مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے'' تھی جو فیروز سنز نے کسی زمانے میں شائع کی تھی، ایوارڈ یافتہ تھی، مگر بدقسمتی سے OUT OF PRINT تھی۔ اس کے علاوہ وہ رنگین تصاویر سے مزین ایک کتاب: ''اسلام، جادوگری اور یونانی دیومالا'' پر بھی کام کر چکے تھے اور مستقبل قریب میں اس کی اشاعت خود کرنے کا ارادہ بھی رکھتے تھے۔ کیونکہ ماضی میں انہوں نے بچوں کی کہانیوں پر مشتمل جو ''نئی الف لیلیٰ''، لکھی تھی، وہ اسکی تصاویر کے معیار سے مطمئن نہیں تھے۔

افسانے کے بعد ڈراما (خصوصاً یونانی ڈراما) ان کا پسندیدہ موضوع تھا جس پر ان کے پاس بہت سی معیاری اور نایاب کتابیں موجود تھیں۔ یونانی ڈرامے کے موضوع پر تو انہیں اس قدر

عبور حاصل تھا کہ اگر وقت کی قید نہ ہوتی تو وہ کسی داستان گو کی طرح بے تکان چوبیس گھنٹے، ڈرامے کے موضوع پر بولنے کی قدرت رکھتے تھے۔ رحمان مذنب کو اردو افسانے میں، ان کی زندگی میں وہ مقام نہیں مل پایا، جس کے وہ غیر متنازعہ طور پر حق دار تھے۔ ان کا افسانہ ''پتلی جان'' اردو ادب میں اپنی طرز کا واحد افسانہ ہے۔ اس پائے کا افسانہ کوئی اور تو کیا، وہ خود بھی نہیں لکھ سکے لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ ان کا کمزور ترین افسانہ بھی آج کل کے نمایاں افسانوں میں بآسانی اپنی جگہ بنالیتا ہے۔ بلاشبہ رحمان مذنب کا ادبی کام اس لائق ہے کہ حکومت ان کی ادبی خدمات کا اعتراف اعلیٰ ترین سطح پر کرے۔

عرفان احمد خان
31-S-101/E بنک کالونی
سمن آباد، لاہور (پاکستان)
فون: (042)7576894

کچھ یادیں، کچھ باتیں

ظہور حسن (گلوکار)

رحمان مذنب صاحب سے میری پہلی ملاقات ممتاز شاعر جناب عارف عبدالمتین مرحوم کے ہاں ہوئی۔ ان دنوں عارف صاحب کی پنجابی شاعری کی کتاب ''اکلاپے دا مسافر'' شائع ہوئی تھی۔ مجھے اس مجموعے کی ایک غزل ریکارڈ کروانا تھی۔ میں عارف صاحب کے ہاں پہنچا تو رحمان مذنب صاحب اور کچھ دوسرے احباب تشریف فرما تھے۔ عارف صاحب اپنی یہ غزل ریکارڈ کروانا چاہتے تھے:

سب توں اُچے پربت اُتے بھانویں اپنا محل بنا
پر ، ایہہ سوچ سمجھ لئیں پہلوں، پتھر کیہڑا ڈھوئے گا

عارف صاحب ایک استاد شاعر تھے اور بے حد شفیق طبیعت کے مالک تھے۔ چنانچہ ہم بلا جھجک ان سے اختلاف کر لیتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ گائیکی کے لحاظ سے یہ غزل اتنی موزوں نہیں کیونکہ اس میں کھلی زمین نہیں مل رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کی بجائے کوئی دوسری غزل منتخب کی جائے۔ میں نے کتاب کی ورق گردانی کی اور مجھے یہ غزل اچھی لگی:

تیری اگ وچ بل کے مینوں چین نہ ملیا اک وی پل
فیر میں کیہڑے دل نال آکھاں توں وی میری اگ وچ بل

عارف صاحب پہلے والی غزل کے حق میں تھے چنانچہ میں نے رحمان مذنب صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس بارے میں فیصلہ کریں۔ مذنب صاحب نے دونوں غزلیں پڑھیں اور پھر مسکراتے ہوئے میری منتخب کردہ غزل کے بارے میں رائے دی اور میری تائید کی جسے عارف صاحب نے بلا تامل قبول کر لیا۔

رحمان مذنب صاحب نے اپنے دور جوانی میں کلاسیکی موسیقی کے نامور گلوکاروں جن

میں استاد بڑے غلام علی خان، برکت علی خان اور مبارک علی خان شامل ہیں کو روبرو سنا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی یادیں دہراتے تھے تو میں بہت توجہ سے سنتا تھا۔ شاعروں اور نقادوں میں شائد ہی کسی کو موسیقی کی اتنی سوجھ بوجھ ہو۔ میں جو بات یہاں پر کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ رحمان مذنب صاحب کو موسیقی کے اسرار و رموز پر بھی بہت دسترس تھی اور اکثر کلاسیکل موسیقی پر اپنی رائے دیتے تھے۔

اس ملاقات سے مذنب صاحب کے ساتھ تعلق اور نیاز مندی کا رشتہ قائم ہوا جو ہمیشہ برقرار رہا۔ مذنب صاحب افسانہ نگاری میں ایک معتبر مقام رکھتے تھے مگر وہ غزل گوئی اور گیت نگاری میں بھی کسی سے کم نہیں تھے۔ ان کی بہت سی غزلیں خاص و عام میں مقبول ہوئی۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک بار باری سٹوڈیو کے ممتاز ریکارڈسٹ اور فلمساز چوہدری محمد اسلم نے ایک فلم ''انسان'' کے نسبت ایک منفرد فلم بنانے کا ارادہ کیا۔ یاد رہے کہ فلم ''انسان'' کی موسیقی ملک کے 9 نامور موسیقاروں نے مرتب کی تھی چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ مذنب صاحب کو زحمت دی جائے مگر مذنب صاحب آمادہ نہیں ہو رہے تھے، حالانکہ کسی کہانی نویس یا افسانہ نگار کو فلم کی کہانی لکھنے کی دعوت دی جائے تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ مذنب صاحب کو بڑی مشکل سے قائل کیا گیا۔ ہم انہیں لے کر سٹوڈیو پہنچے۔ چوہدری صاحب کو کہانی دکھائی گئی۔ اس کہانی کا عنوان ''پنجرے کے پنچھی'' تھا۔ چوہدری صاحب بولے کہ یہ کہانی چھوڑ جائیں ہم کچھ روز اس کا مطالعہ کریں گے، اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں گے۔ مذنب صاحب نے کہانی اٹھا کر بیگ میں رکھی اور اجازت چاہی۔ وہ کہنے لگے کہ کہانی مختصراً سنا تو سکتا ہوں، یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ چوہدری صاحب نے بہت اصرار کیا مگر مذنب صاحب نہ مانے۔ باہر آ کر کہنے لگے کہ اگر میں کہانی چھوڑ جاتا تو یہ اسے توڑ مروڑ کر تباہ کر دیتے اور میں اپنی کہانی سے محبت کرتا ہوں۔ اس لیے ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ میری کسی کہانی کا حلیہ بگاڑ دیا جائے۔

مذنب صاحب سادہ اور کھری طبیعت کے مالک تھے اور ایسے لوگ اب کہیں نظر نہیں آتے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

..............O..............

حرف آغاز

شازیہ الیاس صمدانی

کسی بھی شخصیت کی تلاش میں ماضی کا سفر کرنا ان قدیم داستانوں کی یاد دلاتا ہے جس میں شہزادے پاتال میں اتر کر سیاہ، سفید یا نیلا گلاب لاتے یا کسی دیو کی قید سے کسی خوبصورت شہزادی کو آزاد کراتے یا پھر اپنی مسمریزم شخصیت سے صدیوں کی مقفل اور منجمد اشیاء کو چھو کر طلسم توڑتے ۔میرے خیال میں شخصیت وفن کی تلاش بھی ایسا ہی طلسم ہے جس کو چھو لینے سے تمام حقیقت حال کھل جاتی ہے ۔ یہ ایک ایسا سفر ہے جس کے راستے میں کبھی خشکی، کبھی تری، کبھی پہاڑ اور کبھی میدان آجاتے ہیں۔ شخص کے بے شمار روپ اور سطحیں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ان میں رنگارنگی، دلکشی اور مناسبت ہوتی ہے اور بعض اوقات زبردست تضادات لیکن یہ تضادات کانٹوں میں گلاب کے پھول کی طرح حسین ہوتے ہیں۔

کسی ادبی شخصیت کا کھوج لگانا خصوصاً ایسی شخصیت جس کو دنیا ایک رخ سے پہچانتی ہو، بہت مشکل، پر اسرار، انوکھا اور دلچسپ تجربہ ہے۔ ''رحمان مذنب کی شخصیت وفن'' جو کہ میرے ایم۔اے اردو کے تحقیقی مقالہ کا موضوع ہے، ایسی ہی صورتحال سے دوچار ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس موضوع کے انتخاب میں میرے اساتذہ کرام نے بھرپور طریقے سے میری حوصلہ شکنی کی۔ مجھے اپنے تئیں زمانے کے نشیب و فراز سمجھا کر اس موضوع پر کام کرنے سے باز رہنے کی تلقین کی اور ثبوت کے طور پر ڈاکٹر وزیر آغا کا لکھا ہوا ''تتلی جان'' کا دیباچہ دکھایا۔ جس کا اقتباس یہ ہے۔

> ''اردو کے جدید افسانوی ادب میں جنسی بے راہ روی کو افسانے کا موضوع بنانے کے ضمن میں دو افسانہ نگاروں نے نام پیدا کیا ہے۔ سعادت حسن منٹو اور رحمان مذنب۔ منٹو کا نام اس میدان میں کچھ زیادہ نمایاں ہے اور رحمان مذنب پس پردہ رہے ہیں۔ اس لئے وہ منٹو کی

طرح مقبول نہیں ہوئے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس میدان میں
رحمان مذنب سعادت حسن منٹو سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں بلکہ کئی پہلو تو
ایسے ہیں جن کی عکاسی میں رحمان مذنب کے فن میں نسبتاً زیادہ توانائی،
وسعت اور گہرائی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔''

القصہ مختصر رحمان مذنب نے جنس اور طوائف کے موضوع پر لکھا اور بے باک لکھا لیکن میرا موقف یہ ہے کہ اگر رحمان مذنب نے اتنا ہی بے حجاب لکھا ہے تو حکومت اس کی کتابیں بین کیوں نہیں کر دیتی یا اس موضوع کو ادب سے خارج کیوں نہیں کر دیتی؟ ہر وہ شخص جو تھوڑا بہت پڑھنے پڑھانے سے دلچسپی رکھتا ہے وہ منٹو کو یا رحمان مذنب کو چوری چھپے یا سر عام ضرور پڑھتا ہے۔ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ ہم ایسے پروگرامز، فلمیں، اشتہارات اور مضامین کیوں لکھتے ہیں اور ان کی اشاعت کیوں کرتے ہیں؟ یقیناً ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی عوامل ضرور کارفرما ہیں۔

میرا دعویٰ ہے کہ میرے اس تحقیقی مقالہ میں سب سے پہلے اس موضوع کو پڑھا جائے گا کیونکہ یہ موضوع ایک مقناطیسی کشش رکھتا ہے اور یہ باہمی کشش کی وہ قوت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے ہر شے کا جوڑا جوڑا بنایا ہے (یعنی ایک فرد اپنے جوڑے کو اس کشش سے اپنا قرب بخشتا ہے اور اگر وہ اسے نہ ملے تو وہ اس کیلئے بے چین رہتا ہے۔ اس ضمن میں اماں حوا اور بابا آدم کی تخلیق اور لغزش کو کون بھول سکتا ہے)۔

دنیا کا ہر ادب خواہ وہ کسی بھی زبان میں ہو، شعری ہو یا نثری اس میں جنس کا موضوع نیوکلس کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اس کا تذکرہ ان کتابوں میں بھی ملے گا جو اس کے لئے مختص نہیں ہیں۔ پھر بھلا اس میں رحمان مذنب کا کیا قصور؟ رحمان مذنب نے تو انہی حالات کو اپنے قلم کی نذر کیا ہے جو اسے پیش آئے۔ میرا خیال ہے کہ سچا ادیب وہی ہے جو دیکھے، اسے بلا کم و کاست بیان کرے۔ اگر کوئی ادیب شیشے کا پیش منظر چھوڑ کر اس کا پس منظر لکھے تو کیونکر لکھے؟ کیسے لکھے؟ کہاں تک لکھے؟ وہ سیاہ کوے کو سفید کوا تک کہتا رہے؟ یقیناً وہ کچھ عرصہ خود کو دھوکا دے کر اپنی اصلیت کی طرف لوٹ آئے گا۔ پھر بھلا اس میں رحمان مذنب کو کیوں تختۂ مشق بنایا جاتا ہے۔ کیا اس کو اس بات کی سزا دی جاتی ہے کہ اس نے خوش قسمتی سے یا بد قسمتی سے ٹبی اور ہیرا منڈی کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ اگر یہ بات ہے تو سب سے پہلے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو سزا سنائی جائے جس نے ٹبی کی خانقاہ کو جنم دیا یا پھر ان پروہتوں کو سولی چڑھایا جائے

جنہوں نے معبدوں کی پاکیزہ فضاء میں جنس پرستی کا زہر گھولا کہ ـــــ

گونگا نہ مرے گونگے دی ماں مرے

جیہڑی ہور نہ جم دھرے

یہ بات کتنی حیران کن ہے کہ وہ شرفاء جن کے نزدیک رنڈی ایک گالی ہے، ان کے محلوں، گھروں، بازاروں اور دلوں میں یہی رنڈی کبھی نکیائی، کبھی نوچی، کبھی بیسوا، کبھی ڈیرہ دارنی، کبھی رقاصہ، کبھی مغنیہ اور کبھی ایکٹریس کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے اور کہاں کہاں رسائی پاتی ہے۔ ذرا ہوٹلوں اور قحبہ خانوں کی ہی گنتی کیجئے؟

مجھے طوائفوں کے پیشے سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اگر ہے تو ان حالات سے ہے جو انہیں اس گندے جوہڑ میں لا پھینکتے ہیں یا پھر ان شرفاء سے جو اپنے کالے منہ کی کالک دوسروں کے سفید منہ پر مل دیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بھی میرے اس نقطۂ نظر سے اتفاق کریں گے۔

میں نے رحمان مذنب کی تحریروں میں اس موضوع کی مسلمہ حقیقت کو ایک کامیاب فن کے روپ میں دیکھا ہے۔ میں نے جنسیات کے موضوع، اس کے معنوی مفہوم سے کچھ دیر کے لئے الگ کر کے زندگی کی ایک تلخ حقیقت اور اردو ادب میں اس کی موجودگی اور آغاز کے حوالے سے دیکھا ہے، اس لئے میری درخواست ہے کہ آپ بھی اس تصور کو ملحوظ خاطر رکھیں۔ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ محض شہادتیں ہی نہیں ہیں بلکہ وہ تمام بے بس حقیقتیں ہیں جو آپ اور میں اپنے اردگرد کے ماحول میں دیکھتے ہیں۔ جنسیات کی بے راہ روی بذاتِ خود ایسا موضوع ہے جو فکر، تدبر اور دور اندیشی کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہر شخص اس مسئلہ کو سمجھتا ہے، اس کو دیکھتا اور سنتا ہے لیکن اس سے نظریں چراتا ہے مگر میرا قصور یہ ہے کہ میں نے اس موضوع کو اپنی فکر کا مرکز بنایا ہے اور زمانے کی اس فرعونیت میں عصائے موسیٰ کی تلاش میں نکلی ہوں۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ رحمان مذنب اگر اس موضوع پر نہ لکھتے تو ان کی ڈرامہ نگاری، مضمون نگاری، حسنِ ساحری اور دیومالائی معلومات اور تراجم ہی انہیں مقبول کرنے کے لئے کافی تھے۔

o

خوشبودار عورتوں کا افسانہ نگار

انور سدید

رحمان مُذنب ہمارے ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے اظہارِ فن کے لئے معاشرے کے دھتکارے ہوئے ایک بدنام طبقے کو موضوعِ خاص کے طور پر منتخب کیا اور پھر اس موضوع پر تسلسل و تواتر سے افسانے لکھ کر اس موضوع کے منفرد اور انوکھے گوشے ابھارتے چلے گئے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ اس موضوع پر متعدد کامیاب افسانے لکھنے کے باوجود رحمان مُذنب کے ہاں تا حال نہ تنوع میں کمی آئی ہے اور نہ ان کے اظہار کی تازگی مرجھائی ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ رحمان مُذنب کا افسانہ اتنا معطر ہوتا ہے کہ اس پھول کو ایک دفعہ سونگھنے کے بعد بار بار سونگھنے اور اس کی خوشبو کو دل میں بسا لینے کو جی کرآتا ہے۔

رحمان مُذنب کے افسانوں کا موضوع طوائف ہے۔ بلاشبہ طوائف معاشرے کی بدنام مخلوق ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس مخلوق کی حسن فروشی، غمزہ تراشی اور کرشمہ نگاری نے تہذیبِ انسانی میں واقعات و کیفیات کا ہمیشہ ایک نیا منظر نامہ مرتب کیا اور عورت جس کا نام کمزوری ہے۔ اسے ایک فعال قوت کے طور پر پیش کیا، چنانچہ بعض اوقات تو یہ بات بھی باور کرنا پڑتی ہے کہ طوائف معاشرے کے ایک مضبوط اور اثر انداز ہونے والے طبقے کی نمائندہ ہے اور معاشرے کے دوسرے بہت سے کردار جو بظاہر فعال اور متحرک ہیں اس کے سامنے منفعل، سرنگوں اور بے دست و پا نظر آتے ہیں۔ لڈوگ بورن نے لکھا تھا کہ ــــــــ

"اس پر شکوہ نیلے آسمان کے نیچے عورت کا دل ایتھنز کی منڈی ہے۔"

اور وہ عورت جو ایتھنز کی منڈی کے جُور و مَد کو اپنی گرفت میں رکھتی تھی، طوائف تھی۔

یہ حقیقت اب کسی مزید ثبوت کی محتاج نہیں کہ دنیا کے قدیم معاشروں میں طوائف ایک ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ گردشِ ایام نے اس کی ہیئتِ ترکیبی یا معمولاتِ ترغیبی میں خفیف اور سطحی تبدیلیاں تو پیدا کی ہیں لیکن زمانہ اس کی بنیادوں کو اکھاڑ نہیں سکا۔ مولانا صلاح الدین احمد نے درست لکھا ہے کہ ــــــ

''اگر ہم تناسُخ کے قائل ہوں تو یہ کہنا کچھ ایسا مبالغہ آمیز نہیں ہوگا کہ بابل کی زُہرہ، یونان کی سپاشیا، دکن کی بھاگ متی، مالوے کی رُوپا، حیدر آباد کی صاحب، آگرے کی مُشتری، لکھنؤ کی اُمراؤ جان ادا، دہلی کی لال کنور، پنجاب کی موراں اور کلکتے کی حجاب درحقیقت ایک ہی روح کے مختلف مظاہر تھے۔ وہی شمعِ محفل اور ــــــ وہی پروانہ سوزاں ــــــ ایک داستانِ لازوال ہے جس کے سننے اور سنانے والے بدلتے رہتے ہیں، جس کی زبان اور لہجے میں فرق آتا رہتا ہے لیکن جس کی روح برقرار اور جسم کا اُتار چڑھاؤ ہم شکل رہتا ہے۔''

طوائف کا یہ افسانہ جہاں سوز تہذیبِ انسانی کے ہر دور میں دہرایا جاتا رہا ہے، حکمائے قدیم نے اس کارشتہ آدم کے پہلے گناہ کے ساتھ باندھا اور انسانی بے راہروی کے لئے یہ حسین جواز فراہم کرلیا کہ آدم کی پسلی سے پیدا ہونے والی کائنات کی پہلی عورت ــــــ حوا اپنے ساتھ رنجش کا سامان لے کر آئی تھی اور یہ ایسے سامان سے مرصّع تھی جو ہوش وخرد سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ افلاطون نے عورت اور مرد کو ایک ہی دائرے کے جزو قرار دیا اور لکھا کہ یہ دونوں اپنی تکمیل کے لئے ایک دوسرے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر جہاں معاشرہ وجود کی متذکرہ تکمیل کے لئے باضابطہ وسائل فراہم کرنے سے قاصر رہتا ہے وہاں بے ضابطگی اپنی تکمیل کے وسائل خود فراہم کرلیتی ہے، چنانچہ افرودائتی کے جمال پسند مقلدوں نے طوائف کو جمہوریت کے ایک اتفاقی عنصر کے طور پر قبول کیا اور اس کا تحفظ شوق کی فراوانی اور محبت کے وفور سے کیا۔ دیو مالا میں پینڈورا کا کردار کسی حد تک حوا کے مماثل ہے۔ پرومی تھیوس اس کے دام تزویر میں نہیں پھنستا لیکن اس کا بھائی اپی می تھیوس اسے اپنی روح کا جوہر سمجھ کر قبول کرلیتا ہے۔ پینڈورا بیک وقت ایک اعلیٰ قدر بھی ہے اور ترغیبِ گناہ کا وسیلہ بھی ــــــ عورت کے یہ دونوں روپ ازلی اور ابدی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ گوئٹے نے پینڈورا کو حوا سے بھی برتر مقام دیا ہے،

جس کے گناہ کا کفارہ کنواری مریم نے ماں بن کر دیا تھااور یوں عورت اور طوائف کے درمیان ماں کی صورت میں ایک نئی اور مقدس حیثیت کو جگہ دے دی۔ بادی النظر میں یہ تینوں روپ ایک ہی شخصیت میں پوشیدہ ہیں تاہم عورت کی ان تین حیثیتوں کے درمیان جہاں بھی تصادم عمل میں آتا ہے فطرت ایک نئی کہانی کو جنم دے ڈالتی ہے۔اس ضمن میں ممتاز شیریں نے طوائفیت کو نفسانی اور مادرانہ عناصر کے تناسب سے ممیّز کرنے کی کاوش کی ہے اور لکھا ہے ـــــ

''حد سے بڑھی ہوئی نفسانیت عورت کو طوائفیت کی طرف لے جاتی ہے ورنہ وہ ماں ہی ہوتی ہے۔''[1]

ان زاویوں کو پیشِ نظر رکھئے تو احساس ہوتا ہے کہ تمدنِ عالم کے ہر عہد میں داستان نگاروں اور افسانہ نویسوں نے اس محبوب و مرغوب موضوع کے بوقلموں زاویوں کو ابھارنے میں کمالِ فن کا ثبوت دیا ہے۔کہیں طوائف کو انسانی تہذیب کا بدترین داغ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی اور گناہ کا نشان اس کے ماتھے پر ثبت کر کے اسے چوراہے پر یوں کھڑا کر دیا گیا کہ تمام انگلیاں اس نشان کی طرف ہی اٹھنے لگیں۔کہیں معاشرے کی صحت و طہارت کو برقرار رکھنے اور جذباتی تموج کے توازن یا گندگی کے مناسب اخراج کے لئے طوائف کو معاشرے کا ایک ضروری حصہ قرار دیا گیا اور اس کے وجود کے قیام و بقاء کے لئے طوائف کو معاشرے کا ایک ضروری حصہ قرار دیا گیا اور اس کے وجود کے قیام و بقاء کے لئے جواز فراہم کیا گیا۔کورٹیزن کا ادارہ معاشرے کی اس ضرورت کا ہی زائیدہ ہے اور طوائف امراؤ جان ادا بن کر معاشرے کے تہذیبی نظم اور تمدنی توازن کو برقرار رکھنے میں معاونت کرتی ہے۔

طوائف کو ایک ایسی مظلوم ہستی بھی شمار کیا گیا ہے جو مرد کی بالادستی کا شکار ہے۔ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے تن فروشی کرتی ہے۔دلالوں اور نائیکاؤں کے ظلم و تشدد کو بادلِ نخواستہ قبول کرنے پر مجبور ہے اور ہوس پرست مرد کی نفسانی خواہشات کی آسودگی کے لئے نسوانیت کی متاعِ عزیز قربان کر دیتی ہے۔طوائف کا یہ روپ ایک مجبور، مفلس اور محتاج عورت کا روپ ہے۔

---

[1] ممتاز شیریں، ''کفارۂ گناہ'' سالنامہ ''ادبِ لطیف''، لاہور ۱۹۶۳

سائمن ڈی بوائر نے معاشی زبوں حالی کو اس قسم کی طوائف کو پروان چڑھانے کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ [1] ہیولاک ایلس نے نفسیاتی وجوہات کے برعکس شدید غربت کو بھی طوائفیت کے فروغ کی اہم وجوہ میں شمار کیا ہے۔

عالمی ادب کی طرح اردو کہانی میں بھی طوائف کو ایک زرخیز موضوع کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ مختلف ادیبوں نے طوائف کے مختلف روپ دکھانے اور اس کے پیشہ ورانہ اوصاف کو اس کے کردار سے یا کردار کو کاروباری ہتھکنڈوں سے اجاگر کرنے کی عمدہ اور فنکارانہ سعی کی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''فسانہ مبتلا'' میں ہریالی ایک ایسی طوائف ہے جو اپنی لیاقت، جامہ زیبی اور خوش صورتی سے حسن پرست مبتلا کو لبھانے کا سلیقہ جانتی ہے۔ ہریالی مبتلا کی بیوی کا نعم البدل نہیں لیکن وہ بیوی کی سرد مہری اور بے مروّتی کے بالمقابل ایک ایسی خانگی ہے جس نے آدابِ معاشرت کی باقاعدہ تربیت حاصل کی ہے اور جو مرد کے دل کو ٹٹول کر اس کی فطرت اور مذاق کے عین مطابق مسخّر کر سکتی تھی کچھ اس قسم کے اوصاف پریم چند کے ناول ''بازارِ حسن'' کی سمن میں بھی موجود ہیں۔ مذاق، بذلہ، ضلع جگت، حاضر جوابی، کہہ مکرنی، پہیلی اور فقرہ بازی میں لاجواب، غمزۂ عشوہ و ادا میں عجوزہ فن سمن سماج کا زہر تھی لیکن مجلسی زندگی میں عزّ و وقار کا ایک مقام خود اس نے متعین کر رکھا تھا اور شرفاء خود اپنے پاؤں چل کر اس کے آستانے کی دہلیز پر سجدۂ نیاز ادا کرتے تھے۔ اس قسم کی طوائف کا ایک اور زندہ روپ قاری سرفراز حسین نے ''شاہد رعنا'' میں ننھی کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ننھی ایک زوال آمادہ، تعیش پسند معاشرے کی مثالی طوائف ہے، وہ مرد کی آنکھوں پر پٹی باندھنے، حسن و زیبائی سے مسحور کرنے، بھری ہوئی جیب کو شائستگی سے ٹٹولنے اور خالی ہاتھ کو درشتی سے جھاڑنے کا فن جانتی تھی، وہ دخترِ نشاط تھی اور لعبت بازار کے منصب سے اوپر نہیں اٹھی لیکن وہ معاشرے کے لئے پہیلی نہیں بنی۔ اس کے چاہنے والے کھلے دروازے سے آتے اور اپنا سب کچھ لٹا کر رخصت ہو جاتے۔

---

[1] THE SECOND SEX

مرزا ہادی حسن رسوا کی اُمراؤ جان ادا کی رگوں میں اگر چہ شریف خون دوڑ رہا تھا لیکن جب وہ طوائف کی حشر سامانیوں سے واقف ہوگئی تو اس نے روغنِ حیات معاشرے کے ان کرداروں سے حاصل کیا جو اسے طوائف بنانے کے ذمہ دار تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امراؤ جان ادا خاندانی طوائف نہیں تھی۔ اس کے سب حربے اکتسابی تھے اور جونہی وہ تنہا ہوتی اس کی جذباتی شدت عود کر آتی اور وہ بھولے عاشقوں اور جذباتی نوچیوں سے بھی اظہار ہمدردی کرنے لگتی۔ قاضی عبدالغفار کی ''لیلیٰ'' اور ''تین پیسے کی چھوکری'' میں وہی فرق ہے جو ''فن برائے فن'' اور فن برائے زندگی'' کا فرق ہے۔ لیلیٰ میں مثالی کورٹیزن بننے کی صلاحیت ہے۔ وہ زندگی کے فلسفے کو ایک دانشور کی طرح سمجھتی ہے اور اس کا تجزیہ دلائل و براہین سے کر سکتی ہے اس کے برعکس'' تین پیسے کی چھوکری'' از سرتا پا بیسوا ہے جو حسن فروشی کرتی ہے اور غمزہ وادا کی منہ مانگی قیمت وصول کرتی ہے۔ ایم اسلم کی ناظمہ کی عشوہ طرازیاں بھی محشرِ بداماں تھیں اور وہ دلنوازی کے فن میں بھی طاق تھی لیکن ناظمہ ہوس کی نشاط انگیزیوں میں شامل ہونے کے بجائے ان پر تاسّف کا جذبہ زیادہ ابھارتی ہے اور طوائف سے کہیں زیادہ ایک تعلیم یافتہ پروفیشنل عورت نظر آتی ہے۔ فرخندہ لودھی کے ناول ''حسرتِ عرض تمنا'' کی ہیروئن ''سپنا'' عورت سے طوائف بنا دیئے جانے کا ایک مثالی کردار ہے لیکن وہ حوا نہیں جس نے آدم کو بنیادی گناہ کی ترغیب دی تھی، وہ پنیدورا بھی نہیں ہے کہ پرومی تھیوس کے لئے دامِ فریب بچھائے چنانچہ اس کی پازیب سے وہ نغمہ پیدا نہیں ہو پاتا جو مرد کو اپنا اسیر کر لے۔ مرزا رسوا (امراؤ جان ادا) قاضی عبدالغفار (لیلیٰ) اور ایم اسلم (ناظمہ) کے کردار زمانے کے ساتھ سمجھوتہ اور حالات کے ساتھ مفاہمت کر لیتے ہیں لیکن فرخندہ لودھی کا کردار سپنا ان سب کا اینٹی تھیس ہے اور یہ گردشِ وقت میں پس کر اپنی معصومیت کا کفارہ خود ہی ادا کر دیتی ہے۔

طوائف کا موضوع اردو افسانے کے لئے بھی کبھی اجنبی شمار نہیں ہوا۔ ہمارے چند بڑے افسانہ نگاروں میں سے سعادت حسن منٹو، غلام عباس اور رحمان مذنب کے ہاں تو طوائف کو ایک پسندیدہ موضوع کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ کرشن چندر، احمد علی، حسن عسکری اور آغا بابر کے ہاں یہ موضوع خاص خاص مواقع پر سر ابھارتا ہے اور ایک جیتی جاگتی کہانی کو یا زندگی کی ایک مجسم قاش کو جنم دے ڈالتا ہے۔ یہ انفرادیت صرف منٹو کو حاصل ہے کہ اس نے طوائف کی زندگی کے

بعض گھناؤنے پہلوؤں کو حقیقت نگاری سے پیش کیا۔ اس راندۂ درگاہ مخلوق کی نفسیات کو سمجھنے کی کاوش بھی کی اور اس کی کامیاب عکاسی سے انسان کے بنیادی گناہ کی توضیح کی اور یوں عورت کے باطن میں پلنے والی آرزوؤں کو سطح پر ابھار دیا۔ ممتاز شیریں نے لکھا ہے کہ ـــــــ

''منٹو نے نچلے درجے کی عام طوائف کی زندگی اور نفسیات کو ہر پہلو سے جانچا ہے۔ منٹو کی اس پیشکش میں نہ تحقیر اور مذمت کا جذبہ کارفرما ہے نہ سستی جذباتیت اور رقت ہے۔'' [1]

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ منٹو نے طوائف کو ایک مظلوم عورت دکھا کر بیشتر اس سے ہمدردی کے جذبات ابھارے ہیں۔ منٹو کے افسانوں میں طوائف کا ہرجائی روپ جو اس کا اصل روپ ہے،، بہت کم سامنے آتا ہے، اس کے برعکس جو طوائف بار بار اپنی چھب دکھاتی اور متاثر کرتی ہے۔ اس میں مکمل ماں اور ایک خدمت گزار بیوی کے اوصاف زیادہ ہیں۔ وہ زمانے کی ستائی ہوئی اور حالات کی ستم رسیدہ ہے اور اس نے زندہ رہنے کے لئے معاشرے کے ساتھ مفاہمتی رویہ کسی نہ کسی طرح قبول کر رکھا ہے۔ اس قسم کے کرداروں میں جانکی، زینت، شاردا، ممتی، اولنکا اور شوبھا وغیرہ چند ایسے کردار ہیں جن پر طوائفیت خود معاشرے نے لاد دی ہے اور اب وہ اس کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، ان عورتوں میں کبھی کبھی نسائی خودسپردگی کا فطری جذبہ بھی جاگتا ہے تاہم اس قسم کے مقامات پر جو مرد سطح پر نمودار ہوتا ہے وہ بازار کا ہرچگ مرد نہیں بلکہ ایک ایسا خاوند صفت مرد ہے جو گھر کا سربراہ ہوتا ہے اور خاندان کے نظام میں تمدنی نظم و ضبط قائم کرتا ہے۔ اس قسم کا ایک مثالی کردار بابو گوپی ناتھ کا ہے جس کے اندر دلال کے اوصاف نظر نہیں آتے۔ خدا بخش، مادھو اور شنکر وغیرہ بھی چند ایسے ہی کردار ہیں جو حیوانی جبلتوں کے کاروبار میں شریک ہیں لیکن جن کے دل میں عورت کو پناہ دینے کا جذبہ موجود ہے۔ ''سلطانہ'' اور ''سوگندھی'' میں طوائف کی کچھ حقیقی نقش کاریاں تو نظر آتی ہیں لیکن غور کیجئے تو ان عورتوں کو بھی زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ ان کے داخل میں ایک مخصوص نوعیت کا تصادم ہر وقت طغیانی پیدا کرتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے درست لکھا ہے کہ ـــــــ

---

[1] ممتاز شیریں ''کفارہ گناہ'' سالنامہ ''ادب لطیف''، لاہور ۱۹۶۳ء

''منٹو نے اس تصادم کے ڈرامائی عناصر سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔'' [1]

اور یوں منٹو قاری کو ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کرتا ہے جہاں وہ طوائف کو کبھی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے اور کبھی اس پر رحم کھانے لگتا ہے۔ منٹو کے افسانوں کی طوائفیں نچلے درجے کی وہ رنڈیاں ہیں جو آب و نان کی ضرورت کے تحت جسم فروشی کا پیشہ اختیار کرتی ہیں اور چہرے کی آب اور جسم کی گدراہٹ ختم ہو جانے کے بعد المناک زندگی گزارتی رہتی ہیں۔ ان طوائفوں کے بطون میں ایک فطری عورت ہمہ وقت موجود رہتی ہے۔ یہ طوائف اپنا گھر، اپنا خاوند اور اپنے بچوں کے خواب بھی دیکھتی ہے۔ ایّامِ محرّم میں کالی شلوار کی فراہمی اس کی ایک جذباتی ضرورت ہے اور وہ اسے مذہبی فریضہ بھی تصور کرتی ہے۔ وہ محبت کے صرف ایک نرم بول پر پگھل جاتی ہے اور اپنی بے کیف زندگی کے خلاء کو گھریلو لطافت سے پُر کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ منٹو نے اس قسم کی طوائف کے بے حد حقیقی افسانے لکھے ہیں۔ ان میں کرب بھی ہے اور جراحت بھی لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ منٹو اس قسم کی ترش اور تلخ ردِ عمل کی لہر کو ضرور موجزن کرتا ہے اور اس زاویے سے دیکھیے تو طوائف کے موضوع کے افسانوں میں معاشرے کے ایک بے رحم نقاد کا فریضہ سرانجام دیا ہے اور اس عمل میں وہ ہمیں خاصا جانبدار نظر آتا ہے۔ بلاشبہ وہ مُصلح یا مبلّغ اخلاق بننے کی کوشش نہیں کرتا تاہم وہ تیز، ترش اور تلخ ردِ عمل کی لہر کو ضرور موجزن کرتا ہے اور اس زاویے سے دیکھیے تو طوائف کے موضوع پر لکھے ہوئے منٹو کے افسانے خاصے مقصدی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ نچلے درجے کی نکیائی، بیسوا اور جسم فروش طوائف تو اس کا موضوع بار بار بنتی ہے لیکن اونچے درجے کی ڈیرہ دار طوائف جس کے وجود میں امراؤ جان ادا، لیلیٰ یا ناظمہ کی روح پرورش پاتی ہے اور جو اپنے عہد کی روایت کو آئندہ نسل کے خون میں داخل کر دیتی ہے، منٹو کے افسانوں میں ظاہر نہیں ہوتی۔

طوائف کا موضوع غلام عباس کے تخلیقی عمل کا تعاقب بھی کرتا رہا ہے اور اس طبقے کی عورتیں اس کے افسانوں میں متعدد مرتبہ سامنے آئی ہیں۔ ''آنندی'' میں طوائف کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور معاشرہ اس مرکز کے گرد طواف کرتا اور ارتقاء کی بعض منزلیں طے کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ''اسکی بیوی'' میں طوائف پس منظر میں چلی جاتی ہے اور قحبہ خانے پر گھر کی فضاء حاوی ہو جاتی ہے

---

[1] ڈاکٹر وزیر آغا ''اردو افسانے کے تین دور'' تنقید اور احتساب ص ۱۷۶

تاہم اس افسانے کی ہیروئن طوائف کے موروثی منصب سے دستبردار نہیں ہوتی۔ ''سمجھوتہ'' میں طوائف مرد کے ذہنی انتشار کو ختم کرنے اور اسے دوبارہ گھریلو زندگی میں داخل ہونے کا راستہ دکھاتی ہے۔ ''ناک کاٹنے والے'' کردار کی بجائے فضاء کا افسانہ ہے اور اس میں صرف طوائف کا کوٹھا اور دو ضمنی سازندے منظر پر طلوع ہوتے ہیں اور ڈیرے دار ننھی جان اس وقت سامنے آتی ہے جب خطرہ ٹل جاتا ہے اور ناک کاٹنے والے کوٹھے سے چلے جاتے ہیں۔ یہ افسانہ اس ماحول کو بعض حقیقی جزئیات سے پیش کرتا ہے جس میں طوائف زندگی بسر کرتی ہے اور ناگفتہ خطرات کی زد پر رہتی ہے۔ ''بردہ فروش'' میں عورت کے جسم کا کردار قحبہ خانے کی بجائے دیہات کی کھلی فضاء میں سرانجام پاتا ہے لیکن اس افسانے کے پسِ پشت بھی طوائفیت کا حقیقی زاویہ موجود ہے چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ زنانِ بازاری کا موضوع غلام عباس کے لئے ایک اہم موضوع کی حیثیت رکھتا ہے اور اس نے طوائف کی زندگی کا مطالعہ بڑی ژرف نگاہی سے اور اس کا اظہار انوکھے زاویوں سے کیا ہے اور اس عمل میں غلام عباس نے کسی اخلاقی یا فلسفیانہ نقطۂ نظر کو انگیخت نہیں دی۔ دوسری بات یہ کہ غلام عباس نے منٹو کی طرح طوائف کو موضوع بنا کر انسان کے بنیادی گناہ کو اجاگر کرنے اور اسے جبلتوں کا غلام ثابت کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس کے ہاں طوائف مظلومیت اور بے بسی کی علامت بھی نہیں ہے۔ اس کے برعکس غلام عباس کے افسانوں میں طوائف ایک نارمل کردار کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ یہ کردار اپنے گردوپیش کے معاشرے میں کچھ اس طور پر رچ بس چکا ہے کہ اس کے اندر کوئی نمایاں تصادم پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس کی عمدہ مثال ''ناک کاٹنے والی'' کی ننھی جان ہے جو خطرات کا مقابلہ زندگی کے ایک معمول کی صورت میں کرتی ہے۔ ''اس کی بیوی'' کی نسرین اس مخصوص معاشرے میں رچی بسی ہوئی عورت ہے اور اس سے باہر نکلنے کی آرزو تک نہیں کرتی۔ غلام عباس کے ہاں طوائف زندگی کے بعض اہم سوالات ابھارتی ہے لیکن یہ سوالات طوائف کے معاشرے میں ہی محیط ہو جاتے ہیں اور اس کے عملی بیک یارڈ کی نشاندہی کے سوا اور کوئی فریضہ ادا نہیں کرتے۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ غلام عباس نے طوائف کی معاونت سے معاشرتی تضاد ابھارنے یا لذت کوشی کو فروغ دینے کی کاوش نہیں کی۔ اس کا مشاہدہ باریک ترین جزئیات کی حد تک گہرا اور حقیقی ہے۔ غلام عباس سوچا ہوا افسانہ لکھنے کی بجائے دیکھا ہوا،

تجربے کی سان پر اترا ہوااور برتا ہوا افسانہ لکھتا ہے۔ اس نے طوائف کے کینوس پر جونقوش ابھارے ہیں ان میں حقیقت کے کھردرے کنارے تو موجود ہیں تاہم ڈرامائی کیفیات ابھارنے کی بجائے غلام عباس نے یہاں بھی توازن اور اعتدال کی فضاء پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی اور منٹو کے انداز میں چونکانے اور حیرت زدہ کرنے کا عمل اختیار نہیں کیا۔ چنانچہ طوائف کی قدر مشترک کے باوجود منٹو اور غلام عباس اظہار فن کے زاویے اور موضوع کو برتنے کا انداز مختلف ہے اور یہ دونوں الگ الگ جہتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ طوائف کی پیشکش میں رحمان مذنب کو تیسری اہم جہت کی حیثیت حاصل ہے۔ رحمان مذنب کا موضوع وہ معاشرہ ہے جس میں طوائف پیدا ہوئی ہے، پرورش پاتی ہے، جوان ہوتی ہے اور غمزہ ہائے ناز و نیاز لٹا چکنے کے بعد جب بڑھاپا اس پر بے محابا یلغار کرتا ہے تو میدان سے پسپا نہیں ہوتی بلکہ اس معاشرے کی مخصوص روایات کو مزید مستحکم اور مضبوط بنانے کے لئے نئی نسل کی انگلی تھام کر اسے پروان چڑھانے لگتی ہے۔ منٹو کے ہاں طوائف کا کردار اور اس کی داخلی کشمکش زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ غلام عباس نے طوائف کے ماحول سے ابھرنے والی متنوع صورت واقعہ کو بطور خاص اجاگر کیا ہے۔ رحمان مُذنب نے طوائف کے پورے معاشرے کا اور اس معاشرے میں پروان چڑھنے والے جزر و مد کا مشاہدہ کیا ہے اور طوائفیت کے سلسلہ در سلسلہ اور تہہ در تہہ نظام کو افسانے کی لذیذ صورت میں پیش کیا ہے۔
ڈاکٹر وزیر آغا نے منٹو کی طوائف نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''منٹو کے ہاں طوائف اور عورت کا تصادم سطح تک ابھرا ہوا ملتا ہے لیکن رحمان مُذنب نے طوائف کے کردار کو اس کی جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے اور تصادم تک خود کو محدود نہیں رکھا۔'' بالفاظ دیگر منٹو نے طوائف کے پیش منظر کو اہمیت دی ہے لیکن رحمان مُذنب نے طوائف کو اس کے ماضی اور پَس مَنظر سمیت پیش کرنے کی کاوش کی، ان دونوں کا موضوع اگرچہ ایک ہی ہے لیکن ان کے فن کے مدار مختلف ہیں۔ یہاں میرا مقصد موازنہ کرنا نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ رحمان مُذنب، منٹو سے مختلف نوعیت کا افسانہ نگار ہے۔ اس کے فن کے زاویے منٹو کے فن سے مماثلت نہیں رکھتے اور طوائف کے ماحول کی پیشکش کے اعتبار سے رحمان مُذنب مجھے منٹو کی بجائے غلام عباس کے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر بالخصوص ضروری ہے کہ رحمان مُذنب نے اپنی فنی زندگی کے کسی

مقام پر بھی طوائف کو مسئلہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اخلاقیات کے کسی مضبوط نظام کو مرتب کرنے اور اس نظام کی نسبت سے طوائف کو خطرے کا نشان ثابت کرنے کا داعی بھی نہیں، اس نے ہری چُگ مرد کے ذہنی تضادات، نفسانی ضروریات اور جنسی تشنگی کو اجاگر کرنے کے لئے بھی طوائف کے کردار سے معاونت حاصل نہیں کی بلکہ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اس نے طوائف کے معاشرے کو ایک منفرد اور زندہ اکائی کے طور پر قبول کیا اور اسے گناہ یا ثواب میں ملوث کئے بغیر اس کی پوری زندگی کی ہمہ جہت عکاسی کی، ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ ــــــ

''رحمان مُذنب نے اس سارے پس منظر کو اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے جو طوائف کے کردار کا خالق بھی ہے اور اس کی مخلوق بھی۔''

(تنقید اور احتساب'' ص ۱۷۶)

اور رحمان مُذنب کے ہاں اگر طوائف اہم ہے تو محض اس لئے کہ وہ اس کے توسط سے اس ماحول کی نقاب کشائی کر سکتا ہے جس پر معاشرے نے غلاف چڑھا رکھا ہے اس ماحول نے طوائف کی پرورش کی ہے، اسے زندہ رہنے کا وسیلہ عطا کیا ہے، اس کی مجروح انا کو تحفظ بخشا ہے، اسے عزت اور قدر عطا کی ہے۔ یہ ماحول روایتی اعتبار سے گھناؤنا، مخرب اخلاق اور قابلِ نفرت ہے لیکن رحمان مُذنب نے کسی منفی ردّ عمل کو کروٹ دینے یا اس کے بخیئے ادھیڑ کر اصلاح و تبلیغ یا رُشد و ہدایت کا فریضہ سرانجام دینے کی سعی نہیں کی بلکہ وہ تو اس ماحول کا خوش فکر ناظر، غیر جانبدار مبصر اور سبک سیر شاہد ہے اور ہمارے سامنے ایک معاشرتی حقیقت کو پوری صداقت پسندی سے یوں پیش کر دیتا ہے کہ اس کے پردے میں چھپی ہوئی متنوع حسرتیں ہمارے سامنے زندہ ہو جاتی ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ رحمان مُذنب نے اس ماحول کا کتابی مطالعہ نہیں کیا بلکہ اس میں زندگی بسر کی ہے۔ [۱] اور وہ ہمیں سوچا ہوا تخلیقی افسانہ نہیں سنا رہا بلکہ وہ داستان کا خالق بھی ہے اور داستان کی عملی واردات میں شامل بھی نظر آتا ہے۔ رحمان مُذنب نے جزو کے

---

[۱] رحمان مُذنب کی تقریباً ساری زندگی شاہی مسجد کے قرب و جوار میں بسر ہوئی ہے۔ جب نمی کھنڈر ہوگئی تو انہوں نے مجھے اپنے بعض کرداروں کے چوبارے بھی دکھائے تھے۔ غلام عباس کا بچپن بھی اسی محلے میں گزرا ہے چنانچہ طوائف کے ماحول کی اتنی باریک جزئیات نگاری ان دونوں کے مشاہدے کا ثمر نظر آتی ہے۔

بجائے کل پر نظر ڈالی اور اس مخلص فنکار کا فریضہ ادا کیا ہے جو مشاہدے کو لفظوں کا ملبوس عطا کرتا ہے تو اسے مصنوعی زیوروں سے آراستہ نہیں کرتا بلکہ مشاہدے اور حقیقت میں لفظ کو ہمیشہ سنجوگ کے وسیلے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد نے رحمان مُذنب کے گہرے مشاہدے اور جزئیات نگاری کو دیکھ کر لکھا تھا کہ ـــــ

> "رحمان مُذنب اپنی نگاہ جویاں سے جو کچھ واقعتاً دیکھتے ہیں اسے عین مین اسی طرح اپنے ناظرین تک پہنچا دیتے ہیں۔تخلیق اور ابلاغ کے درمیان اتنی بات البتہ ان کے ملحوظ نظر رہتی ہے کہ جب مشاہدے کی شمیم نگار اظہار تک پہنچے تو گردو پیش کی فضاء ایک کیفِ بے نام سے معمور ہو جائے۔"
>
> (ادبی دنیا، شمارہ نہم، دور پنجم۔ ص ۶)

رحمان مُذنب نے یہ کیفِ بے نام موضوع کے گہرے مشاہدے سے بھی پیدا کیا ہے اور اس کی نادر کار پیشکش سے بھی، چنانچہ وہ کردار کو روشنی میں لانے سے پہلے پورے ماحول کو روشن کرتا ہے۔ وہ بظاہر اندھیری گلیوں اور روشن بالا خانوں کا افسانہ نگار ہے لیکن اس کی نگاہِ حقیقت جو دبیز اندھیرے میں اس ماحول کے نشیب وفراز اور ان پر لڑکھڑانے والے ان گنت لوگوں کو دیکھ لیتی ہے اور وہ اجڑنے اور بسنے کا عمل گردشِ وقت کا حصہ بنا دیتا ہے۔گلی میں نورمیدہ کلی ابھرتی ہے تو فضاء خوشبوؤں سے لد جاتی ہے۔ چوبارہ رونقوں سے معمور ہو جاتا ہے لیکن پھر جب چاندنی کھنڈر ہو جاتی ہے، گلی باسی ہو جاتی اور کلی پھول بننے سے پہلے ہی مرجھا جاتی ہے تو احساس ہوتا ہے کہ یہ آبادبستی تو ازل سے ویران تھی اور شاید ابد تک ویران رہے گی، اس کی خوشبو باسی پھولوں کی خوشبو تھی اس کا جلوہ صبحِ کاذب کا جلوہ تھا جو سورج طلوع ہوتے ہی اپنی آب کھو دیتا ہے۔ یہ ایسی بستی ہے جہاں کوئی کسی کا پڑوسی نہیں، ہر ایک خود اپنا ساتھی، اپنا دمساز اور اپنا غمخوار ہے۔ رحمان مُذنب نے اس شہرِ افسوس سے ملامتیں جمع نہیں کیں بلکہ اس داستان گو کا فریضہ ادا کیا ہے جو صبح اور شام کے سنگم پر کھڑا ہو کر طلوع وغروب کا نظارہ کر رہا ہے اور اس نظارہ بینی میں رحمان مذنب نے پری جمالوں اور زہرہ جبینوں کے ایسے ایسے خوبصورت چہرے ہمارے سامنے جمع کر دیئے ہیں کہ آنکھیں چندھیانے لگتی ہیں۔ ان میں کلاسیکی دور کی آخری نشانی مُنی بائی بھی ہیں اور تیسری نسل میں آ کر

مُنی بائی کی مسند سنبھالنے والی فردوس بھی، گلی کی جلال آفرین مہارانی بلوری بلبل بھی ہے اور ''باسی گلی'' کی دلبری بھی۔ رحمان مُذنب کی خوبی یہ ہے کہ اس نے حسن کو مجسم صورت میں پیش نہیں کیا بلکہ اس آفتِ جاں کو گرد و پیش میں متحرک دکھا کر دلوں پر اس کی جہاں سوزی کا سکہ بٹھا دیا ہے۔

اس جمال کی روشنی میں ایک جھلک فردوس کی دیکھیے جس نے نئے زمانے میں آنکھ کھولی ہے لیکن جسے طوائفیت میراث میں ملی ہے ــــ

''مہتاب کے پاس سونے کا سگریٹ کیس تھا۔ فردوس کے پاس ہیرے کا جڑاؤ سگریٹ کیس جس میں ہمیشہ امریکی سگریٹ رہتے۔ سگریٹ نوشی کی عادت اسے کانونٹ میں پڑی تھی اور وہ کنجری بننے سے پہلے کنجری بن گئی تھی۔ سگریٹ پیتے پیتے دھوئیں کے رنگ بنا بنا کر چھوڑتی تو اس کے مکھڑے کے سامنے سرمئی بھنور کھینچ کھینچ کر ہوا میں تحلیل ہو جاتے۔ غلافی پپوٹوں اور لانبی لانبی پلکوں کی حرکت سے طلوع و غروب کا منظر اُبھرتا۔ چہرے پر سیندوری سورج کا جلال ٹھہر گیا تھا۔ اونچے قد کی بدولت اونچی شے بن گئی تھی۔ رنگت سرخ سانولی تھی، اس کے آتے ہی مستیاں پھیل جاتیں۔ دیکھنے والے آنکھیں بند کر لیتے اور پری کو اسیر کرنا چاہتے۔ علاقے بھر میں اس جیسا معشوق نہ تھا۔ بدن کا ہر جلی اور خفی خط حیرت میں ڈال دیتا۔ اس پر کانونٹ کی تعلیم دودھاری تلوار ہو گئی۔ سادہ کپڑوں میں حسن اپنے فطری روپ کی قیامت دکھا رہا تھا۔ ترشی ہوئی باہیں، ترشا ہوا بدن...... جوانی میں ترشی ہوئی جو الا مکھی مسکرا رہی تھی۔

(افسانہ، ''بالا خانہ'')

یہ رس بھری طوائف کا وہ روپ ہے جو یکسر رنگ و بو کے طوفان میں ڈوبا ہوا ہے اور اپنے ساتھ مردانِ حوصلہ مند اور آشنایانِ کار کو بہالے جانے کی قوت رکھتا ہے۔ اسی قسم کی ایک تصویر نیتی پیرنی کی ہے اور دیکھیے کہ رحمان مُذنب نے ڈھول میں سے کس شعلے کو برآمد کیا ہے:۔

''پردہ ہٹا! وہ چھم سے اندر آ گئی۔ نیک سائیں باہر تکیے میں بیٹھا دیکھتا

ہی رہ گیا۔ایکا ایکی شعلہ لپکا اور آنکھوں میں دھول جھونک کر سامنے
سے گزر گیا۔ نیتی پیرنی شعلہ ہی تو تھی لیکن اس وقت اس کے دہکتے
ہوئے چہرے پر گرد کی مہین سی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ نیم پریشان سنہری
بالوں میں راستے کی مچلتی ہوئی دھول نکھر رہی تھی اور اب حسن میں ابہام
کی کیفیت آ گئی تھی۔حسن ذرا پردے میں ہوا تو اس کا جادو اور بڑھا۔''
(افسانہ ''گشتی'' اوراق، دسمبر جنوری ۱۹۷۰ء، ص ۸۱)

اس حسنِ جہاں سوز کا دوسرا نام بیگاں ہے اور رحمان مُذنب نے اس قیامت کو الفاظ کا
ملبوس یوں پہنایا ہے۔''پھول سائیں'' میں خالدہ کی انگڑائی۔''بالا خانہ '' ص ۲۱۳

''جب بیگاں نے ایک صبح چھت پر کھڑے ہو کر پہلی انگڑائی لی
تو سورج کی کرن اس کی انگڑائی میں اٹک گئی۔ انگڑائی کیا تھی؟ شعلے سے
لبریز ایک پھول جو لپک کر نظر کی آخری بلندی سے آگے نکل گیا، جو ہر بلندی
سے سوا تھا۔ آخر انگڑائی تھی اوپر نہ جاتی تو کیا نیچے آتی۔اوپر انگڑائی تھی تو نیچے
حیران ہونے والی نظریں۔ انگڑائی لیتے ہی وہ اپسرا بن گئی۔ اپسرا جو بادل
کے آوارہ جزیروں میں رقص کرتی یا پھر شاعر کے خیال میں یا مصوّر کے موقلم
پر کوندتی —— اس کے لانبے لانبے بال نہیں سونے کی مہکتی ہوئی
کرنیں تھیں جو پل پل بے قرار ہوتیں اور قسمتوں کے تیور بدل سکتیں۔ ان
بالوں میں جو سونا کھپا تھا اس سے بہتر قسم کا سونا آج تک دریافت نہ ہوا
تھا—— پھر اس کا بدن بھی تو پگھلی ہوئی کرنوں سے بنا تھا۔ فجر کے
سورج کی سرخی اور کرنوں کا کُندن مل کر ایک ہوئے۔ جوانی کی چمک سے یہ
دراز قامت پُتلی خوابوں کی شہزادی بن گئی۔ کھڑی ہوئی تو قوسِ قُزح میں رنگوں
کی ٹھہری ہوئی موج تھی، رکا تھما ہوا بگولا تھی، چلتی تو مستی کے عالم میں جوانی کے
خوشبودار بھنور لہراتے بل کھاتے، جوانی کے ریلے بڑھتے چلے جاتے۔''
(افسانہ ''کوٹھے والی'' اوراق، مارچ اپریل ۱۹۷۲ء، ص ۷۶)

رحمان مُذنب نے منّی بائی، مہتاب، فیروزاں، فردوس، دلبری، کوُباں، بکوری بلبل، نیتی پیرنی، زینت بائی اور گوہراں جیسی خوبصورت، طرحدار اور خوش اندام طوائفوں کو ہی اہمیت نہیں دی بلکہ اس نے اس جہانِ حقیقت کو ان ضمنی کرداروں سے بھی مزیّن کیا ہے جن کے بغیر یہ معاشرہ نامکمل اور طوائف ادھوری نظر آتی ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے کرداروں کی ساری زندگی طوائف کی چوکھٹ سے ریزے چنتے گزر جاتی ہے۔ ان کرداروں میں طبلچی، سارنگی نواز، پیٹی بجانے والے، دلال، پُھلیرے، ملنگ، فقیر، پان فروش، افیمی، غنڈے، کوچوان، گندھی، چاقو مار، گرہ کٹ، نوسر باز اور پاکٹ مار سب شامل ہیں۔ ان میں موتی بادشاہ، نیک سائیں اور کالے شاہ بھی موجود ہے جن کی گالیوں میں دعاؤں کا اثر اور طوائف کا رزق بندھا ہوا ہے۔ طوائف اپنی ساری زندگی زود اعتقادی اور ان ملنگوں کی خدمت میں گزارتی ہے۔ ان میں سے بیشتر کرداروں کے پس منظر میں لٹی پٹی زندگی کا پورا ایک افسانہ موجود ہے لیکن اب یہ کردار کسی کے لئے سامانِ عبرت نہیں بنتے۔ یہاں پر ہر شخص خود اپنے تجربے سے گزر رہا ہے اور خود ہی مات کھا رہا ہے۔ یہ معاشرہ اگرچہ اندر سے بالکل کھوکھلا ہے لیکن اپنی ایک نرالی خارجی نشان رکھتا ہے۔ اس معاشرے کی اخلاقی بوطیقا خود ساختہ ہے لیکن اس کے نظم وضبط کو پوری طرح ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے اور ناآسودگی سے آسودگی کا زاویہ تلاش کر کے دل کو مائل بہ اطمینان کرلیا جاتا ہے۔ مدّت اگرچہ عارضی ہے لیکن اس کے انداز نرالے ہیں، انتقام اور ردِ انتقام کا پہلو موجود ہے لیکن اس کے عمل کا اُسلوب یکسر مختلف ہے۔ اس ماحول کی ایک نمائندہ تصویر مندرجہ ذیل اقتباس میں ملاحظہ کیجئے۔

> ''گلی میں دکاندار عورتیں رہتیں ——— انہیں تو بس ایک ہی دھن رہتی کہ موقعہ پائیں تو اپنے ہاتھوں اپنی ہی نعش ٹھکانے لگائیں۔ خود کو سپردِ خاک کرتے وقت اپنی جان سے زیادہ گاہک کی ضرورت کا پاس کرتیں۔ بس یونہی کبھی دو چار گھڑی کے لئے اکٹھی ہو جاتیں، جماعت کی صورت میں تبلیغی مشن پر نکلتیں۔ ایسے میں وہ چلتا پھرتا اشتہار ہوتیں۔ گلی کا چکر کاٹتیں۔ خوش مذاق اور مستقل تماش بینوں کے ہاتھوں پنواڑی کی دکان پر کھڑے کھڑے سگریٹ اور پان قبول کرتیں، ان کے

پُرجوش اصرار بلکہ خوشامد پر گلے میں ہار ڈال لیتیں پھر اس سب کے جواب میں بڑے نخرے سے ہنس دیتیں۔ دو میٹھے بول بھی بول لیتیں اور اس کے بعد اپنی دکان سجانے چلی جاتیں۔ تب ان کی ایک ہی آرزو ہوتی۔ ایسی آرزو جو انہیں لحظہ بہ لحظہ موت کی دہلیز پر وقت سے پہلے دھکیلتی جاتی۔ وہ ہر دم یہی چاہتیں کہ کوئی لمحہ گاہک کے وجود سے خالی نہ رہے۔ ان کا دربار دست بستہ گاہکوں سے سجا رہے پھر وہ اپنی سہولت کے مطابق جس گاہک کو چاہیں نوازیں اور جس کو چاہیں دھتکار دیں۔''

(افسانہ ''باسی گلی'' ادبی دنیا، دور پنجم شمارہ نہم ص ۱۱۹)

یہ تصویر ''باسی گلی'' کی بے حد متحرک لیکن بے حد دلدوز تصویر ہے۔ اب ایک جھلک اس بالا خانے کی دیکھیے جہاں زیرِ تصنیف طوائف کے لئے صاف ستھرا ماحول فراہم کیا جاتا۔ اخلاق و آدابِ معاشرت سکھائے جاتے۔ درباداری کی تعلیم دی جاتی۔ ترقی کے راز سکھائے جاتے۔

''تہذیب وثقافت کے رسیا اور شائستگی کے شیدائی بگھی یا فٹن میں بیٹھ کر آتے۔ جونہی دہلیز پر پاؤں دھرتے کنیز کھڑی ہو جاتی اور تمام رعنائیوں سمیت نہایت ادب اور متانت سے کورنش بجالائی۔ مجرا خانے کی یہ سگھڑ اور فرماں بردار کنیز جب وہاں سے اٹھ کر اپنے آقا کے اشارے پر بالا خانے پر پہنچتی تو فرماں روا ہو جاتی۔ زیر خانہ اور بالا خانے میں یہی بنیادی فرق تھا۔ وہاں کی کنیز یہاں کی آقا ہوتی۔ بالا خانے کی اس بالا دستی کو پانچ ہزار سال سے کوئی گزند نہیں پہنچا سکا تھا۔ پچھلے پانچ ہزار سال سے یونہی بڑی بڑی ہستیاں جن کے حکم سے دنیا اپنے محور پر قائم تھی یہاں آکر زیروزبر ہوتی رہیں۔ تماشابین آتا، معشوق کو سامنے بٹھا کر بوتل کھلواتا، قاعدے قرینے سے پیالہ پیتا۔ جی چاہتا تو گھر سے پی کر آتا۔ جو پیالہ نہ پیتا تو آرام سے گاؤ تکیے کے سہارے چاندنی پر بیٹھ جاتا۔ نائکہ بلمپت لے میں پان بناتی، معشوق پان پیش کرتا۔ تماش بین چہرہ شاہی روپیہ تھالی میں رکھتا پھر

استاد ساز چھیڑتا، گانا شروع ہوتا۔ خیال، ٹھمری، گیت اور غزل کے خاتمے پر
روپے نذر کئے جاتے۔"

(افسانہ "بالاخانہ")

رحمان مُذنب نے اس ماحول کی جزئیات کو صرف ظاہر کی آنکھ سے ہی نہیں دیکھا بلکہ اس کا مشاہدہ داخل کی تیسری آنکھ سے بھی کیا ہے اور طوائف کے عمل و حرکت سے اس کی مخصوص نفسیات کو بھی دریافت کیا ہے۔ اس کے افسانوں میں طوائف محض دخترِ نشاط بن کر سامنے نہیں آتی بلکہ وہ اپنے باطن کو بلا خوف و خطر آشکار کرتی ہے۔ زمانے کی ہر گردش کو بغور دیکھتی ہے۔ اس کی ہر آہٹ کو بگوش ہوش سنتی ہے اور پھر اپنی مخصوص معاشرتی اقدار کے مطابق ان پر اپنے تاثر اور ردِ عمل کا اظہار بھی کرتی ہے۔ رحمان مُذنب نے ان افسانوں میں طوائفیت کی جن قدروں کا اثبات کیا ہے۔ ان میں سے چند ایک حسبِ ذیل ہیں:-

- "کنجری وہ جو ہوش میں رہے۔"
- "رنڈی ہی گھاٹے کا سودا کرے تو پھر حرامزادی اور حلال زادی میں کیا فرق؟"
- "قدرت کا نظام اور کوٹھے کا انتظام کچھ ایسا ہے کہ ایک انوری مرتی ہے، دوسری انوری جی اٹھتی ہے۔"
- "ذلیل سے ذلیل رنڈی بھی استاد اور شاگرد میں فرقِ مراتب کرتی اور زندیق کے درجے تک نہ پہنچتی۔"
- "ققنس کی طرح رنڈی اپنی ہی راکھ سے پیدا ہوتی ہے۔"
- "کنجری دوسروں کو مٹی میں ملاتی ہے اپنا گھر آباد کرتی ہے۔"
- "رنڈی وہ بنے جو شیر کا دل رکھتی ہو اور لومڑی کا دماغ۔ نڈر رہو، ہوشیار ہو، مکار رہو، عیار رہو۔"
- "عورت بنی بنائی ہوتی ہے۔ رنڈی بننا پڑتا ہے۔"
- "ٹمیڈی لڑکی کھلونے کے سوا کچھ نہیں۔ اصل شے رنڈی ہے جو اپنے اڈے کی ہو رہتی ہے۔ قدر اسی کی ہے جو کھونٹے سے بندھا رہے۔ جو گھر سے بے گھر ہو جائے اس کی کوئی قیمت نہیں۔"

رحمان مُذنب نے ڈیرہ دار طوائف سے لے کر پیرنی اور نکیائی تک ہر قسم کی طوائف کا

مطالعہ عمق نظری سے کیا ہے اور ان کے ظرف و حوصلے، محبت اور رقابت کے حقیقی خوش منظر اور بعض اوقات حسب ضرورت کریہہ نقوش بھی ابھارے ہیں۔ اس کا افسانہ "بالا خانہ" صرف ایک نسل تک محدود نہیں بلکہ یہ تین نسلوں کی بھرپور معاشرتی تصویر ہے۔ یہ کہانی کم و بیش تین ہزار سالوں پر پھیلی ہوئی روایت کو زندہ کرتی ہے۔ روایت کے اس تسلسل میں ایک اہم طوائف منّی بائی تھی جس کی دُھومیں رجواڑوں میں مچی ہوئی تھیں۔ وہ ڈنگے سے شاہی محلے میں آئی تو چھوٹے سے چوبارے میں ایک کم حیثیت کرایہ دار تھی لیکن جلد ہی مولا نے وہ بھاگ جگائے کہ دیکھتے دیکھتے حویلی کھڑی کر لی۔ خیال اور ٹھمری میں نام پایا۔ رسُولن بائی اور ہیرا بائی بزور دیکر نے شاباشیں دیں اور پھر منّی بائی کی بدولت ایک نیا خاندان ابھرا جس کا تعارف رحمان مذنب نے اپنے مخصوص رسیلے انداز میں یوں کرایا ہے۔

> "یہ اس کی فتوحات تھیں کہ بازار میں نیا خاندان ابھرا۔ اس نے نگاہ بلند، سخن دلنواز اور جان پر سوز سے اس کی جڑیں مضبوط کیں۔ ان ایام میں نواب رنڈیوں سے ملتے اور نوابی کی سند پاتے۔ انہی کی بدولت اور انہی کی خاطر نوابی شان دکھاتے۔ رنڈیاں بھی نوابی شان دکھاتیں۔ ان کے نوکر نواب دین ہوتے۔ رنڈی کے ڈیرے اور وڈیرے میں فاصلہ نہ رہا۔"

پھر انوری بائی کا دور آیا تو زمانہ بدل چکا تھا۔ اب لوگ پہلے سے زیادہ پیسہ لاتے لیکن سلیقے کا گلا گھونٹ کر آتے۔ اس دور میں ذات پات کی تمیز بے معنی ہوگئی۔ طوائف کے نزدیک صرف پیسہ معتبر ہوگیا۔ انوری بائی غروب ہوئی تو مہتاب بائی طلوع ہوئی اور اب وہ جھنڈے بھی اکھڑ گئے جو منّی بائی نے ڈنگے جیسے چھوٹے سے گاؤں سے آکر لاہور جیسے بڑے شہر میں گاڑے تھے اور جن کے استحکام کے لئے انوری بائی نے جاں ہار محنت کی تھی۔ سمگلر اور بلیکیئے بادشاہ بن گئے اور اب بالا خانے پر جو صورت حال درپیش تھی اس کا نقشہ رحمان مذنب نے یوں کھینچا ہے۔

> "سگریٹ ختم کر کے مہتاب نے دیوان پر پاؤں پسارے ہی تھے کی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ لڑکی کی جوانی کھنکنے لگی تو ٹیلیفون کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ویسے تو یہاں ہر دم خطرے کی گھنٹی بجتی رہتی تھی لیکن گھنگھروؤں کی

جھنکار میں سنائی نہ دیتی۔ مہتاب نے ریسیور لیا اور کہا۔

''ہیلو۔''

''بڑی بائی جی، سلام۔''

''وعلیکم سلام! کون ہو صاحب؟''

''لو! اب ہم کون ہو گئے۔'' دوسرے سرے پر زوردار قہقہہ گونجا، ''رات ہم ہی مجرا سننے آئے تھے۔''

''اچھا۔اچھا۔ چودھری صاحب! معاف کرنا! پہلی ملاقات تھی۔ ابھی تو ٹھیک سے جان پہچان بھی نہیں ہوئی۔''

''ستائیس سو کا مجرا سنا اور جان پہچان بھی نہیں ہوئی۔''

''برا نہ ماننا چودھری صاحب! یہاں لوگوں نے دولت کے کنویں خالی کیے ہیں اور تم ستائیس سو پر اتراتے پھرتے ہو۔''

''کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔ ہم ستائیس ہزار بھی خرچ کر دیں گے تم نے ہمارے ٹور نہیں دیکھے۔ دکھا دیں گے اپنے ٹور۔''

''اچھا صاحب! دکھا دینا اپنے ٹور! تم لوگوں کے ٹور سے ہمارے ٹور ہیں۔''

''چھوٹی بی بی کیا کر رہی ہے؟''

''سو رہی ہے!''

''کس کے ساتھ؟''

''اپنے ساتھ، کنجری بنے گی تب سوئے گی کسی کے ساتھ''

''کس کے ساتھ سوئے گی؟''

''جو مال لگائے گا۔''

''ہم مال لگائیں گے۔''

''ہمارا دستور ہے، تیل دیکھتے ہیں، تیل کی دھار دیکھتے ہیں۔''

''ضرور دیکھیں دھار! دس دس لاکھ کے تین ٹھیکے لئے ہیں۔''

''مبارک ہو''

''تمہیں بھی مبارک ہو بائی جی! یہ سب تمہارے لئے ہے۔''

''چلو یونہی سہی۔''

اُقدار کے اس زوال پر رحمان مُذنب نے طوائف کے تلخ وترش ردعمل کو بھی بڑی حقیقت بیانی سے پیش کیا ہے۔ پچھواڑے کی گلی سے مہتاب بائی کی نئی کرایہ دارن آتی ہے۔ تو وہ کہتی ہے۔

''یہ آج کل کے تماشبین بڑے کپتے ہیں۔''

''بی بی جان جی! گھٹے کھوٹے'' نئی کرایہ دارن نے اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہا۔

''گھٹی کے تخم سٹین گن لئے پھرتے ہیں۔ مجرا خانے میں پیسہ چلتا ہے یہ گولیاں اور گالیاں چلاتے ہیں۔''

''گشتیوں کی اولاد ہیں، ماں کا پتہ نہ باپ کا۔ حرام کے جنے رنڈی کو برا کہتے ہیں اور اپنے آپ کو اچھا۔''

''سؤر کے بچے کہتے ہیں رنڈی نقلی پیار کرتی ہے۔ جب یہ ہے تو رنڈی کے پاس کیا لینے آتے ہیں؟ حرام کا مال دے کر اصلی مال مانگتے ہیں۔''

اس مکالمے میں معاشرے کی بدلتی ہوئی اقدار پر ہی تبصرہ نہیں بلکہ طوائف کے ادارے کے زوال کا نوحہ بھی موجود ہے۔ رحمان مُذنب نے زوال کی اس داستانِ عظیم کو زمان و مکان کی قیود سے آزاد کرا کے اسے معاشرے کے مجموعی زوال کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا ہے۔ اب ہارمونیم کی جگہ ٹیپ ریکارڈر نے لے لی ہے۔ سینما سمٹ کر ڈرائنگ روم میں سما گیا ہے۔ اب بالا خانے کی ضرورت نہیں رہی اس لئے فردوس بائی نے فکر و عمل میں موافقت پیدا کرنے کے لئے سول لائن ایریا میں ایسی کشادہ فضا تلاش کر لی جس پر تہذیب و تمدن کی محفوظ مہر لگی ہوئی تھی اور اب وہ طوائف سے کال گرل بن گئی تھی۔

''بالا خانہ'' اس ڈیرے دار طوائف کا افسانہ ہے جو اپنی انا اور طوائف کے فنی ارتقاء کو

ہر دور میں زندہ رکھتی ہے۔ رحمان مُذنب نے اس ماحول کی ہمہ جہت عکاسی کے لئے "بالا خانہ" میں طوائف کے معاشرے کے ہر طبقے کو نمائندگی دی ہے۔ ڈیرہ دارنی کا جلال و جمال اس کے چہرے سے بھی ہویدا تھا اور اس کی حویلی کی پیشانی سے بھی۔ اس حویلی کی سب سے قیمتی متاع نیلام عام کے لئے رکھی ہوئی تھی لیکن بلند حویلی کے نہاں خانوں میں ایک ایسی عورت بھی موجود تھی جس کی جھلک چشمِ فلک کے علاوہ اور کسی نے نہیں دیکھی۔ یہ اس گھر کی بہو کا کردار ہے جسے مالِ مسروقہ کی طرح چھپا چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ نجماں طوائف کے معاشرے میں رہ کر بھی ہمہ وقتی عورت ہے لیکن بے دست و پا، مجبور اور اس معاشرے کی خاموش تماشائی، ایک ذی وقار کنیز گھر کی آبرو اور شرافت کی علامت جس کی قلمرو کا دارالحکومت باورچی خانہ ہے۔ اسی قسم کا ایک اور کردار انور کا ہے جو انوری بائی کا بیٹا اور نجماں کا خاوند ہے۔ انور وہ گیدڑ ہے جو ماں کے سامنے شیر بن جاتا ہے لیکن بیوی کے سامنے محض ایک بھیگی بلّی۔ وہ معاشرے کا عضوِ معطل، چرس اور چانڈو پر گزارہ کرنے والا۔ اس کی زندگی میں جوں جوں تکیہ داخل ہوا توں توں نجماں خارج ہوتی گئی اور اس داخل خارج میں ہی اس کا کام تمام ہو گیا۔ یہ دونوں کردار طوائف کے معاشرے کے اہم کردار ہیں لیکن اردو افسانے میں اپنی صورت بہت کم دکھاتے ہیں۔ رحمان مذنب نے شائد پہلی دفعہ ان کرداروں کو اتنے بھرپور انداز میں افسانے کی بُنت میں شامل کیا ہے کہ اب ان کرداروں کے خدوخال ہی نمایاں نظر نہیں آتے بلکہ ان کے اوصاف بھی پہچانے جاسکتے ہیں۔

"باسی گلی" میں رحمان مُذنب نے ایک ایسی طوائف کو موضوع بنایا ہے جس کی تباہ حالی کے بعد چاندنی لٹ جاتی ہے اور چوبارہ کھنڈر ہو جاتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار وہ عورت ہے جو گاؤں میں تھی تو اَیشاں تھی۔ لال گڑھ کی ندّی کی طرح بے داغ، شبنم سے نہایا ہوا پھول، اونچی اور آبرو والی لیکن جب اغوا ہو کر قحبہ خانے میں پہنچی تو دلبری بن گئی اور دس ہزار میں سات مرتبہ بکی۔ مردوں کی ہوس اور دلالوں کی سخت گیری کا شکار بنی۔ دلبری کسی نائکہ سے کاروباری آداب نہیں سیکھتی۔ چند فاقے، چند ٹھوکریں اور چند حادثے ہی اسے سب کچھ سکھا دیتے ہیں۔ مجبوریاں اسے اَیشاں سے دلبری کے سانچے میں ڈھال دیتی ہیں۔ اس افسانے میں باسی گلی ہی سامنے نہیں آتی بلکہ وہ بسیط و عریض مخازن اور وہ حالات وکوائف بھی منظر پر ابھرتے

ہیں جن سے باسی گلیوں کے گوہر ہائے آبدار درآمد کئے جاتے ہیں، پھر بے آب کر کے معاشرے کے کوڑے کرکٹ میں ملا دیئے جاتے ہیں۔ مولانا صلاح الدین نے لکھا ہے ـــــ

''رحمان مذنب نے ان دونوں مقامات کا نہایت سچا اور گہرا مطالعہ کیا ہے۔''

اور طوائف کی بے حد قابلِ رحم تصویر اپنے اصلی رنگوں میں پیش کی ہے لیکن دلبری محض طوائف نہیں۔ اس کے باطن میں اس کا گاؤں زندہ ہے اور ایک فطری عورت بھی ہے۔ چنانچہ اس کے باپ کے مرنے کی خبر آتی ہے تو اس کی پوری زندگی لرزہ براندام ہو جاتی ہے۔ اس کا پورا ماضی لاشعور سے ابھر کر سطح پر آجاتا ہے اور اس کے اندر سے انتقام کا شعلہ نکل کر گرد و پیش کو خس و خاشاک کی طرح جلاڈالتا ہے۔ دلبری بظاہر ایک منفعل کردار ہے اور اس نے اپنے آپ کو حالات کے تیز رَو دھارے کے سپرد کر رکھا ہے تاہم اس کے اندر کی عورت مردہ نہیں ہوئی۔ اس کا دلال اسے باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ ـــــ

''ڈرائیور اور رنڈی کی اپنی کوئی طبیعت نہیں ہوتی اور اس نے جو
حلوہ آسامی پھنسائی ہے اس سے پانسو تو بالکل مفت کے حاصل کرنے ہیں۔''

لیکن اس وقت دلبری کے اندر سے ایشاں برآمد ہو چکی تھی اور اس کی طبیعت پرانی ڈگر پر آ ہی گئی تھی تو اس نے حلوہ اسامی کو بھی ٹھوکر مار دی اور اپنی گندی ذات کو صحت مند معاشرے کے وجود میں یوں سمو دیا کہ برائی کا سرچشمہ ہی بند ہو گیا۔ اس افسانے میں رحمان مذنب نے گناہ کی کوکھ میں خیر کھرنے نہیں دیا بلکہ اس کی بازیافت کر کے ایشاں کے کردار کو حیاتِ جاوداں دے دی ہے۔

رحمان مذنب نے طوائف کا ایک اور روپ افسانہ ''گشتی'' میں نِیتی پیرنی کی صورت میں پیش کیا ہے۔ دلبری تو ہمہ تن خلوص تھی، گاہک اور موت کو اپنا مقدر جانتی تھی اور نا آسودہ آرزوؤں سے بھی بے کل نہ ہوتی لیکن نیتی پیرنی تو از سرتاپا طوائف تھی۔ وہ مرد سے سودے بازی نہیں کرتی بلکہ اسے لوٹتی ہے۔ نِیتی پیرنی اس معاشرے کا بے حد فعال کردار ہے۔ وہ تماشابین کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھتی، اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔ اِبنِ مفت بر کو اس نے چاقو مار دیا تھا۔ مَولے مَلنگ سے طباق چھین کر بالوں سے گھسیٹا اور اس کی وکھی میں دو چار لاتیں جڑ دیں۔ نیتی سچ مچ آندھی ہے، اس کا غصہ طوائف کا غصہ ہے جو اندر سمٹنے کے بجائے باہر چھلک آتا ہے۔ دوسری

طرف اس کے اندر بھی ایک عورت موجود ہے، وہ نصر و پر مرمٹی تو اپنا سب کچھ اس پر نثار کر دیا۔ جمیلہ کو اس کا کنجر خاوند چھوڑ گیا تو اسے زندہ رہنے اور بال بچوں کو پالنے کا حق دیا اور نیک سائیں چرس اور افیون کی سمگلنگ میں پکڑا گیا تو مقدمہ پر پیسہ پانی کی طرح بہانے پر تیار ہو گئی۔ اس کا ایقان تھا کہ نیک سائیں جیسا وردا تیا روز روز تو پیدا نہیں ہوتا، لاکھوں میں ایک ہوتا ہے مائی کا لال۔ نیک سائیں نے نیتی پیرنی کے تمام حقوق ادا کئے تھے، اب یہ حقوق گویا واپس کرنے کا وقت آ گیا تھا لیکن اس کے لئے پیسہ چاہیئے تھا اور پیسہ حاصل کرنے کے لئے ہی نیتی پیرنی پھر طوائف بن گئی۔ اس مقام پر نیتی گناہ کی طرف ارادۃً قدم بڑھاتی ہے لیکن اس کا کردار اچانک موڑ کاٹ کر مثبت جہت اختیار کر لیتا ہے اور اس کا باطنی وجود طوائف کے کاروباری جسم پر غالب آ جاتا ہے۔ طوائف کے کردار کی یہ مثبت صورت رحمان مُذنب نے افسانہ ''بلوری بلبل'' میں بھی بڑی عمدگی سے پیش کی ہے۔ یہ افسانہ سیاسی پس منظر میں پروان چڑھتا ہے لیکن اس کے پسِ پشت خان محمد سینڈو کو یار سے دلدار بنانے والی بلوری بلبل بھی موجود ہے اور جب خان محمد سینڈو وِلاّ اللہ کا ورد کرتا ہوا اور ہجوم کا دل گرماتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو بلوری بلبل بھی گلی چھوڑ جاتی ہے۔

طوائف کا ایک اور ہرجائی روپ افسانہ ''کوٹھے والی'' میں سامنے آتا ہے۔ ''باسی گلی'' کی دلبری کو گاؤں سے اغوا کر کے قحبہ خانے کی زینت بنایا گیا تھا لیکن ''کوٹھے والی'' کی دلبری قحبہ خانے کے مضبوط قلعے سے نکل کر گاؤں پر یلغار کرتی ہے اور اس شان کے ساتھ کہ گاؤں کتے کے پلّے کی طرح اس کے پاؤں چاٹنے لگتا ہے۔ دلبری وہ طوائف ہے جو بدن کے سب سُروں کو پہچانتی ہے۔ حسن بانو اس کے جسم کا نام ہے۔ بیگاں اس کی شخصیت اور معاشرتی خدوخال کا عنوان...... اور ان دونوں کے درمیان ایک جوان انگڑائی ہے جس میں سورج کی پہلی کرن اٹکی ہوئی ہے۔ اس انگڑائی نے گاؤں کے چودھری کو نگل لیا۔ دلبری ایک فعّال سماجی حقیقت ہے، اس نے گناہ آلود زندگی سے ایک مخصوص فلسفہ اخذ کیا ہے اور اسے طرزِ حیات کے طور پر قبول کر رکھا ہے۔ وہ بیگاں کو اس فلسفۂ حیات سے متعارف کراتی ہے تو کہتی ہے۔

> ''جو ہمارے پاس آتا ہے، ہم اس کا سب کچھ چھین لیتے ہیں۔ وہ ہمارا ہو جاتا ہے۔ اپنا بھی نہیں رہتا اور جو اپنا نہ رہے، ہم اس کے کیوں بنیں۔''

اس افسانے میں دادن پور کا چودھری ایک منفعل کردار ہے جو دولت لٹا سکتا ہے لیکن بیگاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا اور دلبری ایک ایسی مضبوط طوائف ہے جو اپنے مستقبل کی حفاظت کرنا جانتی ہے اور چودھری کو نہ صرف بیگاں کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتی بلکہ اسے الٹا طوائف کے ڈیرے کا ایک فرد بنا کر ایک طرف ڈال دیتی ہے۔ چودھری کے منفعل کردار کا یہ المیہ رحمان مُذنب نے بڑی فنکاری سے ابھارا ہے اور طوائف کے قاتل عمل کو بے حد خوبی سے اجاگر کر دیا ہے۔

رحمان مُذنب کے افسانوں میں طوائف اپنے اصلی جوہر کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ اس کے ہاں چھوٹے چھوٹے کرداروں کا ایک شہر آباد ہے اور اس شہر کی مرکزی شخصیت طوائف ہے۔ یہ طوائف اگرچہ بے نام ہے لیکن اپنے پیشے سے پہچانی جاتی ہے وہ عمل اور مکافاتِ عمل سے بھی گزرتی ہے۔ گناہ اور ثواب کے تاثرات بھی اس کی ذات کا حصہ بنتے ہیں۔ طوائف کے اس روپ کو رحمان مذنب نے ''کوٹھاں کی جنت'' میں پیش کیا ہے اور گناہ و ثواب اور خیر و شر کے تصادم سے اس نے فطری عورت کو بخیر و خوبی نکلنے کی راہ دکھائی ہے۔ اس افسانے میں بھی گوہراں ایک ایسا کردار ہے جس کا مقصد مرد کو لبھانا یا اس کی جنسی آگ کو سرد کرنا نہیں بلکہ اسے لوٹنا اور اپنے لئے محل، ماڑیاں اور حویلیاں کھڑا کرنا ہے۔ چنانچہ یہ طوائف اپنی روح مرد کے حوالے نہیں کرتی، گناہ کے اس عمل میں وہ کسی اضطراب یا کشمکش سے نہیں گزرتی، ضمیر کی اذیت بھی اسے پریشان نہیں کرتی بلکہ وہ اپنی تراشیدہ اخلاقی قدروں پر عمل کرتی ہے اور بالا خانے، چوبارے اور گلی میں آنے والی پیڑھیوں کے لئے روشن نقوش پا چھوڑ جاتی ہے۔ وزیر آغا نے درست لکھا ہے کہ ''رحمان مُذنب نے نسبتاً مشکل زمین میں تخلیق کے نقوش کو اجاگر کیا ہے اور یوں منٹو کے مقابلے میں رحمان مُذنب نے ایک نسبتاً کشادہ کینوس پر اپنے فن کے نقوش کو ابھارا ہے۔''

رحمان مُذنب نے خوشبودار عورتوں کی افسانہ نگاری کے لئے اسلوب بھی خوشبودار اختیار کیا ہے۔ اس رومانی اسلوب کا خمیر قحبہ خانے کی فضا سے ہی اٹھا ہے۔ یہ زبان اپنی مخصوص اصطلاحات سے مفاہیم و معانی آشکار کرتی ہے۔ دشنام اس معاشرے میں اسی طرح استعمال ہوتا ہے جس طرح کھانے میں نمک مستعمل ہے۔ رحمان مذنب کا اندازِ تحریر شگفتہ، رواں، بے ساختہ اور متحرک ہے اس کی تشبیہات اور استعاروں میں ندرت اور جاذبیت ہے اور انہیں زندگی کے تجربے

سے ہی اخذ کیا گیا ہے۔ رحمان مُذنب نے اظہار و بیان میں روایتی اخلاق کی تمام قیود کو قبول کیا ہے لیکن جہاں طوائف کو اپنے دل کا غبار نکالنے کا موقع ملا ہے وہاں رحمان مُذنب نے باسی گلی کی زبان پر بھی کوئی قدغن عائد نہیں کی اور طوائف کے معاشرے کو اس حقیقت نگاری اور توازنِ فکری سے پیش کیا ہے کہ اردو کے بیشتر افسانہ نگار اس میدان میں رحمان مُذنب کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

..................O..................

حصّہ دوم

مضامین کتابوں پر

پنجرے کے پنچھی

رياض احمد

رحمان مذنب نے ایک دفعہ کہا تھا: ''بعض لوگ کہتے ہیں کہ شیکسپیئر نے نئی راہیں نکالیں۔ میرے خیال میں اس نے راہیں مسدود کیں۔'' یہ فقرہ مجھے اپنے Pithy اسلوب کی وجہ سے پسند آیا۔ شاید اس کی ایک وجہ اور بھی تھی، وہ یہ کہ کم از کم ایک راہ تو رحمان مذنب نے بھی مسدود کی ہے۔ یہ راہ ''امراؤ جان ادا'' سے نکلی، ''آنندی'' سے ہوتی ہوئی رحمان مذنب تک پہنچی اور پھر مسدود ہو گئی۔ میرے لئے راہ مسدود کرنے والے ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید ہیں اور یہاں میں پھر رحمان مذنب ہی کی سند سے بات کر رہا ہوں۔

''ایسے میں وزیر آغا اور انور سدید میرے آڑے آئے۔ انہوں نے میرے افسانے پڑھے اور بلا تعصب اظہار رائے کیا، اس میں انہوں نے قلم کی آبرو کو برقرار رکھا۔ مجھ سے رعایت برتی نہ مصلحت سے کام لیا۔''

مجھے یاد ہے بھلے دنوں میں جس اتوار کو حلقۂ اربابِ ذوق میں رحمان مذنب کا افسانہ شیڈول ہوتا، وقت سے پہلے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ وائی ایم سی اے کے کمیٹی روم میں جگہ کم پڑ جاتی۔ زیادہ تر لوگ دیواروں سے ٹیک لگا کر کھڑے کھڑے افسانہ سنتے، تاہم اس کے ساتھ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ نہ تو حلقہ کے جلسوں میں کبھی رحمان مذنب پر کسی نے کوئی مضمون پڑھا نہ کسی رسالے میں شائع کیا۔ میر نے کہنے کو تو یہ اپنے متعلق کہا تھا کہ ''تجھے میر سمجھا ہے کم کم کسو نے'' لیکن ان کا یہ مصرعہ کئی لوگوں کے حسبِ حال رہا ہے۔ رحمان مذنب کے ساتھ ایک شہرت یا تہمت چمٹ کر رہ گئی تھی کہ وہ جنس نگار ہیں۔ منٹو اور عصمت کے ساتھ ان کا نام بھی نتھی کر دیا جاتا تھا۔ شہزاد منظر نے ''اردو افسانے کے پچاس سال'' کے عنوان سے کتاب لکھی، اس میں چار پانچ دفعہ

رحمان مذنب کا حوالہ بھی آیا لیکن محض ایک ذیلی حیثیت سے اور وہ بھی یوں کہ جنس نگاروں کی صف میں ان کا نام بھی گنوادیا (شکر ہے فحش نگار نہیں لکھ دیا)۔ اردو میں جنس کا تذکرہ عام کرنے میں میراجی کا نام لیا جاتا ہے لیکن اس حوالے سے مقدمے منٹو اور عصمت چغتائی پر چلے۔ ظاہر ہے کہ ان مقدموں میں بناءِ مقدمہ فحش نگاری تھی جسے جنس نگاری سے گڈمڈ کردیا جاتا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنس کے متعلق فنی سطح پر لکھنا معیوب کب ٹھہرتا ہے۔ انگریزی ناول ''لیڈی چٹرلے'' پر اسی حوالے سے قانونی بحث تک نوبت پہنچی تو ناول فحش قرار نہ پایا حالانکہ اس میں کچھ مقام ایسے ضرور آتے ہیں جن پر اخلاق وتہذیب شرم سے آنکھیں جھکائیں یا نہ جھکائیں، ذوقِ سلیم پر وہ مقام گراں ضرور گذرتے ہیں۔

اس لئے شاید یوں کہا جاسکے کہ وہ موضوعات یا اسلوب بیان جس میں لذت اندوزی کے لئے جنسی موضوعات کو چھیڑا گیا ہو اور جن سے جذبات کی غیر فطری برانگیخت کی طرف PERVERSION کی راہ کھلتی ہو مذموم ٹھہرتے ہیں۔ رحمان مذنب، اوّل تو کہیں جنسی ترغیبات کے ذہنی یا عملی تصورات کی نقش گری نہیں کرتے اور کہیں یہ مذکور آ بھی جائے تو اکثر و بیشتر ذہن خودلذتیت کے سلسلوں کی طرف مائل ہونے کی بجائے ایک کبیدگی کی کیفیت محسوس کرتا ہے، طبعیت منغض ہوتی ہے۔ مثلاً گوری گلاباں :(صفحہ 174-175) دیکھئے۔ گوری گلاباں اپنے گاہکوں کے ساتھ جن مرحلوں سے گذرتی ہے ان کے ذکر میں کراہت کا کون سا پہلو ہے جو در نہیں آیا۔ یہاں سے آخر تک پڑھ جایئے۔ طبعیت کی بے کیفی بڑھتی ہی جائے گی اور تب کہیں جاکر ذرا سکون نصیب ہوگا جب چاقو تھمے خاں کے پیٹ میں پیوست ہو جاتا ہے یا پھر ''پنجرے کے پنچھی'' میں نواب زادہ صاحب کی شاما کے ہاں خرمستیاں دیکھئے۔ گالی گلوچ، ہاتھاپائی سبھی کچھ ہے لیکن وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ ''ہاتھاپائی میں ہانپتے جانا، چھوٹے کپڑوں کو ڈھانپتے جانا۔'' اچھے وقتوں کی ڈیرہ دارنی کے ٹھسّے کی ایک جھلک اس مختصر مکالمے میں نظر آتی ہے جہاں ایک نودولتیا ٹیلیفون پر گذشتہ رات کے ستائیس سو روپے مجرے میں لٹانے کی ڈینگ مارتا ہے تو بڑی بائی کہتی ہے کہ ستائیس سو کی یہاں حقیقت ہی کیا ہے۔ تاہم جو کردار یہاں نظر آتے ہیں ان میں سلیقہ رکھ رکھاؤ جیسی کوئی بات نہیں پائی جاتی، یہاں تو ڈائن کے روپ میں جلوتری ہے کہ بیگم پورئیے اور

شیشے کے بہتے ہوئے خون سے بھی اس کی پیاس نہیں بجھتی۔اب قمر کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کوٹھے پر چلی جاتی ہے کہ اسے تو تازہ خون کی چاٹ لگی ہے یا شاما ہے کہ نواب زادے کی زندگی کا رس نچوڑ لیتی ہے تو پھر اس کی زندہ لاش پر پاؤں رکھتی ہوئی حویلی میں رانی بن کر راج کرنے کے خواب دیکھتی ہے۔ان کے برعکس گوری گلاباں اس باغ کی نخچیر ہے۔وہ ایک نُچی کُھچی ہڈی ہے جسے ایک کے بعد دوسرا گاہک کتا بن کر چوڑتا رہتا ہے۔پھر ایک دن اس کے اندر کی اذیت بغاوت بن کر ابھرتی ہے تو وہ اپنے دلال کے پیٹ میں چاقو گھونپ دیتی ہے۔

اس ماحول میں وہ بات کیونکر پیدا ہو جس کی تصویر کشی امراء جان ادا میں کی گئی ہے، جس کے متعلق سنتے ہیں کہ شہزادوں اور شرفازادوں کو وہاں تہذیب و شائستگی اور مجلسی آداب سیکھنے کے لئے بھیجا جاتا تھا، ان محفلوں میں جس انداز کی گفتگو ہوتی تھی اس کا اندازہ امراؤ جان اور مرزا رسواء کی صحبتوں سے ہوتا ہے۔

حکیم شفاء الملک کے ہاں سنا ہے ایسے مکالمے ہوتے تھے لیکن اس عہد تک تو صرف ''نجو'' کو نجات المومنین کہنے کی بات ہی پہنچی ہے۔

اُس دور میں بھی ضلع جگت وغیرہ کا عام رواج تھا لیکن اس میں رکاکت کم از کم کوٹھوں پر روا نہ رکھی جاتی تھی۔ نچلی سطح پر بھی اس میں ایک لئے دیئے پن کی کیفیت موجود رہتی، کہتے ہیں نواب صاحب گھوڑے پر سوار بازار سے گذر رہے تھے۔ بازار میں کسی گھوڑے کا مول تول چکایا جا رہا تھا، اوپر چوبارے کی بالکنی سے ایک نازنین بھی منظر دیکھ رہی تھی۔ کسی قبیل سے وہ ''پچاسی'' کے نام سے مشہور تھی۔نواب صاحب کی نظر پڑی تو ان کی رگ ظرافت پھڑکی۔ خریدنے والے سے فرمایا'' چلو بھائی پچاسی دلواؤ'' پچاسی کب چپ رہنے والی تھی کہنے لگی: ''نواب صاحب حضور! انصاف نہیں فرمایا۔نواسی دلاتے تو ہم مانتے۔'' اب نواب صاحب کیا کہتے۔لاجواب ہو کر چل دیئے۔

خیر چھوڑیئے اس قصے کو، اس زمانے میں سید عابد علی عابد نے پیرالوئی کی ''افرودائتی'' کا ترجمہ ''داستان'' کے نام سے شائع کیا تھا۔اس میں ایک جگہ جبری اختلاط کا ایک جذباتی یا خواب کا منظر ہے (جیسے میر اثر کی مثنوی ''خواب و خیال'' میں) لیکن رحمان مذنب کے ہاں نوابزادہ اور شاما کی

خرمستیوں میں کہیں ایسے بیانات یا مناظر کی پرچھائیں تک نظر نہیں آتی۔ کلنٹن، لیونسکی کا معاملہ جن دنوں اخباروں کی زینت بنا ہوا تھا، ان دنوں ORAL SEX کی ایک ترکیب لیونسکی نے استعمال کی تھی۔ نوابزادہ اور شاما کا باہمی گالی گلوچ اسی نوعیت کا معاملہ ہے جس کا ذکر رحمان مذنب نے اتنی سنگدلی سے کیا ہے کہ کہیں بھٹیارنوں کی زبان یا بولی ٹھولی کا ذائقہ بھی لبوں پر نہیں آنے دیا۔
تو صاحبو! رحمان مذنب نہ تو جنس نگار ہے نہ فحش نگار، وہ تو ایک مورّخ ہے، ایک مٹتے ہوئے ادارے کا داستاں سرا۔ البتہ اس نے اس ادارے کو اس کے دورِ انحطاط میں دیکھا جب وہ شائستہ وضعداری ختم ہو چکی تھی جس کا ذکر مرزا رسوا کرتے ہیں۔ جس زمانے کا رحمان مذنب نے ذکر کیا ہے اس میں تو خود خوشبودار عورتوں کو احساس ہو چلا تھا کہ وہ اپنی خوشبو کھو چکی ہیں اور ان کے ہاں آنے والے معزز نواب اور رئیس زادے نہیں ہیں، نو دولتیے، شہدے اور انتہائی غیر مہذب مخلوق ہے۔ کہیں کہیں اس گذرے ہوئے دور کا نوحہ بھی ملتا ہے جب کوئی ڈیرہ دارنی اپنی گئی گذری حالت میں بھی یہ دعویٰ کرتی ہے کہ ہم عزت دار لوگ ہیں، کسی کے ہاں چل کر نہیں جاتے، لوگ خود ہمارے ہاں آتے ہیں اور پھر کانونٹ کی نوخیز لڑکیوں پر یوں طنز کرتی ہے کہ وہ کتابیں ہاتھ میں لئے ٹانگے (بسوں) کے اڈے پر خوار ہوتی رہتی ہیں۔

ہاں تو رحمان مذنب نے جنس کو موضوع نہیں بنایا۔ یہ مضمون تو بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے والا قصہ ہے کہ ڈنک پر ڈنک سہنے پڑتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم لیکن حکایت طول کھینچتی ہے تو کوڑا کرکٹ اور غلاظت بھی ساتھ ساتھ چلی آتی ہے۔ رحمان مذنب کے یہاں داستان سرائی کا ایک انداز ہے لیکن یہ وہ انداز نہیں کہ جس میں داستاں گو استاد کو جب کہیں مہینے بھر کے لئے جانا پڑا تو اس نے شاگرد کو اپنی جگہ بٹھایا۔ شاگرد نے عذر کیا کہ اسے داستان تو یاد نہیں، بیان کیا کرے گا۔ استاد نے کہا کہ بس اب برات چلی ہے نا، تو تُو اسے دلہن کے گھر تک پہنچا دینا باقی میں آکر سنبھال لوں گا۔ البتہ کہیں کہیں مثلاً بانو کی برات کا خیالی نقشہ اس قسم کی تفصیلات دکھا جاتا ہے۔ ان کے ہاں خالص بیانیہ اسلوب ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ اس بیان پر مجھے یہ کہہ کر ٹوکا جائے گا کہ تم بیانیہ کے جدید تر مفہوم سے آگاہ نہیں ہو۔ مجھے اپنی کم علمی کا اقرار ہے لیکن جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ رحمان مذنب خالصتاً EXTROVERT ہیں۔ وہ

حکایت کو اس کی لذت کے لئے جو اکثر زبان کے چٹخارے میں ڈھل جاتی ہے، دراز نہیں کرتے۔ واقعات کو بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان واقعات کے درمیان وہ کہیں ذرا ٹھٹھک کر رک جاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کے ہاں مثالیت پسندی کا رجحان ہر سطح پر اپنی شوکت دکھاتا ہے۔ ان کا کوئی کردار ہو، مرد ہو تو شہزادہ گلفام سے کمتر کسی سطح کو قبول نہیں کرتا، کوئی نازنین ہو تو باون تولے پاؤ رتی حسن اور ناز و ادا میں پوری تلتی ہے، کسی کمتر سطح کو قبول نہیں کرتی۔ پنجرے کے پنچھی کا نواب زادہ ہو، نقد وفا کا نواب اسد اللہ ہو یا گل زمان، اور تو اور شیفہ اور قمر جو چڑھتا سورج میں غنڈے کے روپ میں پیش ہوتے ہیں، مردانہ وجاہت کی ایک مثالی IDEAL تصویر ہیں البتہ بازار کے دوسرے مرد کردار یا تو چہرے مہرے سے محروم ہیں یا پھر ان میں پنوں پوتی، کچی شاہ، فیفا سائیں وغیرہ ہیں جو ٹائپ تو کہلا سکتے ہیں لیکن انفرادیت سے محروم ہیں۔ رہی نازنینیں تو کچھ نہ پوچھیئے۔ پرستاں کی پریاں ان سے شرماتی ہیں، اپسرائیں ان سے بچ کر نکلتی ہیں البتہ حوروں سے انہیں کوئی نسبت نہیں۔ ان میں مراتب کا فرق ہو تو ہو لیکن ان کے حسن و جمال میں کوئی فرق نہیں۔ کوٹھے والیاں ہوں یا کنیزیں، شہزادی زرینہ ہو یا گلبدن اور ان کے مقابلے میں ہاؤس کیپر نفیسہ، رخشندہ وغیرہ سب اپنی جگہ لاجواب ہیں۔ اسی طرح مردوں میں غلماں یا مغبچے کی نازک اندامی نظر نہیں آتی۔

یہیں سے ایک نئے مضمون کی راہ کھلتی ہے۔ اس بازار کی روایت میں بھنگی چرسی ہیں تو ساتھ ہی نامی گرامی غنڈے بھی ہیں جن کا حکم بازار میں چلتا ہے۔ ''چڑھتا سورج'' میں ان کا کلی ماجرا پیش کیا گیا ہے اور ضمنی طور پر یہاں میاں صاحب آ جاتے ہیں اور پولیس کے کارندے بھی۔ یہاں ایک تکون بنتی ہے جس کی افقی چوٹی پر غنڈہ نظر آتا ہے لیکن اس چوٹی کو سہارا دینے کے لئے نچلے قاعدے پر ایک زاویے پر میاں صاحب ہیں اور دوسرے زاویے پر حوالدار اور تھانے دار تا ہم یہاں بھی رنڈی بدستور موجود ہے۔ وہ غنڈے کے لئے سہارا بن کر اسے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کیلئے تیار کرتی ہے لیکن اس کی "ہو" کر نہیں رہتی۔ بیگم پوریا ہو، شیفہ ہو یا قمر، وہ تو شطرنج کے مہرے ہیں، جلوتری کھلاڑی ہے۔ ایک مہرے سے دوسرا مہرا اپٹتا ہے تو پٹتا رہے، اسے تو بازی جیتنے سے غرض ہے اور وہ ہر دفعہ بازی جیت جاتی ہے۔

بازی جیتنے کے معاملے میں رنڈی کے لئے صرف یہی ایک میدان نہیں وہ اپنے یاروں

کو بھی مہروں کی طرح چلاتی ہے یا شاید یہاں شطرنج کی بجائے تاش کی بازی کی مثال زیادہ موزوں ہے۔ وہ ٹرپ کا ایک پتہ ہمیشہ چھپا کر رکھتی ہے۔ جلوتری کے ہاتھ میں بیگم پوریا، شیفہ پتے ہی تو ہیں اور قمر بھی، شاما کے ہاتھ میں ہندو بنیا رنگ کا پتا ہے تو ساتھ ہی نوابزادہ دوسرے رنگ کا پتہ ہے اور ان سب پر حاوی ٹرپ کا پتہ دولت رام ہے۔ اس بازار میں لٹنے والے بھی رحمان مذنب کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ان میں ناعاقبت اندیش نوابزادے ہیں تو حساب کتاب سے چلنے والے دولت رام بھی ہیں۔ نو دولتیے اور اوچھے بے کردار لوگ ہیں اور ایک وہ ہیں جو گھر کو آگ لگا کر آگ سینکتے ہیں۔ نواب تھے، نواب زادے تھے، نوکر چاکر ان کے ہاں چلمیں بھرتے تھے۔ اب خود کوٹھے پر پڑے چلمیں بھرتے ہیں۔ یہ کشتگان راہِ وفا ہیں کہ سب کچھ لٹا کر بھی اپنی زبان پر حرفِ شکایت نہیں لاتے۔

یہ تذکرہ تو ہمیشہ نامکمل رہے گا۔ ایک بات ابھی ختم نہ ہوئی ہوگی کہ دوسری شروع ہو جائے گی اور اسی اثناء میں کئی باتیں رہ جائیں گی۔ میں نے بھی کئی باتیں چھوڑ دی ہیں، بعض کی طرف صرف اشارہ کیا ہے البتہ مثالیت پسندی کے سلسلے میں زندہ کرداروں کے ساتھ ماحول کو بھی رحمان مذنب نے اسی درجۂ کمال پر دیکھا ہے۔ مثلاً قدیم شہر کے دروازوں کے باہر سرسبز گھاس کے میدان جن کو لوگ باگ (باغ) کہتے ہیں۔ ان کا بیان پڑھ کر دل میں ہوک اٹھتی ہے کہ ہم ان سے محروم رہ گئے۔ اسی طرح تاراگڑھ ریاست میں بہار کا موسم اور اس کے بعد گرم پانی کے چشموں کا منظر، اور تو اور یہاں تو شیفے کا تانگہ اور گھوڑی بھی اڑن کھٹولہ بن جاتے ہیں۔ یہاں سے پلٹئے تو ایک ایسا منظر دیکھئے جو رحمان مذنب کے نقش گری کے فن پر دلالت کرتا ہے تو ساتھ ہی اپنے اندر تمثیلی رنگ میں اس روایت کا سفرنامہ بھی ہے جس کو رحمان مذنب سا راوی نصیب ہوا ——— افسانہ ''لال چوبارہ'' ———

''چوبارے کی جڑ میں نالی بہہ رہی تھی۔ گلی کے ایک سرے سے بل کھاتی، قریباً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرتی، پست و بلند سے گزرتی دوسرے سرے پر آ کر بازار کے زمین دوز نالے میں جا کر غائب ہو جاتی۔ زندگی کی عجیب و غریب، مخفی اور عیاں داستانیں دن رات نالی کے راستے بہتیں۔ محراب و منبر کا تقدس آوارہ عورتوں کی کوکھ سے نکلی ہوئی ستی غلاظت سے مل کر بہتا۔

یوں لگتا جیسے آسمان اور زمین بغل گیر ہو کر اس میں سے گزر رہے ہوں۔ اونچی اونچی جگہوں پر چڑھ کر عظمت و بزرگی کا اعلان کرنے والوں کی اجلی ہستی کیچڑ بن کر کلبلاتی ہوئی نظر آتی۔ ایمان و اخلاق کے ٹھیکیداروں کا پاکیزہ سرمایہ نام بتائے بغیر ڈبکیاں لیتا لیتا تلف ہو جاتا۔ ترازوئے عدل تھام کر قضیے نمٹانے والے بلند مرتبہ انسانوں کی ننگی روحیں نالی میں غسلِ صحت کرتیں۔

اس چھوٹی سی نالی میں چمکیلی بھڑکیلی موٹریں، نئی نئی اچکنیں، نئے نکورے سوٹ، مسکراتے ہوئے صاف ستھرے بوٹ، زرّیں جوتے، سادہ چپل، پھٹے پرانے لتر، صاف ستھری، میلی کچیلی اور پھٹی پرانی دھوتیاں، کرتے، پاجامے، شلواریں، پگڑیاں، ٹوپیاں، ہیٹ، ننگے سر نورانی اور غیر نورانی چہرے، داڑھیاں، مونچھیں، اُسترے سے چھلی ہوئی کھالیں، تازہ بدن، باسی بدن، تندبدن، ڈھیلے بدن، جوانیاں، بڑھاپے بھی بہتے، سب دیس بہتے، ایمان ہو کہ کفر، یہاں سب کا کام بہنا تھا۔ یہاں جیسے زندگی بہنے کے لئے ہو۔

دن رات نالی بہتی، دن رات، کبھی نہ تھمتی۔ تہجد گزار بھی رات کو چار گھڑی سو رہتا ہے۔ خدا اور اس کے فرشتے بھی دم لیتے ہوں گے لیکن شیطان کب دم لیتا ہے۔ اس کی کارگاہ ہر وقت چلتی ہے۔ وہی شیطان جو کبھی نہیں تھکتا، جو نہ رات کو سوتا ہے نہ دن کو، اسی نے اپنی کارگاہ میں یہ نالی تیار کی ————

غلاظتیں چھٹی چھنتی رہتیں۔ دیوانوں سیانوں، اندھوں بجاکوں، امیروں غریبوں کی دولت اندھادھند بہتی۔ اس نالی پر پوری سماج کا بوجھ تھا۔ کتنا اہم فرض اس کے سپرد تھا!

جن دنوں پانی کا توڑ پڑا، نل سوکھ گئے۔ ندی کی زبان پیاسی ہو گئی۔ ان دنوں بھی یہ نالی اپنا فرض نہ بھولی اور پھر قحط پڑا، لوگ فاقے مرنے لگے تب بھی اس کی تان نہ ٹوٹی۔ یہ اپنا کام کرتی رہی، بہتی رہی۔ اس کے سوتے کبھی نہ سوکھے۔ ہمیشہ سمندر کی طرح بھرپور رہے۔ جس طرح آدمی کناروں سے چھلک جاتے اسی طرح یہ سوتے بھی کناروں سے چھلک جاتے۔

یہ نالی زندگی کے عروج و زوال کی کہانی تھی۔ اس میں ریاکاری یوں چاروں خانے چت پڑی تھی جیسے بدمست شرابی کا پاؤں پھسل گیا ہو۔

مہتروں اور بہشتیوں کا دستہ میڈیکل آفیسر کی ہدایت پر ہر وقت اسے صاف کرتا رہتا

تا کہ غلاظتیں جمع نہ ہو جائیں، ٹھسانہ لگ جائے، روڑا نہ اٹک جائے۔

مشعل پکڑ کر دوسروں کو راہ دکھانے والے اپنی ضمیر کی کرنیں نالی میں بجھا کر چلے جاتے۔ غلاظتیں پیدا ہوتیں اور بہتی رہتیں۔ کون ایسی دنیا کو بے بس کرے جس کی زبان کو عصمت کا لہو چاٹنے کی لت پڑی ہو؟''

''چڑھتے سورج'' میں یہ نالی ایک اور رمز بن کر ظاہر ہوتی ہے ______

''بیگم پوریا ہو یا شیفہ بالآخر'' خون میں لت پت ہو گیا اس کا گرم گرم خون نالی کے پانی کے ساتھ مل کر زوال کی سمت بہنے لگا۔ وہ کیا گرا ایک ریاست، ایک شہر گر گیا جلوتری دوڑی دوڑی نیچے آئی۔ اس نے نالی میں پڑے عظمت و شہرت کے ملبے پر تھوک دیا۔''

تحسینِ جمال میں جو تاثر کی شدّت رحمان مذنب کے ہاں نظر آتی ہے، اسے میں نے ان کی مثالیت پسندی سے تعبیر کیا ہے تو کیا اسی طرح ان افسانوں میں جو تشدد کی واردات جا بجا ظاہر ہوئی ہے، اُسے مصنف کے ہاں SADISM (ایذاء دہی) کا شاخسانہ کہا جا سکتا ہے؟ نورے، شیفے، قمر یا صرف جفرو تک ہی یہ قصہ محدود نہیں۔ گوری گلاباں بھی آخر میں تھمے خاں کے پیٹ میں چاقو گھونپ دیتی ہے اور سب سے بڑی SADIST تو جلوتری ہے کہ خون کو بہہ کر نالی کے گندے پانی میں ملتے ہوئے دیکھ کر اس کو مسرت بخش اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ وہ گرے ہوئے شیفے پر تھوک دیتی ہے اور قمر کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کوٹھے پر چلی جاتی ہے۔

یا پھر نفیسہ شہزادی زرینہ کے ہاتھوں پٹتی ہے۔ نواب اسد اللہ پر گولی چلائی جاتی ہے۔ جواب میں اس کی فائرنگ سے ایک حملہ آور کھیت رہتا ہے۔ نواب حکم دیتا ہے کہ سب مجرموں کو پولو گراؤنڈ میں لے جا کر ان کی گردنیں اُڑا دو۔ شامانفیسہ کی گولی کا نشانہ بنتی ہے۔ اسد اللہ پر تھیئٹر میں ولن فائر کرتا ہے۔ یہ سب کچھ یونہی ہونا فنی طور پر ضروری تھا یا ان کا محرک کوئی نفسیاتی COMPLEX تھا۔ اب فیصلہ کون کرے۔ بہر حال افسانے کے تار و پود میں رحمان مذنب نے ان واقعات کو ڈرامائی انداز میں نبھایا ہے۔

ڈرامے سے رحمان مذنب کو بیحد شغف تھا۔ یہ انکا اپنا اقراری بیان ہے چنانچہ ان افسانوں کی بُنت میں بیشتر واقعات کے عملی پہلو کی داستان ملتی ہے۔ ذہنی یا باطنی عوامل سے تعرض

نہیں کیا گیا اور جہاں تک ہو سکا نفسی عوامل کو عمل میں ڈھال کر پیش کیا گیا ہے۔ منڈوے کی رانی تو خیر ایک ڈرامے کے گرد گھومتی ہے۔ میں سوچتا ہوں اگر عزیز تھیٹر میں "چڑھتا سورج" اور "نقد وفا" کھیلے جاتے تو صوفے والوں سے لے کر چار آنے والوں تک داد کے وہ ڈونگرے برساتے کہ اللہ دے اور بندہ لے اور ڈھنڈورچی اعلان کرتا کہ عزیز تھیٹر کی سٹیج پر ایکشن اور مار دھاڑ سے بھرپور وہ شاہکار کھیلا جائے گا جس کا آپ کو مدتوں سے انتظار تھا۔

ڈرامے ہی کے حوالے سے یہ بات بھی غور طلب ہے کہ رحمان مذنب کے اندازِ نگارش میں لمبے فقرے نہیں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں جن کی وجہ سے بیانیہ کے بہاؤ میں تیزی آتی۔ یہ جملے ڈرامے کے مکالموں کی یاد دلاتے ہیں۔

مکالمہ تب ہی بجتا ہے جب مختصر اور چست ہو۔ وہ اسمیہ جملوں کی بجائے فعلیہ جملوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ افسانے میں جہاں مکالموں کے ذریعہ حکایت بیان کی جاتی ہے وہاں ٹمپو TEMPO بہت تیز ہو جاتا ہے۔ مثالیں نقل کروں تو بات طویل ہو جائے گی۔ مثال کے لئے آپ خود ہی صفحہ ۲۱۳۔۲۱۱ یا ۲۳۰ تا ۲۳۱ پر نظر ڈالئے۔

ان افسانوں میں ایک رونق ہے، گہما گہمی ہے، یہاں زندگی ساکن نہیں ہے۔ یہ STILL LIFE کی مصوری نہیں، یہاں جمود نہیں تحرک ہے، بازار کا منظر کتنا بھرا پرا ہے۔ نائی، سبزی فروش، پان سگریٹ چائے والے اور ان کے سامنے ٹٹ پونجیے تماش بینوں کا بھیڑ بھڑکا، کبھی کبھی نوچیوں کے ادھر سے ادھر جاتے ہوئے پروں کی ان تماش بینوں سے چھیڑ چھاڑ، نوک جھونک بلکہ بھرے بازار میں بیگم پورئیے کے کارندے پر ان نوچیوں کا حملہ یا نازیہ کی ہمسن سے گلی میں لڑائی کا منظر، تنور میں لگے ہوئے کلچوں کی مہک، سری پائے کی دیگوں سے اٹھتی ہوئی اشتہا انگیز مہک، ملک حکیم جی کی شربت کی دکان، یہاں سے نکلئے تو گول باغ میں مثنوی کا درس دینے والے مولوی صاحب کی سریلی آواز اور ان کے گرد عقیدت مندوں کا جمگھٹا، اور تو اور ایک اخبار فروش بھی شہر کے پوش علاقوں کی سرد مہر فضا میں رونقیں بکھیر جاتا ہے، صاحب لوگ تو کم نظر آتے ہیں لیکن بیرے، خانسامے، ڈرائیور خبر کی چاٹ میں اخبار فروش کے گرد جمع ہیں۔ چائے اور مکھن ٹوسٹ سے اس کی خاطر مدارات ہو رہی ہے اور اخبار فروش خبریں نشر کرتا پھرتا ہے۔

رحمان مذنب بالعموم قصے کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کے قائل ہیں۔ کسی ایسے سنسنی خیز مقام پر بات ختم کر دینا جہاں قاری کے دل میں ایک سلگتی ہوئی طلب باقی رہ جائے کہ تکنیک کے وہ رسیا نہیں البتہ کہیں کہیں بین السطور ایسے قصے جنم لیتے ہیں جن کے تعاقب میں قاری کا تجسس کچھ دیر بھٹکتا رہتا ہے۔ مثلاً شیفے کے زوال کے بعد بانو کا کیا بنے گا، کیا میاں صاحب جہیز کے لالچ ہی میں سہی رشتہ قائم رکھیں گے یا پھر قمر بیچ میں آن ٹپکے گا۔ دراصل مختصر افسانے میں اس طرح کے ذیلی قصے کے لئے اصولاً گنجائش نہیں ہوتی۔ بعض جگہ وہ کسی نفسیاتی رمز کے لئے خلا چھوڑ دیتے ہیں کہ قاری اپنے سلیقے سے اسے خود پر کرے۔ مثلاً یہی شیفے اور قمر کا قصہ ہے۔ آخر شیفہ ابتداء میں کیوں قمر کے لئے اپنے سینے میں ایک نرم گوشہ محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے دشمن کے بھانجے یا بھتیجے کو اپنی بہن کے بر کی صورت میں قبول کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ وہ قمر کو بزورِ بازو نہیں بلکہ روباہی سے چت کرنا چاہتا ہے۔ کہتے ہیں کہ غنڈہ دراصل بزدل ہوتا ہے، اس کی بڑھک اس کے سینے میں دبے ہوئے خوف کے لئے ایک والو VALVE کا کام دیتی ہے۔ شیفہ اندر ہی اندر قمر سے خوفزدہ ہے۔ اسے اپنے زوال کا لمحہ اس کی صورت میں متشکل ہوتا نظر آ گیا ہے۔

اسی حوالے سے یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ان افسانوں میں معاشرتی اقدار سے کہیں براہِ راست تعرض نہیں کیا گیا۔ ان افسانوں میں تو سراسر تخریب ہی تخریب ہے کہ یہاں اخلاقی اقدار کا گذر ہی کہاں ہے۔ رنڈی کا ادارہ وفا سے نا آشنا ہے تاہم یہاں شاما کے مقابلے میں نفیسہ اگرچہ بگڑے ہوئے نوابزادے کی زخم خوردہ ہے لیکن اس کا خاندان نواب زادے کے پشتینی نمک خواروں کا خاندان ہے۔ حقِ نمک ادا کرنے کی خواہش اس کے اندر برابر پلتی رہتی ہے تا آنکہ وہ شاما کو قتل کر کے نوابزدے کو پھانسی کے پھندے پر جھول جانے سے بچالیتی ہے۔ آخر یہ خون تو کسی نے اپنے سر لینا ہی تھا، نقد وفا میں یہ موضوع اپنی جملہ تقریبات کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔ نواب اور رخشندہ دونوں اسی قدر کے نمائندہ ہیں۔ جس کو مادی جدلیات کی معاشرتی تعبیر بورژوائی بزدلی کہتی ہے تاہم انسانیت اس سے دست بردار ہونے کو اب بھی تیار نہیں، لفظ وفا اب بھی کبھی کبھی شرمندۂ معنی ہو جاتا ہے۔ اسی حوالے سے کھچی شاہ کا مزار اور اس پر مجاہد بٹھانے کا منصوبہ جب اس گلی کے باسیوں کی مزاروں سے عقیدت کے پس منظر میں دیکھا جاتا ہے تو طنز کا نشتر بن جاتا ہے۔ گول

باغ میں مثنوی کا درس دینے والے خوش گلو مولوی صاحب کی جگہ جب کرخت آواز والا۔ ''حرام حرام'' کی گردان کرتا ہے تو قاری ایک دوسرے طور کی طنز سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

اب آپ کی باری ہے۔ افسانے پڑھیے، پڑھتے رہیے کہ یہ پڑھے جانے کے لئے ہیں۔

O

رحمان مذنب کے افسانوں کا مجموعہ ''پنجرے کے پنچھی'' کا دیباچہ

مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے

انتظار حسین

○

مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے اسلام کا ایک تہذیبی طاقت کے طور پر مطالعہ پیش کرتی ہے۔ اس بارے میں کہ اسلام کا رویہ سائنس اور فنونِ لطیفہ کے بارے میں کیا ہے، بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، طہارت پسند مسلمانوں کے حلقہ میں بھی اور بیرونی حلقوں میں بھی مگر یہاں مصنف کے پیشِ نظر طہارت پسند مسلمان نہیں ہیں بلکہ وہ بیرونی حلقے ہیں جو مسلمانوں کو سائنس دشمن اور آرٹ دشمن سمجھتے ہیں۔ مصنف نے مغربی مورخین ہی کے حوالوں سے اس تصور کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ علم وفن کو کس طرح سے مسلمانوں کے تخلیقی جذبے نے فروغ بخشا اور یہ کہ انسانی تاریخ میں اس قوم نے کیا کردار ادا کیا۔ چونکہ اس کتاب کے مخاطب اولاً مغرب کے لوگ ہیں اس لئے اس کا انگریزی میں لکھا جانا سمجھ میں آتا ہے۔ انگریزی میں یہ کتاب GLORIES OF ISLAM کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اب رحمان مذنب نے اسے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ سلیس ورواں ہے۔ رحمان مذنب صاحب نے دقتوں پر جوایسی کتاب کے ترجمہ میں پیش آتی ہیں خوش اسلوبی سے قابو پایا ہے۔ ساتھ میں انہوں نے حاشیے بھی دیئے ہیں جو ایک عام قاری کے لئے اس کتاب کو مزید قابلِ فہم اور مفید بناتے ہیں۔

............O............

تبصرہ، روزنامہ "مشرق"، ۱۰، اکتوبر ۱۹۷۱ء

ارسطو کی بوطیقا کا پنجابی میں ترجمہ

میرزا ادیب

بوطیقا یونان کے بے مثال فلسفی ارسطو (۳۲۲ ــــــ ۳۸۴) کی ایک ایسی تصنیف ہے جس نے دنیا بھر میں لکھی جانے والی تنقید کو کم وبیش بائیس صدیوں سے متاثر کئے رکھا ہے اور اب بھی فنِ شاعری اور فنِ تمثیل کے پرانے اصولِ تنقید کا ذکر کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے جس کتاب پر نظر پڑتی ہے وہ بوطیقا کے علاوہ اور کوئی کتاب نہیں۔ بوطیقا کی اثر اندازی کا یہ تسلسل ایک حیرت انگیز حقیقت کا مظہر ہے۔

بوطیقا، انگریزی میں اسے POETICS کہا جاتا ہے، اس کا اردو میں پہلی بار ترجمہ ۱۹۴۱ء میں پروفیسر عزیز احمد نے کیا تھا۔ کتاب کی پیشانی پر بوطیقا کے نیچے فنِ شاعری کے لفظ بھی درج ہیں۔

بھارت میں اس کا ترجمہ شعریات کے نام سے ۱۹۷۸ء میں ہو چکا ہے۔ اس کا ترجمہ وتعارف شمس الرحمان فاروقی نے کیا ہے اور دنیا میں شائد ایک بھی ایسی ترقی یافتہ زبان نہیں ہوگی جس کا دامن بوطیقا کے ترجمے سے محروم ہو۔ حال ہی میں اسے پنجابی زبان میں رحمان مذنب نے منتقل کیا ہے۔ اس پنجابی ترجمے کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ مترجم نے جابجا حواشی اور تلمیحات دے کر ترجمے کی افادی وسعت میں نمایاں اضافہ کر دیا ہے۔

رحمان مذنب نے اپنے ترجمے میں شروع سے لے کر آخر تک اس بات کا بطورِ خاص اہتمام کیا ہے کہ جہاں کہیں بھی کسی ضمیاتی کردار یا واقعے کا ذکر ہوا ہے تو اس کی باقاعدہ تشریح فٹ نوٹ میں کر دی ہے تا کہ ان کے قاری کو عبارت کے کسی حصے کی تفہیم میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ نیز انہوں نے کتاب کے شروع میں چالیس صفحات پر پھیلے دو چار گلاں (دو چار باتیں) کے عنوان سے ایک طویل، .... مفصل دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں ارسطو، اس کے زمانے اور اردو کے شعر و تمثیل کے صفحات پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ اس دیباچے کی اپنی ایک الگ اہمیت ہے۔

رحمان مذنب کا تعلق اہلِ قلم کی اس نسل سے ہے جو رواں صدی کی چوتھی دہائی میں

منظر عام پر آئی تھی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو انہیں تخلیقی کام کرتے ہوئے نصف صدی بیت گئی ہے۔ گویا بقول حفیظ جالندھری مرحوم

یہ نصف صدی کا قصہ ہے ۔ دو چار برس کی بات نہیں

مذنب کا افسانہ ''پتلی جان'' جب شائع ہوا تو اردو ادب کے قارئین میں ایک سنسنی سی پھیل گئی تھی۔ مذنب پہلے قلم کار ہیں جنہوں نے پہلی مرتبہ تیسری جنس کے حالات و واقعات کے متعلق ایک بھرپور مطالعہ پیش کیا ہے۔

یہ افسانہ..........اردو کے شاہکار افسانوں کی فہرست میں شامل ہوتا ہے۔

مذنب نے ۱۹۷۱ء مولوی نور احمد کی معرکۃ الآرا تصنیف کا ترجمہ ''مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے'' کے نام سے کیا تھا۔ اسے گلڈ انعام بھی دیا گیا تھا۔

مذنب کا اصل میدان ''تحقیقات '' ہے۔ ماضی کے ادوار میں چھپے ہوئے حقائق کی نشان دہی ان کا پسندیدہ فریضہ ہے۔ وہ پرانے رسم و رواج، نسلِ انسانی کے مذہبی، معاشرتی اور تہذیبی تصورات کا کھوج لگاتے رہتے ہیں۔ جادو طلسم سے وابستہ ابنِ آدم کے آباؤ اجداد کے کیا عقائد تھے۔ اس سلسلے میں ان کی ایک معتمد تصنیف موجود ہے۔

علاوہ ازیں مذہبِ یونانیات کے بھی اچھے خاصے ماہر ہیں۔ آج سے کئی سال پیشتر انہوں نے یونانی ڈرامے کے ابتدائی عناصر پر ایک مقالے کی کئی قسطوں میں معلومات افزا بحث کی تھی۔

حلقہ اربابِ ذوق کے بنیادی رکن کی حیثیت سے بھی ان کا تشخص قائم رہتا ہے۔

بوطیقا کا پنجابی زبان میں ترجمہ چھپا تھا تو میرے ایک دوست نے شکایت کی کہ مذنب نے یہ کام اردو میں کیوں نہیں کیا۔ میں نے ان سے استفسار کیا تھا کہ اگر اسے اردو کی بجائے پنجابی میں کیا گیا ہے تو کس بنا پر ان کی یہ کوشش قابلِ تحسین نہیں ہے!

اول تو اس کا ترجمہ اردو میں ہے۔ دوبارہ بھی کیا جاسکتا ہے بالخصوص حواشی کے ساتھ۔ مگر پنجابی بھی تو ہماری اپنی ہی زبان ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ مجھے مذنب کے اس کام کی دلی خوشی ہوئی ہے۔ کم از کم اس سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ پنجابی میں کتنی وسعت ہے۔ اس سے پہلے شریف کنجاہی نے علامہ اقبال کے خطبات کا ترجمہ کر کے پنجابی زبان کی وسعت کا عملی مظاہرہ کیا تھا۔ میرے سامنے اس وقت تینوں ترجمے پڑے ہیں۔

عزیز احمد نے اپنے ترجمے بوطیقا —— فن شاعری میں کتاب کے پانچ حصے مقرر کیے

ہیں،اوران کی تفصیل یہ ہے۔

پہلا حصہ: شاعری پرایک عام اور بالموازنہ نظر،شاعری کی خاص قسمیں

دوسرا حصہ : ٹریجڈی

تیسرا حصہ: رزمیہ شاعری

چوتھا حصہ: نقادوں کے اعتراض اوران کے جواب دینے کے اصول

پانچوں حصہ: ٹریجڈی رزمیہ شاعری سے افضل ہے

اس کے بعد چھٹا حصہ ہے۔ یہ ضمیمہ ہے،اوراس میں اشارات وتلمیحات دئے گئے ہیں۔

''شعریات''اورشمس الرحمان فاروقی میں دیباچہ، مترجم اور تعارف از مترجم کے علاوہ ۱۲۶ابواب ہیں۔

یہاں یہ بات بھی کہہ دوں کہ یہ دونوں ترجمے انجمن ترقی اردو نے شائع کئے ہیں۔ بوطیقا کا ترجمہ انجمن ترقی اردو نے اس وقت پیش کیا تھا جب یہ برصغیر میں اس نام کی واحد جماعت تھی اور شعریات ۲ کا ترجمہ انجمن ترقی اردو بھارت نے چھاپا ہے۔

رحمان مذنب کے ترجمے میں دیباچہ (دوچار گلاں) کے علاوہ ۱۲۶ابواب ہیں۔

شمس الرحمان فاروقی نے ایس۔ایچ۔ بچر کو بنیاد بنا کر ترجمہ کیا ہے۔ رحمان مذنب کے پیش نظر بائی واٹر کا انگریزی ترجمہ رہا ہے۔ پروفیسر عزیز احمد نے مختلف انگریزی ترجموں سے مدد لی ہے اور بچر کے ترجمے کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔

میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ رحمان مذنب کے پنجابی ترجمے کی حقیقی خوبی یہ ہے کہ ایک تو انہوں نے وہ زبان استعمال کی ہے جو ہم لوگ شہروں میں بولتے ہیں۔ یہ زبان عام ہے، سمجھی جاتی ہے اور دوسری خوبی اس کے معلومات افزا حواشی ہیں۔

بوطیقا میں پنجابی ترجمہ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے اکادمی ادبیات پاکستان کے تعاون سے شائع کیا ہے۔

o

مطبوعہ روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور، ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۹ء

خوشبودار عورتیں

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اردو کے افسانوی ادب میں طوائف اور جنسی بے راہ روی کو موضوع بنا کر سعادت حسن منٹو اور رحمان مذنب نے نام پیدا کیا۔ جب کہ موضوعی سطح پر ان دونوں کے افسانوں میں نمایاں فرق ہے، جسے مدنظر نہیں رکھا جاتا۔ نیز ان کے علاوہ دو بہت اہم نام اور بھی ہیں یعنی آغا بابر اور واجدہ تبسم، جنہیں منٹو اور رحمان مذنب پر بات کرتے ہوئے ضرور زیرِ بحث لانا چاہیئے۔ نیز راجندر سنگھ بیدی کا ''کلیانی''، غلام عباس کا ''آنندی'' اور 'ممھنور' رشید جہاں کا ''سودا'' احمد ندیم قاسمی کا ''کنجری'' اور عصمت چغتائی کا ''مٹھی مالش'' چند ایسے افسانے ہیں، جنہیں اس خصوص میں بات کرتے ہوئے دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔

اچھا یا برا لکھنے کی بات نہیں، رحمان مذنب کے مقابل سعادت حسن منٹو، جسے اس خصوص میں حد درجہ شہرت ملی کا موازنہ و مقابلہ رحمان مذنب سے بنتا ہی نہیں۔ وہ یوں کہ منٹو نے طوائف کے متعلق افسانے کا ماڈل موپاساں سے مُستعار لیا اور اس سے سرِ مُو انحراف نہ کیا۔ موپاساں کا پہلا معروف افسانہ ''چربی کا گولا'' (Boul Desuif:،1980) ایک طوائف کی تذلیل سے متعلق افسانہ ہے۔ ایک ایسی طوائف، جس نے طوائف کی سطح سے اُوپر اُٹھ کر عورت بننے کی آرزو کی اور اس کے بعد موپاساں نے کم و بیش اپنے تمام افسانوں میں طوائف اور عورت کے مابین جنم لینے والی اسی کش مکش کو اپنا موضوع بنائے رکھا۔ غور کیا جائے تو اس کا ایک نفسیاتی سبب بھی تھا۔ موپاساں کے رنگین مزاج باپ کے نت دن کے معاشقوں نے گھریلو زندگی کو تلپٹ کر دیا تھا۔ والدہ اور والد کی علاحدگی موپاساں کے لیے ایک بڑا دھچکا تھا، جس کے نتیجہ میں وہ اپنی والدہ

کو گستاؤ فلابیر کی رکھیل کی صورت تو برداشت کر لیتا ہے لیکن والد کی رنگین مزاجی (جس کے سبب یہ سب کچھ ہوا) اُس کے لیے ہمیشہ ناقابل برداشت رہی۔ جب کہ خود اُس نے ساری زندگی وہی کچھ کیا جو اس کے والد نے کیا تھا۔ منٹو کی جُملہ فطرت نگاری، موپاساں کے وضع کردہ افسانوی ڈھانچے پر کیوں کھڑی رہی، اس کی وجوہات پر غور کرنا ابھی باقی ہے۔ دوسرا یہ کہ منٹو نے بے شک طوائف کے شب و روز کا مطالعہ بمبئی اور لاہور میں کیا، لیکن طوائف سے قربت کا دعویٰ اُس کے افسانوں سے اُس طرح ثابت نہیں ہوتا، جس طرح رحمان مذنب کے ہاں ملتا ہے۔ یوں منٹو کی طوائف ہمہ وقت اپنے کھوئے ہوئے منصب کے حصول کے لیے تڑپتی اور کلبلاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور رحمان مذنب کی طوائف (نکیائی، خانگی یا ڈیرہ دارنی) کو وہ کھویا ہوا منصب یاد نہیں رہا۔ شہوت میں بھنتے ہوئے گاہک اسے چین سے رہنے دیں تو شاید وہ کچھ سوچ سکے۔

رحمان مذنب، آغا بابر اور واجدہ تبسم، تین ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے طوائف اور عورت کی اُس کش مکش (جو منٹو سے مخصوص رہی ہے) کو اپنے افسانوں کی مجبوری نہیں بنایا۔ یوں رحمان مذنب کا مقابلہ و موازنہ منٹو سے نہیں، آغا بابر اور واجدہ تبسم سے کرنا پڑے گا۔ آغا بابر جن کا تجربہ اور بیان، مغنیاؤں اور ناچنے والیوں کی بیٹھکوں سے متعلق حیران کُن ہے۔ انہیں رقص و موسیقی سے نہ صرف عشق تھا بلکہ اِس خصوص میں ان کی معلومات اُردو کے ہر ایک افسانہ نگار سے زیادہ تھیں۔ بیشک اس میں غلام عباس کو بھی شامل کر لیجیے، جن کا جنم ہی اس ماحول میں ہوا۔ افسوس کہ آغا بابر نے اس موضوع اور ماحول پر افسانے کم لکھے۔ جہاں تک واجدہ تبسم کا معاملہ ہے تو انہوں نے جنسی بے راہ روی پر بہت لکھا۔ ''اُترن'' اور ''نتھ اُترائی'' کی صورت بہت اچھا بھی لکھا، لیکن محض حیدر آبادی حدود و قیود میں رہ کر۔ اس طرح رحمان مذنب، آغا بابر اور واجدہ تبسم سے یوں بھی زیادہ اہمیت حاصل کر جاتے ہیں کہ انہوں نے طوائف کے مختلف روپ نہ صرف قریب سے دیکھے بلکہ اس پر تسلسل سے لکھا۔ خانگی، نکیائی، رقاصہ، مُغنیہ اور ڈیرہ دارنی کا فرق ملحوظِ خاطر رکھ کر۔

رحمان مذنب کے افسانوں میں چکلے کی پُر پیچ روشن و نیم روشن گلیاں، بام و در، مَوتیا اور چنبیلی کے گجرے، دلالوں سے خفیہ و اعلانیہ بھاؤ تاؤ، کُچلی اور مَسلی ہوئی اَدھ کِھلی جوانیاں، پان کی پیک کے چھینٹے، تعفن، تنفس کے اُلجھاوے، کھانسی کے طویل دورے، کھوکھلے قہقہے، ڈھلکے ہوئے

مدقوق چہرے اور بے باکانہ گفتگو، غرضیکہ سب کچھ ہے، اور ایسے میں کہانیاں جنم لیتی ہیں، حقیقت سے قریب اور اُس ماحول سے جُڑی ہوئی۔ ہمارے دیگر فطرت نگار افسانہ نگاروں کے ہاں نکیائیوں، نوچیوں، خانگیوں، ڈیرہ دارنیوں اور لُچی لفنگی عورتوں میں فرق نہیں، جب کہ رحمان مذنب کے افسانوں میں اِس فرق کو باریکی سے ظاہر کیا گیا ہے۔ پھر اس خصوص میں رحمان مذنب کے تحریر کردہ افسانوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ''پتلی جان''، ''بالا خانہ''، ''رام پیاری'' اور ''خوشبودار عورتیں'' کے علاوہ غیر مرتب حالت میں کم وبیش ان کے تین دیگر افسانوی مجموعوں کا مواد اشاعت کا منتظر ہے۔

چکلے سے متعلق افسانوں کا یہ اتنا بڑا خزانہ رحمان مذنب کے ہاتھ یوں آیا کہ لاہور ٹکسالی دروازے کی اونچی مسجد سے ملحقہ مکان میں اُن کی جائے پیدائش ایسی تھی کہ ادھر عشاء کی اذان کان میں پڑی، اُدھر مغنیہ نے تان لگائی۔ یہ بادشاہی مسجد، لاہور کے داہنی طرف کا علاقہ ہے۔ گھر سے فرلانگ بھر کے فاصلہ پر عزیز تھیٹر تھا، جہاں سارا سال ناٹک منڈلیوں کی آمدورفت رہتی۔ عزیز تھیٹر سے متصل ہیجڑوں کی بیٹھکیں تھیں اور چند قدم پر نکیایوں کی گلی، ٹبی۔ ڈیرہ دارنیوں کا بازار چند قدم پر تھا۔ اطراف و جوانب میں عطار خانے، جوتشیوں کے اڈے، تکیے، جُوا خانے اور چنڈو خانے تھے۔ ہر ہائی نس اقبال بیگم، استاد بڑے غلام علی خان، استاد برکت علی خاں، مبارک علی خان، استاد عبدالوحید خان کیرانے والے، استاد عاشق علی خاں پٹیالے والے، عنایت بائی ڈھیروالی اور خورشید بائی ہجروالی، سبھی کا قیام یہیں تھا۔ خود عزیز تھیٹر سے منسلک رہنے کا ثبوت، رحمان مذنب کا تحریر کردہ ڈراما ''جہاں آراء'' ہے جو 1934ء میں لکھا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ رحمان مذنب کے والد مفتی عبدالستار کا تعلق بادشاہی مسجد سے تھا اور اُن کا فتویٰ چلتا تھا۔

یاد رہے کہ رحمان مذنب کے لڑکپن اور جوانی تک لاہور کی مختلف آبادیوں میں نکیائیاں، خانگیاں اور ڈیرہ دارنیاں آباد تھیں۔ بالخصوص انارکلی، دھوبی منڈی، لوہاری گیٹ، لنڈا بازار، دہلی دروازہ، کوچہ شہباز خان، شالامار روڈ، موتی بازار اور قلعہ روڈ پر چکلے قائم تھے، جنہیں انجمن اصلاح بدکاراں، لاہور کی تحریک پر 1921ء میں میونسپل کمیٹی، لاہور نے بے دخلی کے نوٹس دے کر 25 اگست 1922ء میں ختم کیا۔ 1942ء میں یہی کارروائی دہلی میں ہوئی تو غلام عباس نے ''آنندی'' لکھا۔

رحمان مذنب کے افسانوں میں جتنے بھی جُوا خانے، تکیے اور چنڈو خانے ظاہر ہوتے ہیں، وہ سب کے سب اُن کے روزمرہ مشاہدے میں رہے ہیں اور لاہور کے جُملہ چکلے ان کی دن رات کی گزرگاہ۔ رحمان مذنب کا کمال یہ ہے کہ پیشہ کرانے والی ہر طرح کی عورت اور شہوت میں پُھلتے ہوئے افراد کی نفسی کیفیات کے ساتھ انھوں نے ماحول کی جزئیات، تمام و کمال سمیٹ لی ہیں۔ مثال کے طور پر ''خوشبودار عورتیں'' میں شامل افسانہ ''اُودھم پور کی رانی'' کا مرکزی کردار سلطانہ ہے، جو ڈیرہ دارنی اور نکیائی کی درمیانی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔

''اگر ڈیرہ دارنی اور نکیائی کے درمیان میں کوئی چیز ہو سکتی تھی، تو وہ سلطانہ تھی۔ جس نے ہوشیار پور میں پورا ہوش سنبھالا۔ وہیں پلی، بڑھی، جوان ہوئی۔ اُس کی آواز اور بدن کے ساز، دونوں میں سات سُر لگ گئے پھر بھی وہ بے سُری رہی۔ ٹھمریوں کے نگر میں رہتے ہوئے بھی ٹھمری نہ گا سکی اور گا بھی سکتی تو سننے کا یارا کسے تھا؟''

سلطانہ، اودھم پور کے محلات سے بطور ڈیرہ دارنی ہوتی ہواتی ایک خانگی کی صورت لاہور وارد ہوئی تو علاؤ الدین عرف لاوا اور مستری دین محمد تک پہنچی۔ لاوا، جو پہلے برف بیچتا تھا، اُس سے مل کر چکلے کا غنڈہ بن گیا۔ پہلے تو اس نے چائے خانہ کھولا اور اس کے بعد چرس بیچنے لگا۔ جب کہ مستری دین محمد لکھ سے لکھ ہو گیا۔ سلطانہ نے لاوے کو مستری دین محمد سے ٹکرایا تھا، یہ اُس کا شاخسانہ ہے۔ اُن دونوں کا ٹکراؤ، سلطانہ کی تریا ہٹ ہے، جو تریا راج میں ڈھلنے کو بے قرار ہے۔ یوں لاوے نے مستری دین محمد کو سلطانہ کی چوکھٹ سے بھگا دیا۔ اس افسانے کا چوتھا اہم کردار راوی کا ہے، ''میں'' کے عنوان سے، جو افسانے کے نصف اوّل میں تو ایک معمولی سا کردار ہے لیکن آگے چل کر عزیز میاں کے نام سے ایک غیر معمولی کردار میں ڈھل جاتا ہے۔ راوی کے اس کردار کا ایک بیان ملاحظہ ہو:

''کوئی شوخ، چنچل زیادہ ستاتی تو وہ آنکھیں جھکائے کہتے: ''یہاں کچا پکا نے نہیں آئی جو یوں کلکل لگا رکھی ہے تو نے، صبر کر۔''

سلطانہ، اس کردار سے اپنی بیٹی نادراں کی شادی کی خواہش مند ہے جبکہ وہ عیاشی تو خوب کرتا ہے لیکن نادراں سے عقد کے لیے تیار نہیں۔ یہ سفید پوش طبقے کا نمائندہ کردار ہے، جسے

کرنا کرانا بھی سب کچھ ہے لیکن ماں باپ کی عزت بھی عزیز ہے۔

اس کردار کے متوازی ایک سفید پوش ہے، منشی الٰہی بخش۔ جو کمزور ہونے کے باوجود محض منافقت کے زور پر طاقت حاصل کرتا ہے لیکن سلطانہ کی شاطرانہ چالوں کے سبب مات کھا جاتا ہے۔ پھر سلطانہ کا ملازم عبدالخالق، جوانی کے زور پر اٹھتا ہے اور اسی گھر کی لڑکی ثمینہ کو بھگا لے جاتا ہے۔ لاوے کی موت اُسی کے ہاتھوں لکھی تھی۔ یہ سارے کے سارے مختلف النوع نفسیات کے حامل کردار ہیں جو ایک خانگی (سلطانہ) سے قربت کے سبب بنے یا بگڑے۔ ان سب کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ ہی اس افسانے کا حاصل ہے۔ جب کہ افسانہ بظاہر نا تمام دکھائی دیتا ہے۔ افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ افسانے کے اختتام پر اودھم پور کی جانب ایک اشارہ کر کے مرکزی کردار (سلطانہ) کے آگے بڑھنے اور پھیلنے یا پیچھے ہٹ کر سکڑنے اور سمٹنے کے امکانات روشن کر گیا۔

افسانہ ''پھر کی'' میں گھر داری کا ماحول اور گلی محلے کی فضا ایسی ہے کہ کوئی دوسرا افسانہ نگار اسے کیا لکھے گا۔ خاص طور پر مائی مالاں، لال شاہ، اسلم درزی، شاہی نجومی جوتشی رملی پروفیسر خیر دین، قدرت اللہ عطار، پھر کی، نتھی اور سدرو کے کردار رحمان مذنب کے دیکھے بھالے ہی نہیں برتے ہوئے برایا کے ایسے باشندے ہیں جو انھی کے افسانوں سے مخصوص ہیں:

''آنگن میں چُپ کی اُداسی پھیل رہی تھی۔ نتھی، دیوار سے لگ کر پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ سدرو کی بے وفائی کے باعث اس کے ہاتھ سے طاقت کا توازن نکل چکا تھا۔ جوگاں، سر اٹھائے، ہرنی کی سی آنکھیں کھولے، چارپائی پر بیٹھی تھی۔ سدرو، اچار سے روٹی کھا رہا تھا۔ کسی کو کسی سے سروکار نہ تھا۔ پھر کی، اُوپر چلی گئی۔''

یاد رہے کہ یہ وہی نتھی ہے، جس کی آنکھوں سے کچھ دیر پہلے انگارے برس رہے تھے اور بدن بجلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ وہ بغیر الٹی میٹم دیے، جوگاں کے گلے کچھ اس طرح آپڑی تھی کہ وہ بدحواس ہوگئی۔ لیکن سدرو نے خلاف توقع اسے چٹیا سے پکڑ کر پہلے تو زمین پر گرایا اور اس کے بعد گھسیٹ کر کمرے میں لے جانے کے بعد اسے یوں پیٹا جیسے دھوبی پڑے پر پٹخ پٹخ کر کپڑے دھوتا ہے۔

لگے ہاتھوں لاجواب کردار نگاری کے ساتھ نفسی کیفیات کی ایک جھلک بھی دیکھتے چلیے:

''پھر کی، تم پہیلی ہو

اور پھر یہ پہیلی بڑے زور سے سلام کے دماغ میں گھومنے لگی۔ جذبات بُری طرح اونٹنے اور بھاپ کی طرح گردش کرنے لگے۔

سلام جس قدر بے کل تھا، پھرکی اُسی قدر مطمئن تھی۔ مزے سے چائے کی پیالی اور کیک کی قاشیں ہضم کیے جارہی تھی۔ مَیل خورے گلابی رنگ کی شلوار پہنے تھی۔ انگلیوں پر چاندی کی انگوٹھیوں کے نگینے چمک رہے تھے۔ لونگ کا لشکارا مچل رہا تھا۔ یُوں تو وہ اُس وقت چُپ بیٹھی تھی لیکن محسوس ہوتا تھا جیسے سلام کے گرم گرم، جلتے سلگتے ہوئے جذبات کے بگولوں میں قہقہے چھوڑ رہی ہو۔''

یہاں سبحان اللہ کے علاوہ کیا کہا جاسکتا ہے۔

یہ تو ہوا اُسی بازار اور کردار نگاری کے حوالے سے اس مجموعے میں شامل رحمان مذنب کا منفرد لحن اور لاثانی کام۔ اب آگے بڑھتے ہیں۔ ''خوشبودار عورتیں''، ''افلاس کی آغوش'' اور ''خوشبو کا دھواں'' بھی فطرت نگاری سے متعلق افسانے ہیں۔ ان تینوں کے مرکزی کردار بھی لچی عورتیں ہیں۔

''خوشبودار عورتیں'' کی نجم النہار کا خاوند پی ڈبلیو ڈی کا سُپر وائزر تھا اور اُس نے کمایا بھی خُوب۔ اُس کی ہمسائی راجاں، ایک مُفلس کو چوان کی بیوی ہے۔ ایک طرف دولت کی ریل پیل ہے اور دوسری جانب مفلسی۔ راجاں، برابر کے گھر میں دولت کی چکا چوند سے گمراہ ہوئی۔ یاد رہے کہ یہ افسانہ ستر کی دھائی میں لکھا گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بیانیہ افسانہ لکھنے والے نمایاں افسانہ نگاروں، خصوصاً عصمت چغتائی، ممتاز مفتی، آغا بابر، اشفاق احمد، احمد شریف، احمد ندیم قاسمی اور رحمان مذنب کو میرے ساتھیوں کی تازہ دم کھیپ کا سامنا کرنا پڑا۔ بالخصوص راول پنڈی گروپ کے علامتی افسانہ نگار اُس زمانے میں اپنی اپنی الگ شناخت بنانے کی خاطر از حد متحرک تھے، کانٹے کا مقابلہ تھا اور یہی وہ زمانہ ہے جب ان نئے افسانہ نگاروں کا بہترین کام سامنے آیا۔ میری مراد رشید امجد، منشا یاد، مظہر الاسلام، احمد داؤد، احمد جاوید اور یوسف چودھری سے ہے۔ اسی طرح انور سجاد، خالدہ حسین، سمیع آہوجا، ظہور الحق شیخ، ذکاء الرحمن، علی تنہا، انور سن رائے، شمس نغمان، نجم الحسن رضوی اور کمال مصطفےٰ بھی از حد متحرک دیکھے گئے۔ اُدھر بھارت میں بلراج مین را، جوگندر پال اور سریندر پرکاش کے بعد سامنے آنے والوں میں اکرام باگ، احمد یوسف، قمر احسن، شفق، حمید سہروردی، سلام بن رزاق، احمد عثمانی، احمد تنویر، انور قمر، بدیع الزّماں، حسین الحق، علی امام،

فیروز عابد، صادق مولٰی، ممتاز یوسف اور شعیب شمس غرضیکہ بہت سے نام تھے جو علامتی، تجریدی، استعاراتی اور تشبیہاتی افسانے لکھ رہے تھے اور اس نئی تدبیر کاری کے مقابل بیانیہ افسانہ لکھنے والوں کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یعنی ایک تو یہ کہ وہ عصمت چغتائی کی طرح ''سانپ کے تلوے'' لکھ کر اور ممتاز مفتی کی طرح نئے افسانہ نگاروں کے افسانوں سے پیراگراف اُچک کر مضحکہ اُڑانے کی خاطر افسانے ترتیب دیں یا نئے افسانہ نگاروں کے رنگ میں رنگ جائیں۔ رحمان مُذنب نے دوسرا راستہ چُنا اور ''خوشبودار عورتیں'' لکھا۔ عصمت چغتائی اور ممتاز مفتی کے بر عکس یہ ایک مثبت رویّہ تھا۔

''افلاس کی آغوش'' کی بلّو، ننھّی دھوبن اور بے نام گڑوی بجانے والی بھیل لڑکی۔ یہ ساری کی ساری معاشی تنگ دستی کی پیداوار ہیں اور جاگیرداروں کے بستر کے کھلونے۔ جبکہ اختر بائی، سو چھنالوں کی ایک چھنال ہے جو مردوں کو زیر کرنے والے داؤ بڑی صحت سے موقع دیکھ کر کھیلتی ہے۔ کبھی دل لبھانے کو قریب آ کر دل کی دھڑکن بن جاتی ہے اور کبھی ترسانے کو کوسوں دُور نکل جاتی ہے۔ لیکن یہ سارے کے سارے کردار افسانے میں زبیدہ کے کردار کو اُبھارنے کے لیے تراشے گئے ہیں۔ جملہ کرداروں سے اس ایک کردار کا موازنہ ہی اس افسانے کا موضوع خاص ہے۔ اِس کے برعکس ''خوشبو کا دھواں'' کی یاسمین کا کردار کبھی تو تاج بی بی کے کردار میں ڈھل جاتا ہے اور کبھی اپنے قالب میں سمٹ جاتا ہے۔ لیکن حالات کا دھارا اسے بالآخر ایک کال گرل میں بدل دیتا ہے۔ اُس کی نتھ اُترائی کی رسم ایک بوڑھے زمیندار سے انجام پاتی ہے اور وہ اس نئی زندگی میں رچ بس کر بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ: ''مجھے نفرت ہے اُس عورت سے، جو عورت سے کمتر ہے۔'' اُس کا نئی زندگی سے اخذ کردہ یہ نتیجہ ہی اِس افسانے کی بنیاد ہے۔ یوں اس مجموعے کا یہ ایک ایسا افسانہ ہے، جس میں موپاساں اور منٹو کے افسانوں سے مخصوص طوائف، اپنے کھوئے ہوئے نسوانی منصب کے لیے تڑپتی پائی گئی۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، طوائف اور عورت کی یہ کش مکش رحمان مذنب سے مخصوص نہیں لہٰذا اس افسانے میں رحمان مذنب بھی وہ نہیں جو ''پُتلی جان''، ''گشتی''، ''لال چوبارہ''، ''چڑھتا سورج''، ''باسی گلی''، ''پھرکی'' اور ''اودھم پور کی رانی'' میں دکھائی دیتا ہے۔ یعنی اُن کے نمائندہ افسانوں کی پہچان ہی یہی ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ لینڈ اسکیپ خصوصاً

چکلے اور ہیجڑوں کی بیٹھکوں میں چھوٹا کھیل نہیں کھیلتے، بڑی بازی لگاتے ہیں، جس کے طفیل رحمان مذنب کا قاری طوائف کی مختلف صورتوں (نکیائی، ڈیرہ دارنی، خانگی، رقاصہ، اور مغنیہ) ہیجڑوں اور تماش بینوں کے علاوہ نوسر بازوں، جیب تراشوں، جواریوں، شرابیوں، جوتشیوں، کبابیوں اور دلّوں کے علاوہ سفید کپڑوں میں ملبوس پولیس کے کارندوں اور مخبروں کے روبرو جا کھڑا ہوتا ہے۔

اب آیئے اس مجموعے میں شامل بقیہ تین افسانوں کو بھی دیکھتے چلیں، جن کا تعلق ''اُس بازار'' سے نہیں۔ ''جلتی بستی'' 20 اگست 1949ء کا تحریر کردہ افسانہ ہے، جس کا موضوع سنہ سینتالیس کے فسادات اور بڑے پیمانے پر انسانی ہجرت ہے۔ اس افسانے میں انسان کے اندر کا سناٹا بولتا ہے۔ اسے عزیز احمد کے ''کالی رات''، منٹو کے ''کھول دو''، ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''شریفن''، اشفاق احمد کے ''گڈریا''، حیات اللہ انصاری کے ''شکر گزار آنکھیں''، احمد ندیم قاسمی کے ''پرمیشر سنگھ''، راجندر سنگھ بیدی کے ''لاجونتی'' اور خدیجہ مستور کے ''مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے'' کے ساتھ ملا کر پڑھیے۔ یوں تو اس افسانے کا مرکزی کردار پورے افسانے میں مایوس اور مضمحل ہے، تحرک ہے تو اُس کی زندگی سے باہر، کہیں دُور، فاصلے پر، لیکن افسانے کی آخری سطر میں جب اُس نے زندگی کے دھارے میں کود پڑنے کا فیصلہ کر لیا تو افسانہ جیسے ایک انگڑائی لے کر اُوپر کو اُٹھا ہے۔ اب افسانے کا مرکزی کردار زندگی سے آنکھ ملانے کو تیار ہے۔

''کوہسار زادے'' میں پختونوں کو برطانوی سامراج سے ٹکراتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ اُس نوع کے ردّعمل سے متعلق افسانہ ہے، جس کا اظہار ن۔ م راشد نے اپنی دو نظموں ''انتقام'' اور ''زنجیر'' میں کیا تھا۔ اس افسانے میں قتل ہو جانے والا انگریز کیپٹن، اپنی بیوی کے اغوا کے بعد جس طرح کرنل الفرڈ کے سامنے آتا ہے، وہاں موجود اور ناموجود کی حد بندیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ وقت کا دھارا اُلٹے رُخ پر بہہ نکلتا ہے اور یہ افسانہ نگار کا کمال ہے کہ ایک مردہ شخص کو زندہ افراد کی طرح چلت پھرت میں دیکھ کر بھی قاری کو کسی نوع کا اچنبھا یا ذہنی اُلجھن محسوس نہیں ہوتی۔

''نوکری''، اس مجموعے کا ہی نہیں، رحمان مذنب کا سب سے انوکھا افسانہ ہے۔ بے حد سادہ اور رمز سے بھرپور افسانویت لیے ہوئے۔ اس کے اختصار میں ایک سجاؤ ہے۔ ایک علامتی تہہ داری۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ''نوکری'' 25 جون 1945ء کی تحریر ہے، ماہنامہ ''شکر گنج''

لاہور بابت: جنوری 1947ء میں پہلی بار سامنے آیا۔ یہ افسانہ رحمان مذنب کی افسانہ نگاری کی ایک انوکھی ڈائمنشن ہے، جسے رحمان مذنب نے جانے کیوں آگے نہیں بڑھایا۔ شاید اُس دور کا نقاد، دَھانسو افسانوں کا متوالا تھا۔ اِس نوع کے تجربے کو پذیرائی کیوں کر ملتی، لہٰذا رحمان مذنب اِس ایک تجربے کے بعد ''پتلی جان'' اور ''گشتی'' جیسے دَھانسو افسانوں کو کھوجنے میں جُت گئے۔ یہ الگ قصہ ہے کہ وہ جس سمت چلے، قدم قدم پر کامیابی کے جھنڈے گاڑ گئے لیکن پھر بھی، جانے کیوں میری خواہش ہے کہ اُن کے غیر مرتب افسانوں میں سے اِس نوع کے چند ایک مزید افسانے پڑھنے کو مل جائیں۔

..................O..................

مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے (ترجمہ)

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

رحمان مذنب کا نام اردو فکشن اور علم البشریات میں کسی تعارف کا محتاج نہ تھا جب کہ بطور مترجم بھی انہوں نے وہ کام کر دکھایا کہ ان کا نام علمی کتب کے بڑے بڑے مترجمین خصوصاً سید علی بلگرامی، مولانا ظفر علی خاں، سید ہاشمی فرید آبادی اور سید عابد علی عابد کے ناموں کے ساتھ شامل ہو گیا۔

ایلبرٹ گیرارڈ نے کہا: ''عالمی ادب کے تصور کو ایک ٹھوس حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے ترجمہ ایک ناگزیر وسیلہ ہے۔'' جب کہ یہی بات علمی متراجم کے حوالے سے بھی اتنی ہی درست ہے، جتنی کہ ادب کے حوالے سے۔ اس لیے کہ ترجمے کا عمل دو زبانوں کے مابین پُل بنانے کا کام کرتا ہے۔ متن کی اسلوبیاتی اور موضوعی خصوصیات کا دوسری زبان میں منتقل ہو جانا، ترجمے کا اصل گُن ہے اور اس حوالے سے رحمان مذنب کا یہ ترجمہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

رحمان مذنب صاحب نے یہ ترجمہ ایک تخلیقی ادیب کے طور پر کیا۔ ان کے لیے کتاب کا موضوع اہم تھا اور تخلیقی ترجمے کے لیے اس داخلی انگیخت کی ضرورت ہوتی ہے جو صرف اور صرف کسی تخلیقی فن کار کو ہی ودیعت ہوتی ہے۔ نتیجہ، تخلیقِ فن یا تخلیقی ترجمے کی صورت برآمد ہوتا ہے۔ جب کہ فاضل مترجم کے صاحبِ علم و فضل ہونے کی جھلک کتاب کے حواشی میں دیکھی جا سکتی ہے۔

1971ء میں شائع ہونے والے اس ترجمے کو پاکستان رائٹرز گلڈ، حبیب بنک ادبی انعام برائے ترجمہ سے نوازا گیا تھا۔ اب رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ نے یہ کتاب دوسری بار شائع کر کے اہلِ علم کے لیے مسلم تہذیب و ثقافت کے مبسوط تجزیے کا یہ خزینہ ارزاں کر دیا۔

..........O..........

''مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے'' (فلیپ طبع دوم: **2002**)

بوطیقا

ڈاکٹر اسلم رانا

بوطیقا دنیائے ادب کی وہ پہلی اور بنیادی اہمیت کی تنقیدی کتاب ہے جس کا نام آج بھی بڑے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ارسطو علم، فلسفہ اور دانش وری کے اماموں میں سے ایک امام ہے۔ رحمان مذنب ایک منفرد اور صاحبِ اسلوب افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ دیو مالا، جادوئی رسوم اور قدیم یونانی تہذیب کا ماہر دانش ور ہے۔ مبصر حیران رہ جاتا ہے اسے سوائے اپنی بے ہنری کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی اور وہ سوچتا ہے کہ لکھے تو کیا لکھے۔ اسے اپنے آپ پر ہنسی آتی ہے اور رحم بھی۔ اس کا حال جوش کے الفاظ میں کچھ اس طرح کا ہوتا ہے:

پنکھڑی اور ناز سے پیش آئے تلواروں کے ساتھ

لیکن پھر اس کے سامنے ایک راہ کھل جاتی ہے۔ وہ ارسطو کے پیچھے نہیں، رحمان مذنب کے پیچھے پیچھے ایتھنز کی گلیوں میں نکل جاتا ہے، چوک چوک پھرتا ہے اور ارسطو کی باتیں رحمان مذنب کی زبانی سنتا ہے۔ اب اسے یہ یاد نہیں رہتا کہ وہ پنجاب کا رہنے والا اور پنجابی ادب کا ایک معمولی طالب علم ہے۔ وہ اب اپنے آپ کو ایتھنز (یونان) کا باشندہ سمجھنے لگتا ہے اور یونان میں پہنچنے سے قبل از مسیح ستر ۷۰، اسی ۸۰ کی دیو مالائی دنیا کا سفر کر چکا ہے۔

یہ جادو ہے جو رحمان مذنب نے "بوطیقا" کے ترجمے سے پہلے اپنی "دو چار گلاں" (دیباچہ) میں جگایا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ترجمہ اپنی جگہ پر۔ یہ دو چار باتیں ہی اپنی جگہ پر قدیم یونان کی ادبی تاریخ کو اس انداز میں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں کہ قاری ہر فقرے پر اپنے سامنے ایک نئے انکشاف اور ایک نئی حقیقت کو دیکھتا ہے اور دیکھتا رہ جاتا ہے۔ رحمان مذنب نے پتہ نہیں کیا ہنر استعمال کیا ہے کہ ان کے ترجمے کے دیباچے میں قدیم یونان کی ایک جیتی جاگتی تصویر حرکت کرتی ہوئی سامنے نظر آنے لگتی ہے اور پڑھنے والا اس تصویر کے خدوخال، رنگوں اور

زاویوں میں اپنے آپ کو گم کر کے یہ سمجھتا ہے جیسے اس نے اپنی منزل کو پالیا ہو۔ یہ رحمان مذنب کی تعریف نہیں، صرف اس کے کمال کا اعتراف ہے۔

اب ذرا ترجمے کی طرف آیئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ پنجابی نثر کے میدان میں بیسویں صدی سے قبل کوئی ایسا کارنامہ نظر نہیں آتا جو پنجابی نثر نگار کے لیے نشانِ منزل کا کام دے اور اس جاری و ساری صدی میں جو کچھ تو قصہ کہانی کے روپ میں ہے اور کچھ مری ماری ہوئی ادبی تنقید۔ خالص نثر بہت کم نظر آتی ہے۔ تراجم کا بھی یہی حال ہے، لے دے کے شریف کنجاہی کے اقبال کے سات لیکچروں (انگریزی) اور ''علم الاقتصاد'' کے تراجم شامل ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ترجمہ وہ بھی لاجواب ہے۔ شریف کنجاہی نے اقبال کے لیکچروں کا ترجمہ کرتے ہوئے ٹھیٹھ اور خالص پنجابی الفاظ میں خالص فلسفیانہ مطالب کو ایسے ادا کیا ہے جیسے وہ کسی فلسفے کی کتاب کا ترجمہ نہیں کر رہے بلکہ عام بات چیت کر رہے ہوں اور پھر یہی صفت ہمیں رحمان مذنب کے ''بوطیقا'' کے ترجمے میں نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنی طرف سے خالص پنجابی الفاظ اور تراکیب کی مدد سے اصطلاحات کے نئے تراجم پیش نہیں کئے۔ زیادہ تر وہ اصطلاحی الفاظ جو اردو میں عام استعمال کئے جاتے ہیں اور اردو کے حوالے سے پنجابی زبان و ادب کے قارئین کے لئے اجنبی نہیں رہے، استعمال کئے ہیں۔ پھر بھی رحمان مذنب نے خالص پنجابی الفاظ میں ترجمہ کرتے ہوئے بڑا اہم کام کیا ہے۔

بوطیقا کو سمجھنے میں بڑی مشکل اس طرح پیش آتی ہے کہ یہ صرف نظریاتی تنقید کی کتاب نہیں، ارسطو کے سامنے یونانی ڈرامے کی پوری تاریخ تھی اور ڈرامے کے وہ شاہکار جو آج بھی دنیا میں اسی طرح اہمیت کے حامل اور مقبول ہیں جیسے وہ آج سے صدیوں پہلے تھے۔ ان کو سامنے رکھتے ہوئے ارسطو نے اپنے اصول اور قانون و قواعد وضع کئے۔ اب جہاں ڈرامے کی یونان جیسی روایت موجود نہ ہو یا جنہوں نے بنیادی طور پر یونانی ڈرامے کی عملی صورت بھی نہ دیکھی ہو، یہ ڈرامہ پڑھا بھی نہ ہو وہ بوطیقا کو سمجھیں تو کیسے سمجھیں؟ رحمان مذنب نے یہ مشکل اس طرح حل کر دی ہے کہ ترجمے کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے تشریحی نوٹ حاشیے میں درج کر دیئے ہیں اور یہ تشریحی نوٹ اصل متن کو اس طرح منور کر دیتے ہیں کہ الفاظ کے پس منظر میں چھپے ہوئے معنی

روشن ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے فٹ نوٹوں میں بہت اہم اور کام کی معلومات پیش کی ہیں جو برسوں کی تحقیقات کا خوبصورت نتیجہ ہیں۔ خاص طور پر رحمان مذنب نے جہاں پرانے ڈرامے کے موضوعات یا کہانی یا ڈراموں کے بعض کرداروں کی وضاحت کی ہے وہ نوٹ تو بہت اہم اور کام آنے والے ہیں۔ صرف بوطیقا کے معنی ہی سمجھ میں نہیں آتے بلکہ اصل کتاب کو پڑھے بغیر بعض ڈرامے اور یونانی ڈرامے یا بعض دیو مالائی کردار جو بہت مشہور ہیں ان کے بارے میں بھی قاری کے علم میں بہت اضافہ ہوتا ہے۔

''بوطیقا'' ادبی تنقید کی ایک سدابہار کتاب ہے۔ آج بھی اس میں ہمیں ایسی باتیں مل جاتی ہیں جو یونان سے ہزاروں میل دور اور یونانی ڈرامے سے ہزاروں سال بعد پیدا ہونے والے پنجابی ادب کی بعض روایات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں یا ان پر ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالتی ہیں۔ پہلے باب میں ایک جگہ ارسطو ہمیں بتاتا ہے۔

''بھانویں لوکاں دی ایہہ عادت اے کہ اوہ شعر دی بحر نال شاعر داناں نتھی کر دیندے نیں۔ نقالی دے حوالے نال اوہدے کم دی نوعیت نوں نظر انداز کر کے انھے واہ اُوس بحر نال اوہنوں موسوم کردے نیں، جیہڑا اور دوائیاں ورتدا اے (جیویں مرثیہ گو شاعریاں واراں دا شاعر) اوہ دوائیاں (طب) دی کوئی تھیوری یاں طبیعات دا کوئی مسئلہ کسے بحر وچ بیان کر رہیا ہووے۔'' (ترجمہ رحمان مذنب ص ۴۸)

اور ہمیں یہ سوچ کر اور محسوس کر کے ایک طرح کی مسرت ہوتی ہے کہ پنجابی شاعری میں بھی وارث شاہ، حافظ برخوردار، پیلو، مولوی غلام رسول اور میاں محمد بخش کے نام ایک بحر ہی نہیں بلکہ موسیقی کی ایک خاص لے اور دھن کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہیں یا اسی صفحے کے فٹ نوٹ میں جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ:۔

''ہومر اک مشہور شاعر جہدے جنگ نامے (ایلیڈ تے اودیسے) ساری دنیا وچ ترجمے دی شکل وچ پڑھے جاندے نیں یونان نوں فتح کرن والے آکیائی سورج پرست سن۔ اِنہاں پہلاں یونان ایہدے بعد طروئے دے پیلازجیاں (دھرتی دھرم نوں منن والے) نوں تباہ کیتا۔ بشریات دی وڈی سکالر مس جین ایلن ہیریسن نے کئی سال دی تحقیق دے بعد بڑے

وثوق نال دسیا اے کہ ہومر بڑا متعصب تے چوتھا شاعری ۔ اوہنے اپنے عقیدے دی خاطر سورج دیوتا دا جھنڈا اچا کرن لئی پیلا زجیاں نوں بڑا ذلیل کیتا۔ اونہاں دیاں شکلاں وگاڑیاں تے اپنے جنگ نامے وچ ہیچ کے جھوٹھ بولیا اے۔" (ترجمہ رحمان مذنب، ص ۴۸)

تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اگر ہمارے جنگ ناموں میں بعض ایسے واقعات آ گئے ہیں جو تاریخی روایت کا حصہ نہیں تو ان کے بارے ہمیں شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہومر جیسا عالمی سطح کا بڑا شاعر اگر اس حربے سے کام لینے میں عار محسوس نہیں کرتا تو پنجابی کے ایک عام شاعر نے اس کے مقابلے میں اگر جنگ نامے میں امام حنیف یا زیتون کے کردار کا ذکر اور اضافہ کر دیا ہے یا ان کا جنگ نامہ لکھ دیا ہے یا پنجابی کے بعض جنگ ناموں اور واروں میں بعض کردار اور واقعات دیو مالائی اور ماورائی ہیں تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہوئی۔

جہاں تک بوطیقا کے نفسِ مضمون کا تعلق ہے ظاہر ہے وہ ترجمے پر تبصرہ کرنے والے کے منصب سے باہر کی چیز ہے اور ویسے بھی بوطیقا وہ کتاب ہے جسے پڑھا ہی اس لئے جاتا ہے کہ اس سے روشنی حاصل کی جائے۔ رحمان مذنب نے بوطیقا کو پنجابی روپ ایسے خوبصورت انداز میں دیا ہے کہ یہ ترجمہ ان کا ایک عظیم کارنامہ بن گیا ہے۔ پنجابی زبان و ادب میں یہ ترجمہ ایک ایسے منفرد اور اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے جس سے پنجابی زبان و ادب کے طالب علم ہمیشہ فیض حاصل کرتے رہیں گے۔ رحمان مذنب اور ان کے ساتھ ساتھ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ ہماری طرف سے صرف مبارکباد کے ہی مستحق نہیں بلکہ شکریے کے بھی حق دار ہیں۔

O

مطبوعہ ماہنامہ "کتاب" جولائی، اگست ۱۹۸۹ء

ارسطو کی بوطیقا

محسن فارانی

یونانی ادب کے حوالے سے ڈرامے اور رزمیے کے موضوع پر ارسطو کی شہرہ آفاق تالیف 'بوطیقا' دنیا کی قریب قریب ہر زبان میں منتقل ہو چکی ہے۔ انگریزی میں تو اس پر بیشمار مقالے لکھے گئے ہیں۔ ادب کی تاریخ اور تنقید کی کوئی کتاب اس کے ذکر سے خالی نہیں۔ 'بوطیقا' ارسطو کے کلاس NOTES پر مشتمل ہے۔ تیئس (۲۳) صدیاں گزرنے پر بھی یہ کتاب آج بھی بصد آب وتاب زندہ ہے۔ ملک کے نامور ادیب، ڈراما نگار اور افسانہ نگار رحمان مذنب نے بڑی مہارت اور محنت سے اسے پنجابی میں منتقل کیا ہے۔ پنجابی ادبی بورڈ نے اکادمی ادبیات پاکستان کی مالی اعانت سے اسے چھاپا ہے۔ رحمان مذنب یونانی ادب، کلچر اور دینِ ساحری کے بہت بڑے سکالر ہیں۔ یونانی ڈرامے، تھیٹر اور صنمیات کے موضوع پر ان کے مطبوعہ تحقیقی مقالات لائقِ مطالعہ ہیں۔ 'بوطیقا' کے موضوع، رموز واشارات کو اچھی طرح سمجھنے اور سمجھانے پر قادر ہیں۔ انہوں نے بائی واٹر کے توسط سے بڑی احتیاط سے ارسطو کے الفاظ اور سٹائل کو محفوظ کیا ہے۔ بائی واٹر کا ترجمہ مستند ہے۔ ایک اور اہم اور مفید بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے حواشی میں 'بوطیقا' کے تمام مشکل مقامات، حوالوں اور ALLUSIONS کی تشریح کی ہے جس سے متن سہل اور قابلِ فہم ہو گیا ہے۔ حواشی کے بغیر متن کا مفہوم پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ حواشی فی نفسہٖ معلومات کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ یہ امر موجب مسرت ہے کہ پنجابی میں علمی اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ اس رجحان کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ وقت بہت آگے نکل چکا ہے تاہم وقت کا خلاء پاٹنے کے لئے رفتار کار بڑھانا بہت ضروری ہے۔

o

TARAQQI PASAND ADAB KA MAS'ALA:

Though small in size, this corrosive and forceful rebuttal ever made of the claims of 'progressive' writers. Besides exposing the inconsistencies and confused thought characterising the creed of "progressivism", Mr. Muznib has presented a psychoanalytical explanation for this chaos and confusion.

The pamphlet contains a point-to-point 'reply' to all 'boastful' pretensions of the "politician-writers" who, in the ultimate analysis, appear to be neither politicians nor writers. M.S.

The Civil & Military Gazette, Saturday, Nov 3, 1952

ترقی پسند ادب کا مسئلہ

کرامت علی خاں

رحمان مذنب طبعاً نفاست پسند واقع ہوا ہے، سلیقہ، قرینہ اور کسی کام کو خاص طریقے سے سرانجام دینا اس کی فطرت بن چکی ہے۔ اس کی نفاست پسندی اور اس فطرت کا عکس ہمیں اس کی ادبی تحریروں میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ رحمان مذنب نے بے شمار فیچر، ڈرامے اور مقالے لکھے ہیں۔ ان میں کہیں بھی کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جو اس نے بغیر دلیل اور منطقی ربط کے کہی ہو۔ میرے نزدیک اس کی ادبی تحریروں کی یہی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسے اپنے موضوع اور فن کا گہرا احساس اور مطالعہ ہے جو آج کل کے بیشتر ادیبوں میں مفقود ہے۔

ترقی پسند ادب کی نظریاتی بحث پر جو دو مقالے رحمان مذنب نے سپردِ قلم کئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بڑی کاوش اور گہرے مطالعے کے بعد کہا گیا ہے۔ یوں تو ہر تحقیقی مقالہ کے لئے مطالعہ اور محنت درکار ہوتی ہے مگر ان مقالات میں مصنف کی نفاست پسندی نے خاص کام کیا ہے۔ اس کی محنت قابلِ داد ہے کہ اُس نے لینن، علی سردار جعفری، سجاد ظہیر، کیفی اعظمی اور ابراہیم جلیس جیسے کیمونسٹوں کی تحریروں کو کھوج نکالا ہے اور اس سے ثابت کیا ہے کہ اردو ادب میں ترقی پسندی کا مقصد محض اشتراکی سامراجیت کا پراپیگنڈہ ہے اور ترقی پسندوں کی تحریروں میں ادب اور فنی تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

رحمان مذنب نے ان مقالات کے لکھنے کے لئے جتنا مواد فراہم کیا ہے غالباً اُس سے پوری کتاب ترتیب دی جا سکتی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ رحمان مذنب کو ترقی پسندوں پر اردو ادب کو ''خراب'' کرنے کی وجہ سے بہت تاؤ ہے اور وہ پوری کتاب کے لکھے جانے کا انتظار نہیں کر سکتا۔ اس جوش کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان مقالات میں غیر معمولی طور پر رحمان مذنب نے تیز اور درشت انداز

اختیار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریر سے خطابت کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ایسے مفید اور اہم موضوع کو صرف دو مقالات تک محدود نہیں رہنا چاہیئے۔ رحمان مذنب نے جب ترقی پسندی کو بے نقاب کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے تو اسے پایۂ تکمیل تک ضرور پہنچانا چاہیئے۔

کرامت علیان

۲۳ر نومبر سنہ ۵۲ء لاہور۔

KHUSHBUDAR AURTAIN
An absorbing collection of short stories
By Saeed Malik

This collection of short stories represents the works of Rehman Muznib, playwright, short story writer, translator, poet and columnist, who has enriched the Urdu literature significantly. He carved out a niche in the literary hierarchy of the country by dint of his hard work, perceptive writings, the courage of his conviction and the profuse and liberal use of local idioms.

The octogenarian creative writer, who was born, bred and raised in a well-known area of the Walled City of Lahore, inherited healthy traditions from his family, which guided him in his literary pursuits. The stories included in the collection are sharp and perceptive and reflective of artistic creativity and peculiar style of the writer, who was known for his

strong penchant for making strong social comments on strength and foibles of the people.

Late Rehman Muznib earned respect and fame because of the exposure he provided to the downtrodden section of female population, who were exploited by those manipulators from the underworld and those whose businesses thrive on human miseries. He was sometimes included in the category of writers whose works are brimming with juicy sex stories and who were accused of being amorous in their style and approach to literature.

As during his childhood and the prime of his youth, late Rehman Muznib saw from close quarters the "glamour of the nights" in an area of the city, which was known as BAZAR-E-HUSN or HIRA MANDI, he sniffed the " aroma of the area" and had many a peep into the lives of those unfortunate women, who did not adopt the dirty profession of their own will, but were brought into it by the sheer force of unavoidable circumstances. That was why one feels the after effects of his encounters with the men and women from that area who were responsible for ruining the lives of so many

innocent people.

Khushbudar Aurtain represents one of the best short stories written by Rehman Muznib, which revolves around the true stories of several women, who despite wanting to rid themselves of the clutches of the oppressors, had to spend their entire lives in misery, the world of profanity and sin. He used his stories to vent the feelings of such women, who groaned under the weight of evil throughout their lives. He did so in the hope that a day would come when these women would succeed in breathing freely and raise their voices against social, moral and cultural injustices inflicted on the weaker segments of society. It was this conviction of the writer that kept him afloat in an era, which was dominated by obscurantists and self-righteous conscience keepers of the society.

Late Rehman Muznib has written with hope, love and pain, though in some of his writings one notices that his thoughts were scattered and shattered under the weight of pain and sorrow which he felt and witnessed during his life but he was quick to regain the equilibrium expected of a

seasoned writer. A few of the details mentioned in his short stories are truly bloodcurdling though brimming with intense creative sensitivity. Regarded as a master of the craft and an intrepid writer, he used his pen freely and fearlessly, and considered no subject taboo, and outside the scope of his literary criticism.

If his short stories included in this collection and others published in different magazines are read together, one is struck by the sustained excellence of creative genius. At places they sound like lyrical pieces of writing, which the readers like to finish at one go. He also worte a large number of radio drama and television plays, which won him kudos from viewers and critics.

............O............

The "Nation" Lahore, May 4, 2002

Stories depicting "Perfumed Women"

By Rauf Sheikh

Khushbudar Aurtain (Perfumed Women) is a collection of short stories by Rehman Muznib about the women who sell flesh to earn their living. To them, their profession is as sacred as other professions to others. In Urdu literature it is Saadat Hassan Manto who is generally known for making his mark in writing on prostitutes and sexual perversion. Agha Babar and Wajida among other writers also stand out for their work in this regard.

Manto has shown a tug of war between a prostitute and a woman in the prostitute's mind. He has proved his mastery in depicting this conflict but Muznib, to his credit, shows such women in their full glare mostly with no apologetic attitude or moral qualms. She asserts herself as conqueror of human heart. Her body language, gestures, gesticulations smack of the sheer audacity of her sexual

behaviour. Always on the hunt to seduce people, she gives damn care to the consideration of having a normal household life. Only if her customers give her respite, she may be able to think about her rehabilitation as a women.

A resident of the area near dancing girls bazaar, Muznib wrote extensively on different guises of a prostitute: those of KHANGI, TAKYAEE, RAQQASA, MUGHANNIYA, DERA DARNI and NOCHI. The brothels in his stories are not imaginary, rather real which were much frequented by him. So he was able to capture the exact atmosphere of the Redlight area, which, he shows, is visited by the people desperate to cater to their fleshly desires. The realism and candid expression coupled with vigorous tone of bawdy jokes figure out in the stories.

One can delve deeper into the dark recesses of these "Perfumed Women" by reading Muznib's short stories. He creates quite an impact by employing the jargon of the prostitution. His perception of the Shahi Muhallah ethos is that of an objective observer ___ one who is well conversant

with the manners peculiar to prostitutes. Muznib's skill at characterization vindicates the quality of negative capability in him.

He has written so voluminously on the subject that apart from the short stories collections of "Putli Jan", "Bala Khana", "Ram Piyari" and "Khushbudar Aurtain", as many as three other such collection are to see the light of the day.

Here is a lot of matter on prostitutes calling for a research scholar to explore.

..................O..................

The "News" Lahore, Mar 16, 2003

باسی گلی

منیر احمد خلیق

مندرجہ بالا عنوان کے تحت جناب رحمان مذنب کا افسانہ ''ادبی دنیا'' ماہ جنوری ۱۹۶۳ء کے شمارے میں شائع کیا گیا جس کا مطالعہ اگر رسوا کی ''امراؤ جان ادا'' کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے تو قارئین کے سامنے موجودہ دور کے معاشرے کی ایک جیتی جاگتی تصویر ایسے آجاتی ہے جیسے رسوا کی ادا کے مطالعہ سے آج سے ڈیڑھ سو سال پیشتر کے لکھنوی معاشرے کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھومنے پھرنے لگ جاتی ہے۔ مگر اس افسانہ میں افسانہ نگار نے رسوا سے چند قدم آگے چل کر طوائفوں کی زندگی کے ساتھ ساتھ پیری مریدی کی لعنت، خانقاہوں کے مجاوروں کے دغا وفریب اور ملنگوں اور فقیروں کی مکاری اور عیاری کا خوب اچھی طرح سے بھانڈا پھوڑا ہے بلکہ پوسٹ مارٹم کر کے رکھ دیا ہے۔

ان تمام چیزوں کے علاوہ مذنب صاحب نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ اگر چہ انہوں نے رسوا کی طرح اپنے افسانہ میں شاعری نہیں جھاڑی مگر جو پیارے پیارے محاورے اور لطیف الفاظ استعمال کیے ہیں، ان میں شعروں کی چاشنی سے کم مزا نہیں ہے۔ مولانا صلاح الدین صاحب ایڈیٹر ''ادبی دنیا'' نے انہیں جو ''مخلص فنکار'' کا خطاب دیا ہے وہ بھی کم نہیں ہے۔

افسانہ کے اختتام پر جو خوبی افسانہ نگار پیش کرتا ہے وہ ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ وہ حالات کو علی الترتیب پیش کر کے ان کا انجام قارئین پر چھوڑ دے۔ یہ چیز افسانہ کی جان ہوتی ہے۔ یہی چیز اس افسانہ میں پیش کی گئی ہے کہ کس طرح جبری اغوا ہوئی اور پھر کس طرح اَیشاں نے خانقاہ کے اس ظالم مجاور کو کوٹھڑی میں بند کر کے جلایا اور پھر اَیشاں اور سلطان کیسے ایک دوسرے سے ملے۔ اگر افسانہ نگار خود انجام پیش کر دیتا تو پھر وہ لطف اور وہ مزہ جو Suspense (سسپنس) میں آتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔ مگر اس طرح سے ہر ایک قاری اپنا مختلف نتیجہ اخذ کرتا اور لطف اندوز ہوتا ہے۔

O

ہفت روزہ ''سیر وسفر'' ملتان ۲۵ جنوری ۱۹۶۳ء

پُتلی جان اور رحمان مذنب

انور سدید

امسال مجھے جو خوشیاں نصیب ہوئی ہیں ان میں حالیہ خوشی بے حساب اور بے پایاں ہے۔ خوشی یہ ہے کہ اردو کے مقبول، ممتاز اور بہترین افسانہ نگار رحمان مذنب کے افسانوں کی پہلی کتاب اپنے اسی عنوان سے چھپ گئی ہے جس نام سے اس کا اعلان ربع صدی پہلے ہوا تھا۔ اس کتاب کا نام ''پُتلی جان'' ہے اور اس کی طباعت و اشاعت میں ربع صدی کا عرصہ اس لئے لگا ہے کہ ناشر سہیل اشرف اس کتاب کو اس کے داخلی حسن سے بھی زیادہ خوبصورت بنانا چاہتے تھے۔ آپ کو علم ہے کہ رحمان مذنب اس معاشرے کا نمائندہ افسانہ نگار ہے جہاں صرف خوشبودار عورتیں پیدا ہوتیں، پروان چڑھتیں اور ایک عالم کو لوٹنے اور لبھانے کے بعد اپنے کلچر کا ورثہ اگلی نسل کے سپرد کر جاتی ہیں۔ سہیل اشرف جب اس کتاب کی طباعت کا انتظام کرتا رحمان مذنب کے افسانوں کا کوئی کردار سولہ سنگار کر کے اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ پوچھتا......

''مجھ سے زیادہ خوبصورت کتاب چھاپ سکو گے؟''

سہیل اشرف کا اعتماد ڈانواں ڈول ہو جاتا۔ رحمان مذنب کی کتاب کی چھپائی معرضِ التوا میں پڑ جاتی۔ سنا ہے کہ اس عرصے میں پتلی جان رحمان مذنب سے احتجاج کرتے کرتے دنیا سے ہی گزر گیا۔ اس کتاب میں جادو جگانے والی لڑکیاں خود استاد بن گئیں، نسل نسل کا بھاؤ بھید بتانے لگیں، بہت سی دانشمند خواتین کو ملک کا قانون راس نہ آیا۔ وہ مسجد عالمگیری کے محفوظ سائے سے نکل کر لاہور کے گردونواح میں تازہ آباد بستیوں میں جا کر بس گئیں اور اس محلے کو جو اندرون ٹکسالی دروازہ میں آباد تھا پورے لاہور پر پھیلا دیا۔ رحمان مذنب نے اس کلچر کے ارتقاء کی یہ تاریخ بھی دیکھی ہے اور اس جغرافیے کا مطالعہ بھی کیا ہے جو ٹوٹا نہیں بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرح پھیلتا اور

نئی زمینوں پر فتح یاب ہوتا چلا گیا۔ تین نسلوں کا یہ افسانہ حال ہی میں امجد الطاف، ضیا، جالندھری اور شیخ سعید کے رسالہ "علامت" میں تین قسطوں میں چھپا ہے۔ ہر قسط ایک نسل کے عروج سے شروع ہوتی ہے، اپنے زوال کے آثار بتاتی ہے، اگلی نسل کے عروج کو ظاہر کرتی ہے، گویا دائرے کا مرکز قائم ہے، محیط بڑھتا جارہا ہے۔

تمہید لمبی ہوگئی ہے، لیکن حکایت لذیذ ہے اور خوشی میرے ہر بن مو سے پھوٹی پڑتی ہے۔ اگر میں بات کو مختصر کرنے کی کوشش بھی کروں تو شائد کامیاب نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اب میں پھر کتاب کی طرف آتا ہوں جو اتنی خوبصورت چھپی ہے کہ ہاتھ لگانے سے میلی ہوتی ہے۔ سرورق تنویر مرشد نے بنایا ہے۔ افسانے رحمان مذنب نے لکھے ہیں۔ دونوں میں ذہنی ہم آہنگی اس قدر زیادہ ہے کہ دونوں کو الگ کرنا یا ان میں حدِ امتیاز پیدا کرنا ممکن نہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جس معاشرے کی تصویر کشی رحمان مذنب نے لفظوں میں کی ہے، تنویر مرشد اس کا حقیقی نقش رنگوں، خطوں اور قوسوں پر سحر پیدا کررہا ہے، ڈوبتے چاند سے ایک چہرہ طلوع ہورہا ہے، صبح کے ملگجے اجالے میں ایک تجربہ کار خاتون حسن کی نقدی لٹا کر رخصت ہورہی ہے، طبلے کی تھاپ جس سراپا کو ابھارتی ہے وہ پتلی جان کا سراپا ہے، معاشرے کے سینے میں خنجر پیوست ہے اور جس کے خون کا جوہڑ بھرا پڑا ہے، اوپر ایک غضب ناک آنکھ ہے جو خدا جانے تانگہ کی ہے یا معاشرے کی یا رحمان مذنب کی......

جس نے شمس العلماء، پروفیسر محمد عبداللہ ٹونکی کے خاندان میں جنم لیا لیکن زندگی ٹکسالی دروازے کی تنگ و تاریک گلیوں میں گزاری۔ معصیب کا دریا بہتا ہوا دیکھا۔ اس دریا میں لوگوں کو ڈوبتے ہوئے اور ان کی لاشوں کو تیرتے ہوئے دیکھا لیکن اپنے دامن کو اس طرح پاک رکھا کہ فرشتے اس دامن پر نماز پڑھنے کی آرزو کریں۔ بدی، سیاہی اور روسیاہی کے مناظر میں رحمان مذنب کورے لٹھے کی طرح سفید اور پوتر رہا۔

رحمان مذنب کی منفرد خوبی یہ ہے کہ اس نے اپنے لئے زندگی اور معاشرے کی ایک چھوٹی سی قاش منتخب کی لیکن جب افسانہ نگاری کے لئے اس قاش کا تجزیہ شروع کیا تو اسے یہاں تنوع کا جہاں آباد دکھائی دیا۔ بظاہر یہ طوائف کا بدنام معاشرہ تھا جس پر بااخلاق زمانہ مہر کی اور محبت کی نظر نہیں ڈالتا لیکن رحمان مذنب کو یہ ایک ایسے حمام کی صورت میں نظر آیا جس میں داخل

ہونے والا ارادا تنا اپنے کپڑے اتار دیتا ہے اور جذباتی تشنج دور کرنے کے لئے نہ صرف ڈبکی لگاتا بلکہ اکثر اوقات اس جوہڑ میں جس کی سطح معطر ہے اور جس کا پاتال بدبو کا سمندر ہے...... ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ رحمان مذنب نے معاشرتی زندگی کے تمام جزرومد اور افسانوں کے اصلی خدوخال طوائف کی دنیا میں اور اس بازار کے کوٹھے پر دیکھے اور پھر یہ سب حقائق اس نے اپنے افسانوں میں اس خوبصورتی سے پیش کر دیئے کہ ''اس بازار'' کا پورا معاشرہ بنات النعش گردوں کی طرح ہمارے سامنے عریاں ہوگیا۔ صاف نظر آتا ہے کہ تماشائی ہونے کے باوجود رحمان مذنب اس معاشرے کا مورخ بھی ہے اور افسانہ نگار بھی۔ غلام عباس، سراج الدین احمد نظامی، ڈاکٹر تاثیر، چودھری محمد اکبر، فیروز نظامی اس کے ہم جولی ہیں، جو اپنے اپنے انداز میں اس معاشرے کے مشاہدات کشید کر رہے ہیں۔ رحمان مذنب، غلام عباس اور سراج نظامی اسی ماحول سے افسانہ نگار بن کر ابھرے۔ فیروز نظامی نے موسیقی میں نام پیدا کیا۔ ڈاکٹر تاثیر ادب، تنقید اور سیاست کی دنیا میں نامور ہوئے، ان سب کے عقب میں میاں ایم اسلم ہے۔ حکیم فقیر محمد چشتی ہیں، میاں امیر الدین ہیں، ان سب کو معاشرے کے محتسب سمجھئے کہ برائی کی لکیر کو نیکی کے روشن خط پر غالب نہیں آنے دیتے تھے۔

''پتلی جان'' کے سب افسانے اس بازار کے افسانے ہیں، جس زمانے میں یہ افسانے لکھے گئے تھے، اس زمانے میں چھپتے ہی سب مقبول ہو گئے تھے، زمانے کے ساتھ اگرچہ افسانے کا چلن بھی تبدیل ہوتا گیا۔ کہانی وار افسانے کے بطن سے تجریدی اور علامتی افسانے نے جنم لیا لیکن رحمان رحمان مذنب کے افسانوں کی شہرت ماند نہیں پڑی۔ ''پتلی جان'' اس انوکھی مخلوق کا افسانہ ہے جو نہ عورت ہے اور نہ مرد، یہ قدرت کی عملی ستم ظریفی ہے یعنی عورت اور مرد کے سنگم پر تیسری جنس۔ رحمان مذنب نے اردو ادب میں پہلی دفعہ اس مخلوق کے احساسات وجذبات تک رسائی حاصل کی اور اسے انسانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ یہ اتنا انوکھا افسانہ تھا کہ سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، غلام عباس، کرشن چندر سب نے تعریف کی، قیوم نظر نے اسے حلقہ ارباب ذوق کے رسالہ ''نئی تحریریں'' میں شائع کیا۔ وزیر آغا نے ایک مقالہ ''اردو کے چند انوکھے افسانے'' لکھا تو اس کا ذکر اور تجزیہ بالخصوص کیا۔ اب اس موضوع

پر ''بتلی جان'' رحمان مذنب کا نادر اور لاجواب افسانہ شمار ہوتا ہے۔اس افسانے نے رحمان مذنب کی شہرت کو مستحکم کیا۔اس کی فنی عظمت کا نقش استوار کیا لیکن باور کیجئے کہ ''بتلی جان'' رحمان مذنب کے فن کا شاہکار ضرور ہے، حرف آخر نہیں۔

رحمان مذنب ہر افسانے میں خونِ جگر صرف کرتے ہیں، ان کا کوئی افسانہ اضطراری کیفیت کا مظہر نہیں، وہ افسانہ یوں لکھتے ہیں جیسے اس کے ساتھ آہستہ آہستہ زندگی گزار چکے ہوں۔ ان کا افسانہ ''گشتی'' چھپا تو ''بتلی جان'' سے زیادہ تہلکہ خیز ثابت ہوا۔''باسی گلی'' چھپا تو مولانا صلاح الدین احمد جھوم جھوم گئے۔

انہوں نے فرمایا ''یہ ایک ایسا عمدہ افسانہ ہے جو ہمارے مختصر افسانے کے چمن میں ایک گل نوبہار کی شگفتگی کی نوید دیتا ہے۔ رحمان مذنب نے بڑے نرم اور ہمدردانہ انداز میں اس ناسور کو کریدا ہے جو مشرق اور مغرب کے ہر معاشرے کے جسم میں چپکے چپکے اپنا زہر پھیلاتا رہتا ہے لیکن ازبس کہ ناسور بھی پرانا ہے اور زہر بھی تریاق پر ہمیشہ سے خندہ زن ہے......''

رحمان مذنب نے زہر کو محسوس کیا لیکن تریاق کی تلاش نہیں کی۔اس زہر کو تو معاشرہ خود پالتا ہے اور اس سے نجات کی آرزو تک نہیں کرتا۔اس زہر کو اٹھا کر شہر سے دور لے جا کر پھینکتا ہے لیکن وہاں ایک نیا شہر آباد ہونے لگتا ہے اور رات کے اندھیرے میں مقدس قبائیں اور پوتر عبادتیں اس سمت میں سفر کرنے لگتی ہیں کہ خلاء، کیسری لاچا، پھول ہجائیں، بالی اور منڈوا اس زہر کی صرف نشاندہی کرتے ہیں۔ رحمان مذنب نے نوکِ نشتر سے زہر نکالنے کی بجائے گداز و تاثیر اس انداز میں پیدا کی ہے کہ آپ حقیقت کا سچا اور مثبت روپ دیکھ لیں اور دوسروں کو اس کی خبر کر دیں۔

رحمان مذنب کی اس کتاب کی ایک اور خوبی اس کا پیش لفظ ہے جو ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے۔ یہ پیش لفظ 1972ء میں مضمون کی صورت میں سالنامہ ''اردو زبان'' میں چھپا تھا اور چھپتے ہی متنازعہ مضمون بن گیا تھا۔وزیر آغا نے رحمان مذنب کا موازنہ سعادت حسن منٹو سے کیا تھا جن کے طوائف پر لکھے گئے افسانے بہت زیادہ مقبول و معروف ہوئے۔ آغا صاحب نے ان دونوں میں طوائف کو قدر مشترک قرار دیا۔لیکن واضح رہے کہ منٹو طوائف کے اندر چھپی ہوئی عورت

کو دریافت کرتا ہے۔ رحمان مذنب طوائف کے معاشرے کو بے نقاب کرتا ہے۔ دونوں کی حدودِ فن مختلف ہیں...... دونوں لاجواب ہیں، یار لوگ اس بات کو لے اڑے کہ وزیر آغا نے رحمان مذنب کو منٹو پر فوقیت دے دی ہے۔

O

خوشبودار عورتیں

انور سدید

رحمان مذنب کے افسانوں کے مجموعے ''خوشبودار عورتیں'' کی اولین اہمیت یہ ہے کہ یہ رحمان مذنب کی وفات کے بعد ان کے نام پر قائم کئے گئے ٹرسٹ کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔ مجھے بڑی طمانیت محسوس ہو رہی ہے کہ رحمان مذنب نے اپنا ادبی کام جہاں چھوڑا تھا، وہیں سے اس کا سلسلۂ اشاعت شروع ہو گیا ہے۔ میں نے یہ کتاب پڑھی تو یوں محسوس ہوا کہ رحمان مذنب اس دنیا میں موجود ہیں اور میرے ساتھ باتیں کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ''برگ آہن'' کے عنوان سے اپنی زندگی میں ہی ایک مضمون لکھ ڈالا تھا جسے ان کی خود نوشت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس آپ بیتی میں بیسویں صدی کے نصف اول کا لاہور اپنی تمام تر رعنائیوں اور شادابیوں کے ساتھ موجود ہے۔ اس میں فطرت پرست رحمان مذنب سے ملاقات ہوتی ہے۔

رحمان مذنب کو بالعموم طوائفوں کے معاشرے کا افسانہ نگار شمار کیا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کتاب میں ''پھرکی''...... ''اودھم پور کی رانی''...... ''خوشبودار عورتیں''...... ''افلاس کی آغوش'' اور ''خوشبو کا دھواں'' ایسی عورتوں ہی کے افسانے ہیں جن کا جسم روپیہ کمانے کی مشین ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ رحمان مذنب نے ان افسانوں کے بیانیہ کو لذت انگیز نہیں بنایا بلکہ اس معاشرتی حقیقت کو ابھارا ہے جو عورت کی پاسبانی نہیں کرتی اور اسے جسم فروشی پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس لحاظ سے رحمان مذنب کے افسانوں کی طوائفیں معاشرے کی مظلوم عورتیں ہیں اور ظالم وہ معاشرہ ہے جو انہیں گھر کی چار دیواری سے نکال کر کوٹھے پر بٹھا دیتا ہے۔

واضح رہے کہ رحمان مذنب اس ایک موضوع تک محدود نہیں تھے چنانچہ اس کتاب کے باقی افسانے ''جلتی بستی''...... ''کوہسار زادے'' اور ''نوکری'' کے موضوعات معاشرے کے

دوسرے مداروں سے منتخب کئے گئے ہیں۔ ''جلتی بستی'' کردار کا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ **1947ء** کے فسادات سے تلاش کیا گیا ہے اور اس کا کردار زندگی کی مثبت قدروں کا اثبات کرتا ہے۔ ''کوہسار زادے'' میں پختون معاشرے کا نقش نمایاں ہے جو برطانوی حکمرانی کو قبول نہیں کرتا۔ یہ کردار ان دنوں امریکہ کے ساتھ مصروف پیکار ہے۔ افسانہ ''نوکری'' پیٹ کی احتیاج کا ایک انوکھا زاویہ ابھارتا اور خیال کو نئی کروٹ دیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ رحمان مذنب کے اس قسم کے افسانوں کا ایک الگ مجموعہ مرتب کیا جاتا تو یہ حقیقت سامنے آجاتی کہ وہ پورے معاشرے کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں اور ان کے اظہار کے زاویے بوقلموں ہیں۔

..........o..........

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور، ۱۱ مئی ۲۰۰۲ء

باسی گلی

انور سدید

بعض لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ علماء کے گھرانے میں پیدا ہونے اور شاہی مسجد کے بلند میناروں کے سایوں میں پرورش پانے والے رحمان مذنب نے جب ہوش کی آنکھ کھولی اور ان کے تصور نے حالات وواقعات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت حاصل کرلی تو ان کے سامنے معصیت کا دریا بہہ رہا تھا۔ انہوں نے اس دریا میں ایسا غوطہ نہیں لگایا کہ اس میں ڈوب جاتے۔ بلکہ وہ اس دریا کے کنارے پر کھڑے ہوکر دریا میں لہروں کا تلاطم دیکھتے رہے اور اپنے مشاہدات جمع کرتے رہے۔ جو ان کے افسانوں کے لئے زندہ موضوعات بن جاتے اور پھر افسانے، کہانیاں اور ناول جنم لینے لگتے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ زندگی کے وسیع میدان سے انہوں نے اپنے اظہار کے لئے ماندے ہوئے ایک طبقے کو لیا اور اس طبقے پر مشتمل پورے معاشرے کی کہانیاں چکی جان، بالا خانہ، خوشبودار عورتیں اور رام پیاری عنوان کی کتابوں میں پیش کردیں۔ زیر نظر ان کا ناول "باسی گلی" پہلے ایک طویل افسانے کی صورت میں رسالہ "ادبی دنیا" میں شائع ہوا تھا۔ اردو کے ممتاز افسانہ نگار رام لعل نے اسے فکر اور فارم کی "کلیریٹی" کا مظہر افسانہ قرار دیا۔ شمیم حنفی صاحب نے انہیں ایک مخصوص تناظر کا منفرد قصہ نگار شمار کیا۔ اردو افسانے کے نباض اور نقاد مولانا صلاح الدین احمد نے لکھا کہ "ہمارے ملک میں بے شمار باسی گلیاں ہیں اور ان سے بھی زیادہ بسیط وعریض ہیں جہاں سے یہ باسی گلیاں اپنے گہرہائے آبدار اور درآمد کرتی ہیں اور انہیں بے آب کرکے معاشرے کے ڈلاؤ پر پھینک دیتی ہیں" مولانا صلاح الدین احمد کا یہ تبصرہ اتنا محرک ثابت ہوا کہ رحمان مذنب نے اس افسانے کی مزید جزئیات گرد وپیش سے جمع کیں اور ان سے

ایک پورا ناول مرتب کر دیا جس کا مرکزی کردار ''ایشاں'' ہے جو کھنڈر نہیں ہوتی بلکہ اپنے اندر سے ایک اور کردار ''ایشاں'' کو برآمد کرتی ہے جو اس بدنام معاشرے کے تسلسل کو قائم رکھتی ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ اس ناول میں رحمان مذنب نے گناہ کی کوکھ میں بھی خیر کو مرنے نہیں دیا بلکہ خیر کی بازیافت ایشاں کے کردار کو حیات جاوید عطا کر دیتی ہے۔ رحمان مذنب نے ہمیشہ بدی کے خلاف جہاد کیا ہے اور نیکی کا پرچم بلند کرنے کی سعی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدی اور برائی کے تناظر میں بھی ان کی عینک کا عدسہ صاف رہتا ہے اور مصنف کی معاشرتی اصلاح پسندی کا زاویہ قاری کے ذہن وقلب پر حاوی ہوتا چلا جاتا ہے۔

O

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور ۱۲، جنوری ۲۰۰۳ء

مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے

انور سدید

رحمان مذنب بنیادی طور پر تخلیقی مصنف تھے۔ 'اردو افسانہ' ناول اور ڈرامہ کی متعدد تصنیفات پیش کر کے انہوں نے اردو ادب میں اپنا ایک مستقل مقام بنا لیا تھا۔ ان کی دوسری بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مختلف النوع موضوعات کا مطالعہ جاری رکھتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ دوسری زبانوں کے نادر مضامین اہلِ اردو کے سامنے پیش کرتے رہیں۔ بالفاظ دیگر ان کے فن کی ایک اور روشن جہت ان کی ترجمہ نگاری تھی جس کی تخلیقی شان یہ تھی کہ ان کے تراجم ادبی نظر آتے اور قاری انہیں بڑی دلچسپی سے مطالعہ کرتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب ''مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے'' مولوی نور احمد کے انگریزی تالیف کا ترجمہ ہے۔ مولوی نور احمد انیسویں صدی کے آخری عشرے میں چٹا گانگ میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اس خطے میں جو بعد میں مشرقی پاکستان بنا مسلمانوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے میں اعلیٰ خدمات انجام دیں۔ آزادی کے بعد وہ پاکستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور مسلمانوں کے ذہنی افق کو وسیع کرنے کے لئے کتابیں تالیف کرتے رہے۔ زیرِ نظر کتاب بھی ان کا ایک ایسا ہی کارنامہ جس میں کئی سو کتابوں کا عطر جمع کیا گیا ہے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ اسلام نے مسلمانوں کو زوال تک نہیں پہنچایا بلکہ خود مسلمانوں نے اسلام کے اصولوں کو نظر انداز کر کے زوال مول لیا ہے۔ اس حقیقت کی تلافی اور زوال کو ترقی میں بدلنے کے لئے انہوں نے اسلاف کے کارنامے گنوائے اور یہ وقیع کتاب لکھی جس کے موضوعات میں ''اسلام اور سائنس'' ...... ''اسلام اور فلسفہ'' ...... اسلام اور تعلیم و ٹیکنالوجی ...... وغیرہ شامل ہیں۔ اس کتاب کا کینوس بہت وسیع ہے

اور آخری باب میں ''احیائے اسلام'' کی کوششوں کا جاں افروز تذکرہ کیا گیا ہے۔ رحمان مذنب نے اس کتاب کے ترجمے کو تخلیقی شان عطا کردی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ دورِ زوال کے مسلمانوں کو ارتقاء کا نیا قدم اٹھانے کی ترغیب دے سکتا ہے۔

..................O..................

گلبدن

انور سدید

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رحمان مذنب اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں لیکن جس رفتار سے ان کی کتابیں چھپ رہی ہیں، اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہمارے درمیان موجود ہی نہیں بلکہ اپنی موجودگی کا ثبوت بھی دے رہے ہیں اور ہمیں شرمندہ بھی کر رہے ہیں کہ جو کتابیں اس دور کے نفع پسند ناشرین ان کی زندگی میں نہ چھاپ سکے، اب ''رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ'' کے زیرِ اہتمام نہ صرف چھپ رہی ہیں بلکہ رحمان مذنب کی فعالیت کا ثبوت بھی دے رہی ہیں۔ واضح رہے کہ رحمان مذنب اپنی زندگی میں بالعموم افسانہ نگار شمار کئے گئے لیکن اب وفات کے بعد ان کی شہرت بطور ایک ناول نگار کے پھیل رہی ہے جس کا ایک ثبوت زیرِ نظر ناول ''گلبدن'' ہے۔ میں رحمان مذنب کی سب تحریروں کا قدیم ترین قاری ہوں۔ اب یہ ناول دیکھا ہے تو حیرت ہوئی کہ اس ناول کو انہوں نے کہاں چھپا کر رکھا ہوا تھا کہ مجھے خبر تک نہ ہوئی۔

''گلبدن'' محبت کی ایک رنگین داستان ہے لیکن اس کے مطالب و معانی اور واقعات و حالات کسی خواب سرا سے اخذ نہیں کئے گئے بلکہ یہ روشنیوں کے شہر لاہور کی کہانی ہے جو مسجد عالمگیری کے گرد و نواح کے اندھیروں میں پروان چڑھی اور زندگی کی حرارت کو جوانی کی بدمستیوں سے اجاگر کرتی چلی گئی۔ بنیادی طور پر یہ لاہور کی ''الف لیلیٰ'' ہے جس کے ہر کردار کی اپنی ایک شان ہے اور جس کے دامن میں سینکڑوں آرزوئیں بندھی ہوئی ہیں۔ کہانی سلسلہ در سلسلہ آگے بڑھتی اور زندگی کے حقیقی اسرار کھولتی ہے لیکن یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جس زندگی کو ہم نے دیکھا ہے وہ رحمان مذنب پر کسی اور انداز میں انکشاف آرا ہوتی ہے اور ناول ''گلبدن'' اس کی ایک عمدہ مثال ہے، جو رحمان مذنب کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

O

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور، ۴ مئی ۲۰۰۳ء

حصّہ سوم

مضامین ڈراموں پر

لاہور نامہ

انتظار حسین

ڈرامائی سیریز کے سلسلہ میں دو نام بلکہ تین نام سامنے آئے ہیں۔ پنجابی میں رحمان مذنب، اردو میں یونس جاوید اور عطاء الحق قاسمی۔ یونس جاوید تو اب لاہور ٹی وی کے دوسرے امجد اسلام امجد ہیں۔ بلکہ لگتا ہے کہ امجد اسلام امجد ریٹائر ہو گئے۔ اب یونس جاوید کا طوطی بولتا ہے یا بولتی ہے۔ تذکیرو تانیث کا فیصلہ آپ خود کرلیں۔ پچھلے دنوں یونس جاوید کا ڈرامہ "رگوں میں اندھیرا" بہت ہٹ گیا تھا بلکہ سوپر ہٹ۔ لاہور ٹی وی نے سوچا کہ جب اس کا نام اتنا نکل گیا ہے تو پھر اس میں سے مزید کچھ نکالا جائے تو اب اسی ڈرامہ کے چند کرداروں کو لے کر یایوں کہہ لیجئے کہ اس ڈرامہ میں جو تھانہ نظر آیا تھا اس تھانے کے مضمون کو اب انہوں نے اور بڑھایا اور اس سے نئے مضمون پیدا کرنے کی ٹھانی ہے۔

اسی کے ساتھ لاہور ٹی وی نے ایک نیا چہرہ دریافت کیا ہے۔ یہ عطاء الحق قاسمی ہیں۔ نہ صرف جانے پہچانے ہیں بلکہ انعام یافتہ بھی ہیں۔ مگر ٹی وی کے لئے وہ ایک نیا چہرہ ہیں۔ کالم نگاری میں فتوحات حاصل کرنے کے بعد اب وہ ٹی وی کی سیریز کے میدان میں فتوحات کرنے نکلے ہیں تو ایک سیریز ان کے نام کی چلے گی۔

اور رحمان مذنب کہاں کا ڈوبا کہاں جا کر نکلا ہے یادش بخیر حلقۂ ارباب ذوق کا قیوم نظر والا زمانہ۔ اس زمانہ میں حلقہ میں سب سے زیادہ بولنے والوں میں رحمان مذنب ہوا کرتے تھے۔ قیوم صاحب نے حلقہ سے ہاتھ کھینچا تو یہ ستارہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اب جا کر یہ ستارہ بدلی سے نکلا ہے اور ٹی وی کے آسمان پر آ کر چمکا ہے۔ ان کی سیریز کی بھی بانگی دیکھی۔

O

روزنامہ "مشرق" لاہور، مورخہ ۸ جولائی ۱۹۸۳ء

پتن

افضل آرش

رواں سہ ماہی میں لاہور ٹیلی ویژن نے بڑے بھرپور اور مقصدی پروگرام دیئے ہیں۔ ان پروگراموں کی ترتیب و تشکیل میں لاہور ٹیلی ویژن کے جنرل مینجر جناب نثار حسین اور سکرپٹ ایڈیٹر یونس منصور نے بطور خاص دلچسپی لی۔ اس وقت ٹی وی سے پیش کئے جانے والے سلسلہ وار کھیلوں میں عطاء الحق قاسمی کا ''اپنے پرائے'' اپنے اختتام کو پہنچا۔ ''جنگل'' ابھی چل رہا ہے اور لاہور کی ایک مقبول سیریل ''پتن'' بھی روز بروز لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ یہ واحد ایسی سیریل ہے جسے عوام و خواص ہر دو طبقوں نے پسند کیا ہے۔ اسے لکھنے والے ملک کے ممتاز افسانہ نگار جناب رحمان مذنب ہیں جن کی شخصیت ادبی حلقوں کے لئے چنداں تعارف کی محتاج نہیں۔ جناب مذنب خود بھی لوگوں میں گھل مل کر زندگی گزارنے کے قائل ہیں، یہی سبب ہے کہ ''پتن'' حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس کھیل میں واضح طور پر ''خیر و شر'' کی آویزش دکھائی گئی ہے۔ مثال کے طور پر پیراں دتہ (زبیر) شر کا نمائندہ کردار ہے، اس کی بڑی بہن مہتاب (نگہت بٹ) چھوٹے بھائی کی طرفدار ہے۔ اس طرح پیراں دتہ بے باک اور آزاد ہو جاتا ہے۔ وہ ''پتن'' کا تقدس اور وقار ختم کر کے اسے اپنے جرائم کی جائے واردات بناتا ہے۔ پہلے وہ خوشیا ملاح (عنایت شاہ مرحوم) اور اس کے بعد حیاتا ملاح کو شریکِ جرم کرتا ہے۔ عبدالحکیم (محبوب عالم) اور بدر دین (فردوس جمال) خیر کے نمائندہ کردار ہیں اور وہی شیطانی ٹولے کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔

کہانی کی کڑیاں نہایت ہنرمندی اور چابکدستی سے ایک سے دوسرے واقعہ سے ملائی گئی ہیں اور یوں یہ سارا ڈرامہ ایک اکائی کی شکل اختیار کر گیا ہے، فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو ''پتن'' مکمل ڈرامہ ہے جو اپنے پلاٹ کی بنت کاری اور کیریکٹرائزیشن کے حوالے سے ہر قسط میں

اپنے اندر قارئین کی دلچسپی کا تازہ سامان لئے ہوئے جلوہ گر ہوتا ہے۔

''پتن'' کے ہدایت کار عبدالعزیز جتنی مہارت اور تندہی سے اس کھیل کو پیش کر رہے ہیں اس میں ان کی صلاحیتوں کا اعتراف بہر حال کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف پیشکش کے معیار کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے بلکہ کاسٹ کے انتخاب میں بھی بے پناہ ذہانت کا ثبوت دیا ہے کہ ہر کردار واقعات کی سچی اور کھری تصویر نظر آتا ہے۔ تاج دین اور عبداللہ کے مزاحیہ جوڑے نے کھیل میں جان ڈال دی ہے۔

جناب نثار حسین، یونس منصور، رحمان مذنب، عبدالعزیز اور اس سیریل میں کام کرنے والے تمام فنکار اس لحاظ سے قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے بطور ''ٹیم ورک'' کے کام کیا ہے اور ایسی خوبصورت سیریل پیش کر کے لاہور ٹی وی کا معیار پہلے سے بلند کیا ہے۔ اگر یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا اور ایسے مقصدی اور معیاری کھیل پیش کئے جاتے رہے تو یقیناً پاکستانی عوام بھارت کی فحش، نفرت انگیز، دیو مالائی اور چیپ جنسی فلمیں دیکھنا نہ صرف چھوڑ دیں گے بلکہ ان کے نام سے بھی نفرت کرنا شروع کر دیں گے۔

..........o..........

مطبوعہ روزنامہ ''جنگ'' لاہور، اکتوبر ۱۹۸۴ء

تکون

فدا احمد کاردار

کبھی کبھی ٹی وی پر ایسا سیریل پیش ہوتا ہے جو پوری طرح ناظرین کی توجہ جذب کر لیتا اور اپنی انفرادیت کے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ ''تکون'' ایسا ہی کامیاب اور جاذب توجہ سیریل تھا جسے ۱۳ قسطوں میں ختم کیا گیا، جو مدت کے بعد دیکھنے میں آیا اور مدتوں یاد رہے گا۔

'تکون' رحمان مذنب کا تازہ شاہکار تھا جسے ٹی وی پر پیش کیا گیا۔ خاص و عام میں بے حد مقبول ہوا۔ اس معاشرتی تمثیل میں آج کے مسائل، بحسن وخوبی پیش کیے گئے جو پیسے کی پیداوار ہیں۔ نودولتیوں کے چلن سے معاشرے میں جو تہذیبی، اخلاقی اور روحانی زوال پیدا ہوا ہے 'تکون' میں اسی کی عکاسی کی گئی ہے۔ شر کے اس دور میں خیر کی آواز بھی سنائی دیتی اور بڑی گھن گرج سے سنائی دیتی ہے۔

ہوسِ زر نے پرانی قدریں پارہ پارہ کر دی ہیں۔ پیسے کی چمک نے لوگوں کو یہاں تک اندھا کیا ہے کہ انہیں اپنے بھی نظر نہیں آتے۔ خونی رشتے بھی ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ ایسے میں وہی سلامت رہتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح پیسے کی چمک دمک اور آنچ سے اپنا دامن بچا لیتے ہیں۔

ڈراما سیریل 'تکون' میں تفریح کا وافر سامان موجود تھا۔ کہانی میں بڑی گرفت تھی۔ کردار روزمرّہ کی زندگی سے لئے گئے تھے اور مختلف طبیعتوں اور جذبوں کی ترجمانی کرتے تھے۔ ان میں بڑا تنوع تھا۔ ہر کردار اپنی جگہ موزوں تھا۔ پلاٹ کی بنت بڑی عمدگی سے کی گئی تھی۔ ٹی وی پر کبھی کبھی ہی ایسے زوردار کھیل دیکھنے میں آتے ہیں۔

o

تکون

لاہور ٹی وی نے نئی سہ ماہی کا آغاز ملک کے معروف ڈراما نگار رحمان مذنب کے اردو سیریل ''تکون'' سے کیا ہے۔ عنوان معنی خیز بھی ہے اور عام ڈگر سے ہٹ کر بھی۔ آرٹسٹوں کی ایک اچھی ٹیم چنی گئی ہے۔ رحمان مذنب نے اس سے قبل الف لیلہ' کی سیریز میں متعدد ڈرامے لکھے ہیں۔ علاوہ ازیں چند اور بھی اچھے کھیل پیش کر چکے ہیں۔ ان کا پنجابی سیریل ''پتن'' جسے عبدالعزیز نے ڈائرکٹ کیا نہایت دلچسپ اور کامیاب ثابت ہوا۔ انہیں بیک وقت اردو اور پنجابی پر عبور حاصل ہے۔ ڈراما اور افسانہ ان کے خاص اصناف ادب ہیں۔ اس ضمن میں نصف صدی کا تجربہ رکھتے ہیں۔ ۱۹۳۴ء میں انہوں نے ایک مختصر ڈرامے ''سپاہی'' سے ابتداء کی تھی۔ اسی سال موسمِ سرما میں ان کا ایک کھیل میاں عبدالحمید مرحوم (رئیس اعظم لاہور) کے منڈوے ...... عزیز تھیٹر میں نامور اسٹیج ایکٹر ماسٹر اللہ بخش تانتا کے زیرِ ہدایت پیش ہوا۔ تھیٹر کے زوال کے بعد ریڈیو کے لئے ڈرامے اور فیچر لکھنے لگے۔ پچھلے چند سال سے ٹی وی کے لئے ڈرامے لکھ رہے ہیں۔ ان کا موجودہ اردو سیریل ''تکون'' ابھی شروع ہوا ہے۔ امید ہے کہ ان کے سابقہ کھیلوں کی طرح یہ بھی کامیاب ثابت ہوگا۔

ابتدائی قسطوں میں منیر ظریف اور ممتاز علی نے ناظرین کی توجہ جذب کر لی ہے۔ محمد عظیم ''تکون'' کے پروڈیوسر ہیں۔ آثار بتا رہے ہیں کہ یہ دلچسپ اور عمدہ سیریل ہوگا۔ پاکستان ٹی وی بالخصوص لاہور اسٹیشن، امرتسر ٹی وی کی زد پر ہے۔ مقابلہ سخت ہے لیکن لاہور کے لئے کم، امرتسر کے لئے زیادہ۔ لاہور کا ڈرامائی ماحول قابلِ رشک ہے۔ پاکستان ٹی وی کا مقابلہ کرنے کے لئے امرتسر ٹی وی کے پاس فیچر فلموں اور چترہار کے سوا کچھ نہیں۔

امرتسر ٹی وی فیچر فلموں اور چتر ہار ایسی اخلاق سوز، گندی اور جنس آلودہ چیزوں کا سحر توڑنے کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ ڈرامے کے شعبے پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے اور بھارت کے ساونتوں، کلاکاروں اور سیکولر ازم کے علمبرداروں کو تہذیبی و ثقافتی سطح پر مات دی جائے۔ یہ ہمارا فرضِ منصبی ہے۔ بھارتی کلچر کی یلغار کو روکنے کا یہی آزمودہ طریقہ ہے۔

..........o..........

روزنامہ "مشرق" لاہور مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۸۵ء

سال گذشتہ کی آخری ششماہی بڑی بھرپور ثابت ہوئی۔ لاہور ٹی وی کے پروگرام بالخصوص ڈرامے بہت پسند کئے گئے۔ ان میں رحمان مذنب کا پنجابی سیریل "پتن" جسے عبدالعزیز نے ڈائرکٹ کیا، عوام و خواص کی توجہ کا مرکز رہا۔ اگرچہ امرتسر ٹی وی کی فلمیں اس سے متصادم رہیں، پھر بھی ناظرین نے اسے باقاعدگی سے دیکھا۔ یہ سیریل بھارت میں بھی مقبول ہوا۔ وہاں پنجابی ڈرامے میں اس کے ٹکڑے بھی برتے گئے۔

سالِ رواں کی پہلی سہ ماہی انتخابات کی سرگرمیوں میں گزر گئی اور نیا اردو سیریل "سکون" پیش نہ ہوسکا۔ یہ بھی رحمان مذنب کی تصنیف ہے۔ رحمان مذنب پچھلی آدھی صدی سے افسانے، ڈرامے اور فیچر لکھ رہے ہیں۔ ۱۹۳۴ء میں ان کا پہلا ڈراما عزیز تھیٹر (لاہور) میں پیش ہوا تھا۔ بعد ازاں وہ ریڈیو کے لئے باقاعدگی سے ڈرامے اور فیچر سپردِ قلم کرنے لگے۔ ڈرامے اور تھیٹر کی عالمی تاریخ بھی لکھ رہے ہیں۔ ٹی وی رائٹرز کی فہرست میں سب سے سینئر ڈرامانویس کی شمولیت قابلِ قدر ہے۔

..........o..........

روزنامہ "جنگ" لاہور ٹی وی ایڈیشن، مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۸۵ء

''وسیٹرہ''

لاہور ٹی وی نے سیریل ڈراموں میں بڑا نام پیدا کیا ہے اور اب تک متعدد کامیاب سیریل پیش کئے ہیں۔ پچھلے سال کی آخری ششماہی میں ''پتن'' ایسا کامیاب سیریل دیکھنے میں آیا جس کے مصنف رحمان مذنب، پروڈیوسر عبدالعزیز اور اداکار فردوس جمال کو ٹی وی ایوارڈز کے لئے نامزد کیا گیا۔ رواں سہ ماہی میں رحمان مذنب کی ایک اور سیریل وسیٹرہ دکھائی جارہی ہے۔ رحمان مذنب ڈرامے کے سلسلے میں نصف صدی کا تخلیقی تجربہ رکھتے ہیں۔ ''وسیٹرہ'' ان کا تیسرا ٹی وی سیریل ہے۔ ''پتن'' کے علاوہ وہ اردو سیریل ''سکون'' بھی تحریر کر چکے ہیں۔

موجودہ سیریل...... ''وسیٹرہ''...... آغوشِ فطرت کے پالے ہوئے انسانوں کے تیور دکھاتا ہے۔ سکندر پور کے رہنے والے خیر وشر کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ان کی گذرگاہوں میں زمین کی چمک اور پگ ڈنڈیوں کی دھول کھیلتی ہے۔ ان کے گھر اور کھیت اونچے نیچے، ہموار اور ناہموار سروں سے گونجتے ہیں۔ چودھری مراد، نادر، ملک دلاور، ملکانی جیناں، ملکانی نوراں اور ملکانی زینت ایک ہی گھرانے کے لوگ ہیں۔ آپس کے رشتے انہیں ملاتے الجھاتے ہیں ان کے رویئے بدلتے ہوئے موسموں کی طرح متنوع ہیں۔ ان کے روز وشب کی شیرازہ بندی محبت اور نفرت کے تانوں بانوں سے ہوتی ہے۔

وسیٹرہ کی چار قسطیں ٹیلی کاسٹ ہو چکی ہیں۔ ان اقساط سے عیاں ہوتا ہے کہ یہ سیریل نہایت کامیاب اور منفرد ثابت ہوگا۔ رحمان مذنب نے بڑی مہارت اور خوبصورتی سے انسانی زندگی، جذبوں، رویوں اور سوچ کی عکاسی کی ہے۔ مکالمے دلکش نیز ماحول اور کردار سے ہم آہنگ ہیں۔ ''وسیٹرہ'' کے پروڈیوسر اور ہدایت کار عبدالعزیز ہیں جبکہ کاسٹ میں غیور اختر، زبیر، فوزیہ درّانی، جاذبہ سلطان، عطیہ شرف، راحیلہ طاہر، انور علی، طلعت صدیقی، نذیر حسینی اور ممتاز علی ایسے منجھے ہوئے آرٹسٹ شامل ہیں۔

O

روزنامہ ''جنگ'' لاہور، ۳ فروری ۱۹۸۶ء

”ویہڑہ“

خالدہ مینا

لاہور ٹی وی سے پنجابی سیریز ڈرامہ ”ویہڑہ“ بخیر و عافیت پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ اسے رحمان مذنب نے لکھا تھا اور عبدالعزیز نے ہدایات دی تھیں۔ ”ویہڑہ“ ایک معیاری سیریل تھا جسے ہر خاص و عام نے پسند کیا۔ لاہور ٹی وی نے علاقائی کلچر کے اظہار کے لئے پنجابی ڈراموں کو بڑا فروغ دیا ہے۔

”ویہڑہ“ خوبصورت دیہی ماحول میں پیش ہوا، کردار اور مسائل دیہی تھے۔ یہ ایک معاشرتی سیریل تھا جس میں خیر و شر کا تصادم اس کے فطری انداز میں رونما ہوا۔ ”ویہڑہ“ عدل و انصاف کا موروثی سمبل تھا۔ یہاں چودھری مراد کے آباؤ اجداد اپنے گاؤں والوں کے قصیے چکاتے تھے۔ ان کے صحیح فیصلوں کی بدولت ”ویہڑہ“ کا نام اونچا ہوا لیکن جب یہ ”ویہڑہ“ چودھری مراد کے ورثے میں آیا تو ناانصافی کا شکار ہوا۔ ”ویہڑہ“ دیہات کا نہایت قیمتی اثاثہ ہے اور جدید مصالحتی عدالتوں کا نظام اسی کی پیداوار ہے۔ چودھری مراد اور اس کی تیز طرار بیوی نے سکندر پور کو برباد کر دیا۔ زر زیور، شادی بیاہ، باہمی تعلقات اور رہنے سہنے کے ماحول میں ابتری پھیلا دی۔ خاندان کی اکائی ٹوٹ گئی۔ انجام کار نیک دل چودھری کی مساعی سے، بحران کی نزاعی کیفیت دور ہوئی۔

کہانی بے حد دلچسپ اور فکر انگیز تھی، جاگیرداری کی پیدا کردہ اونچ نیچ کے خلاف بغاوت اور احتجاج کیا گیا۔ چودھری نادر، مراد کا بیٹا اس بغاوت کا علمبردار تھا۔

کرداروں میں بڑا تنوع تھا، تمام مختلف النوع کردار ایک دوسرے سے مربوط تھے۔

”ویہڑہ“ نہایت کامیاب پنجابی سیریل تھا، اگر ایسے ہی عمدہ پنجابی سیریل ٹیلی کاسٹ ہوتے رہے تو اس سے تفریح و اصلاح کا وہ اعلیٰ مقصد پورا ہو سکے گا جس کے لئے ٹی وی کوشاں ہے۔

O

روزنامہ ”جنگ“ لاہور، ۱۶ اپریل ۱۹۸۶ء

سفر

ڈرامے کی کہانی، مکالمے اور فنکاروں کی ٹیم اچھی ہو تو آج ڈش اور کیبل کے دور میں بھی ڈرامہ ٹی وی ناظرین کی توجہ حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ اس بات کا ثبوت معروف افسانہ نگار اور ناول نویس رحمان مذنب نے مرنے کے بعد اپنی ڈرامہ سیریل ''سفر'' سے دیدیا ہے۔ ڈش اور کیبل کلچر نے پاکستانی پروڈیسروں کو ''ملٹی سٹارز'' اور ''ملٹی نیشنز'' پروڈکشنز بنانے پر مجبور کر دیا ہے لیکن اس دور میں بھی ہدایتکار ناصر عزیز نے اپنی دھرتی کی کہانی اور اپنے روز مرہ کے مسائل کو ترجیح دیتے ہوئے اپنی سرزمین پر ایک اچھی ڈرامہ سیریل بنا کر ٹی وی ناظرین کو چونکا دیا ہے۔ 50 منٹ دورانیہ کی 13 قسطوں پر مشتمل ڈرامہ سیریل ''سفر'' کی کہانی خالصتاً پنجاب کے پس منظر میں ہے لیکن ناصر عزیز نے چابکدستی سے اس میں لاہور' راولپنڈی' پشاور اور کراچی کے فنکاروں سے مختلف کرداروں سے ایسے رنگ بھرے ہیں کہ نئے سال میں ٹی وی کی پہلی سہ ماہی کا گراف ماضی کے حوالے سے کہیں بہتر نظر آ رہا ہے۔ اس سیریل کی ابھی ابتدائی اقساط ہی ٹیلی کاسٹ ہوئی ہیں لیکن اس کی کہانی اور پروڈکشن کی اٹھان اس قدر بہتر ہے کہ چھوٹی موٹی کمی کا احساس تک نہیں ہوتا ہے۔

O

روزنامہ ''خبریں'' لاہور۔ جون ۲۰۰۱ء
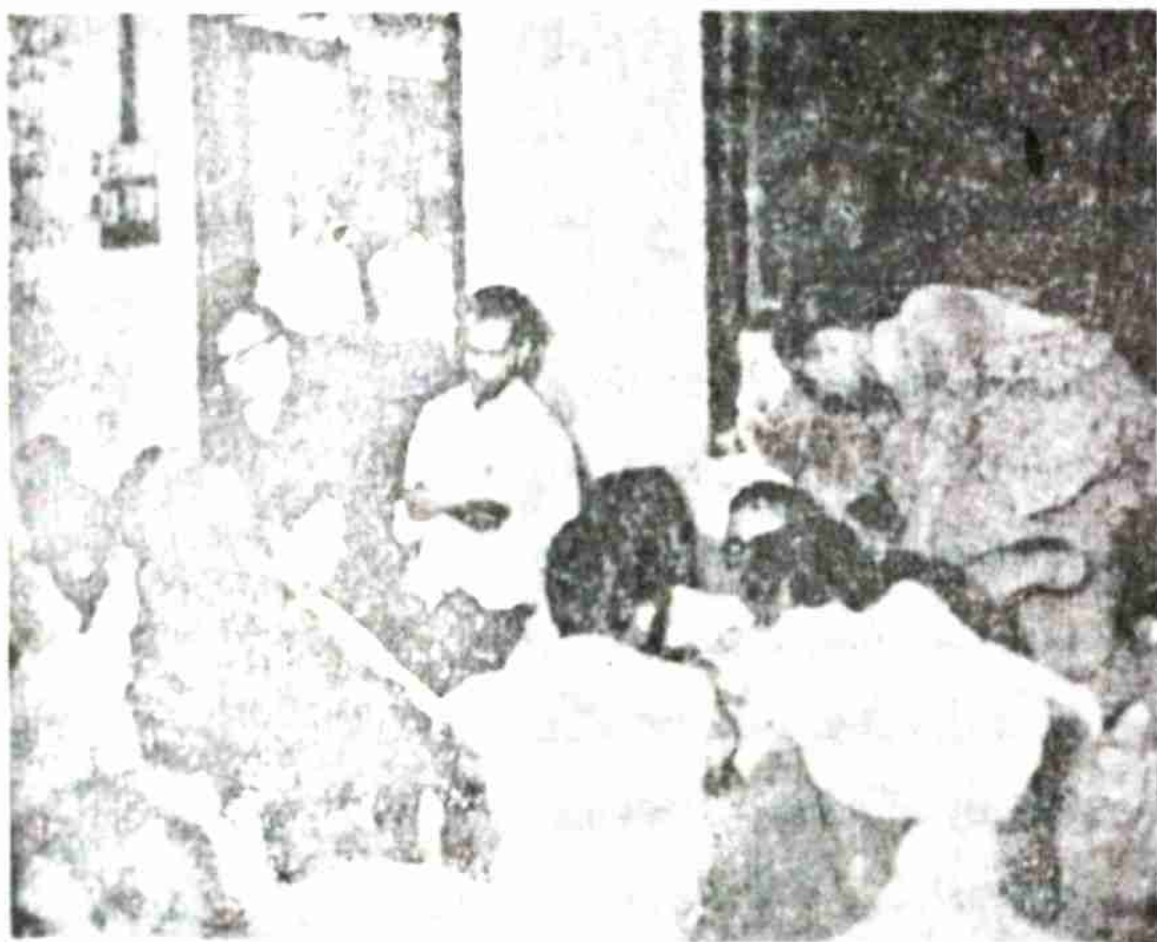
RAHMAN MUZNIB reciting his poem at the Dayal Singh College "mushaira". Sitting next to him is Principal Abid Ali Abid, who presided.

An Impressive Voice

The Khushk Programme of this week was contributed by Rehman Muznib and Feroze Nizami. I heard Rehman for the first time on the radio and found that the microphone was friendly towards him. He has a voice of the right quality and pitch for a broadcaster. He seems to have made a painstaking study of the Greek Theatre and put over a very informative speech which was enlivened with two dramatised illustrations from Antigone and Medea- two classics of the Greek drama. The illustrative material was elegantly translated into voice and sounded impressive.

The Civil & Military Gazette, Saturday, Nov 13, 1954

حصّہ چہارم

انٹرویوز

رحمان مُذنب سے

آدھی ملاقات

گل نوخیز اختر

گل نوخیز اختر: تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے! ازرہ تعارف کچھ کہیے!

رحمان مذنب: برادرم! خاکسار 15 جنوری 1915ء کو بیرون ٹکسالی دروازہ، لاہور میں علماء کے ایک معروف گھرانے میں پیدا ہوا۔ والد مفتی عبدالستار، بادشاہی مسجد، لاہور کے مفتی تھے۔ نانا شمس العلماء پروفیسر مفتی محمد عبداللہ ٹونکی (رئیس شعبہ ادبیات عربی، اورینٹل کالج لاہور) انیسویں صدی کے اواخر میں ریاست ٹونک (راجپوتانہ موجودہ راجستھان، بھارت) سے لاہور آئے۔ انہی کے ایماء پر ان کی خالہ زاد بہن کلثوم بی اپنی دختر نیک اختر خیر النساء (ہماری والدہ) ریاست ٹونک سے لاہور آئیں۔ ہم سب بہن بھائی لاہور میں پیدا ہوئے۔ گھر وہاں تھا جہاں ادھر اذان سنائی دیتی اور ادھر پائل کی جھنکار۔ ہیجڑوں کی تالیاں اور قہقہے نیز عزیز تھیٹر (موجودہ پاکستان ٹاکیز) کے باہر تشہیری شہنائیاں ڈھول کی تھاپ کے ساتھ رنگ جماتیں۔ دراصل میرا محلہ رنگ رلیوں کا گڑھ تھا اور پورے لاہور میں اس جیسا دوسرا دلآویز علاقہ نہ تھا۔ یہ علاقہ اپنی تمام رعنائیوں سمیت میرے رگ وپے میں سرایت کر گیا۔ آج بھی اس کے خط و خال میری سوچ میں تھرکتے رہتے اور مجھے افسانہ لکھنے پر اکساتے رہتے ہیں...... میرا گھر: بڑی پاکیزہ اور ارفع ہستیوں کے دم قدم سے آباد تھا جہاں پاکیزگی تھی، شائستگی تھی، پرہیزگاری تھی۔ یہاں صاف ستھری، شین عین قاف کے صحیح لہجے میں اردوئے معلیٰ بولی جاتی تھی۔ قال قال رسول اللہ ہمہ وقت سنائی دیتا۔ پڑوس میں صاحبزادہ میاں عبدالحمید کی حویلی اور کٹڑی تھی۔ کچھ دور پروفیسر مفتی محمد عبداللہ کی اونچی حویلی تھی۔ یہ حویلی چھوٹی اینٹوں کی بنی تھی اور آج بھی سر بلند ہے۔ ان کے مقابل احمد منزل (مملوکہ احمد صاحب گورنز کوفہ) تھی، برابر میں شمس منزل، ایک تاریخی عمارت تھی جہاں آغا حشر کاشمیری

اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم رہا کرتے تھے۔ وہیں بازار جج محمد لطیف تھا۔ انہی جج صاحب کی تاریخ لاہور (بزبان انگریزی) ایک معتبر تالیف ہے۔ اسی بازار میں پروفیسر سید طلحہ حسنی (مفتی عبداللہ ٹونکی کے بعد رئیس شعبہ عربی، اورینٹل کالج) کا مسکن تھا۔ سر شہاب الدین کے برادر نسبی چوہدری سردار علی، میاں گھسیٹا (سابقہ وزیر افتخار تارڑ کے دادا) اور ان کے نامور پسران میاں جلال الدین اور میاں احمد دین وکیل، میاں سلطان محمود اور کتنے ہی دیگر شرفاء یہاں آباد تھے۔ یہیں میرا گھر تھا۔ یہ ماحول کا ایک رخ ہے۔ میرا گھر میری پہلی درسگاہ ہے جو 1937ء تک قائم رہی۔ علم و عمل کی روشنی مجھے بخشتی رہی۔ آج بھی یہ گھر پوری توانائی سے میرے دماغ میں آباد ہے۔ اس کی بدولت میں نے اپنا ادبی اور علمی قبلہ درست کیا۔ مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے (انعام یافتہ کتاب)، اسلام اور جادوگری اور دینِ ساحری (زیر طباعت تیسرا ایڈیشن)، یونان کا عہدِ جاہلیت اور دیو مالا کا ارتقاء (تحقیقی مقالہ) اور بعض دیگر علمی اور تحقیقی کام گھر کی تربیت گاہ کی بدولت انجام پذیر ہوئے۔ والد صبح دم حدیث کا درس دیتے۔ سارا دن علمی گفتگو میں گزرتا۔ سوالات سے لدے پھندے لوگ...... آتے اور جوابات لے کر رخصت ہوتے۔ فتاویٰ بھی لکھے جاتے۔ مفقود الخبر کے فتوؤں کی بھرمار ہوئی۔ پہلی جنگ عظیم میں ہزاروں لاکھوں انسان لقمہ اجل ہوئے۔ ہزاروں عورتوں کے شوہر مفقود الخبر ہوئے۔ انہیں فتوے درکار تھے کہ وہ اپنے پیاروں کی کب تک راہ دیکھیں اور کب تک نان و نفقے کے بغیر دن گزاریں؟ والد امام مالکؒ کے حوالے سے فتویٰ دیتے۔ مجھے اس فتوے کی عبارت یاد ہو گئی۔ میں مفقود الخبر کے فتوے سپردِ قلم کرتا۔ ہر فتوے کے آخر میں لکھتا: وھو الموفق للصواب۔ نیچے والد کی مہر لگاتا، والد دستخط ثبت کرتے اور سائل کے حوالے کر دیتے۔ رد المختار فی شرح در المختار، فتاویٰ عالمگیری اور ایسی کتنی ہی موٹی موٹی کتابیں گھر میں موجود تھیں۔ والد عربی کے سکالر تھے۔ تراجم بھی کرتے۔ میری تحویل میں ان کا ایک ترجمہ موجود ہے۔ اللہ نے چاہا تو میں اسے شائع کروں گا۔ مفتی محمد عبداللہ ٹونکی بھی گاہے گاہے ہمارے یہاں آتے اور علمی گفتگو دیر تک چلتی۔ ماموں مفتی انوار الحق (وزیر مالیات ریاست بھوپال) کبھی کشمیر کی سیر کو جاتے تو ہمارے یہاں قیام کرتے۔ موصوف غالب کے نسخہ حمیدیہ کے پہلے مولف تھے۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے بعد ازاں نسخہ حمیدیہ مرتب کیا...... مجھے اپنی پہلی درس گاہ میں مفتی محمد عبداللہ ٹونکی

اور والد کی صحبت سے یہ سبق ملا کہ پتہ مارو، ہر سوال کا علمی حل تلاش کرو، درویشی اختیار کرو۔ زر کے لئے نہیں علم کے لئے جینا سیکھو۔ علاوہ ازیں بڑی دولت یہ ملی کہ آج بھی زبان کی صحت پر زور دیتا ہوں جبکہ دوئم درجے کا مال عام ہے اور صحیح زبان عموماً پسند خاطر نہیں .... 1936ء میں جب میں نے ماہنامہ ''ہمایوں'' کے ایڈیٹر مولانا حامد علی خاں کو ایک ڈراما انگریزی سے اردو میں ''سپاہی'' کے نام سے منتقل کر کے بھیجا تو جواباً ان کا جو گرامی نامہ موصول ہوا اس میں مجھ سے پوچھا ''ایسی اعلیٰ، منجھی ہوئی بامحاورہ زبان میں نے کہاں سے سیکھی؟'' پھر دوسرا ڈراما ''نغمہ موت'' بھیجا تو انہوں نے تحسینی خط بھیجا تو لکھا کہ میں ادھیڑ عمر کا بندہ ہوں۔ یہ وہ عمر ہے جب یونانی اپنے ہیروز کے بت تراشتے اور ان کی عظمت کا اعتراف کرتے تھے۔ میری عمر تب اٹھارہ انیس سال تھی۔ اس پر میں نے اپنا گھریلو پس منظر مولانا کو بتایا کہ بادشاہی مسجد کے مفتی مولانا محمد عبدالستار کا بیٹا ہوں، نانا شمس العلماء پروفیسر محمد عبداللہ ٹونکی ہیں۔ ماموں بھوپال کے وزیرِ تعلیم (بعد ازاں وزیرِ مالیات) مفتی انوار الحق ہیں۔ مجھے اپنی پہلی درسگاہ ''گھر'' سے گراں قدر علمی معلومات کے ساتھ اعلیٰ زبان بھی ملی۔ ہمارے یہاں بڑی صحت سے زبان کا استعمال ہوتا۔ تلفظ اور محاورے کا خاص خیال رکھا جاتا۔ گھر ہمہ دانی کا نہایت اہم مرکز تھا۔ میں نے 1932ء سے قلمی زندگی کا باقاعدگی سے آغاز گیا۔ نذیر لدھیانوی مرحوم کے مصور ویکلی میں فلمی مضامین لکھنے لگا۔ ڈرامے ''ہمایوں'' کے لئے لکھتا، شعر بھی کہتا۔ میری پہلی نظم ''دوپہر'' ہمایوں ہی میں چھپی، بعد ازاں افسانے کی طرف آیا۔ میری دوسری درس گاہ گھر سے باہر تھی۔ یہ میری اوپن یونیورسٹی تھی۔ میری تربیت، تجربے اور مشاہدے کی نہایت اہم، موثر اور بہت بڑا ذریعہ تھی۔ ادھر گھر سے باہر قدم رکھا اور یکسر نئی دنیا میں پہنچ گیا۔ یہاں نیک و بد، چنگے مندے، شریفوں، اوباشوں، بدمعاشوں، جیب کتروں، جواریوں، رنڈیوں، نکیائیوں اور ان کے دلوں، تماشا بینوں اور انواع واقسام کے لوگوں سے پالا پڑا۔ میں ان میں رچ گیا۔ نکیائیوں کے ڈربوں، ڈیرہ دارنیوں کے ڈیروں اور بالا خانوں، چنڈو خانوں، جوا خانوں، کلال خانوں، بدبودار چائے گھروں اور تھیٹروں وغیرہ میں میری آمدورفت شروع ہوئی۔ علمی مجلسوں، بیٹھکوں، جلسوں جلوسوں، مداریوں اور مجمع گیروں کے مجمعوں میں شریک ہونے لگا۔ آوارہ گردی کی عادت بھی پڑی۔ ایک مرتبہ ایک بینڈ باجے کے

ساتھ چلتے چلتے اتنی دور نکل گیا کہ واپسی پر راستہ بھول گیا۔ بصد مشکل گھر لوٹا تو والد نے آوارہ گردی کی سخت سزا دی۔ بید سے پٹائی کی...... بہر حال میں نے ہر نوع کے بندوں کے اطوار، طرزِ بود و باش، طرزِ احساس، جذبات اور محسوسات کا کھل کر ہر نوع کی **Mental Reservation** سے آزاد ہو کر مشاہدہ اور مطالعہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ ہر بندے میں کوئی کہانی...... مکمل یا نامکمل کہانی، ڈراما یا ناول چھپا ہے۔ میں نے ہر ایک کے اندر جھانکا، کہانی، ڈرامے یا ناول کا کھوج لگایا، میں افسانہ بن گیا۔ میں نے لوگوں کے مسائل، معائب اور الجھنوں کو سمجھا، لوگوں کو جانا پہچانا اور اپنے افسانوں اور ڈراموں میں رنگ بھرا۔ میری تیسری درسگاہ تپڑ سکول سے لے کر دیال سنگھ کالج تک جاتی ہے۔ مجھے ماسٹر ولی داد، ماسٹر دین محمد سے لے کر شمس العلماء پروفیسر تاجور نجیب آبادی، پروفیسر عابد علی عابد، پروفیسر سہائے، پروفیسر سوم ناتھ چِب (جو بعد ازاں آل انڈیا ریڈیو...... لکھنؤ میں سٹیشن ڈائریکٹر ہوئے)، پروفیسر سیٹھی ایسے مخلص، محنتی اور فرض شناس اساتذہ سے علم حاصل کرنے کا موقع ملا لیکن کالجوں میں وقت بہت ضائع کرنا پڑتا، بہر حال میری سمت درست رہی۔ قلم کاری اور مطالعہ کتاب کا جنون درسگاہ کی چار دیواری سے کئی گنا زیادہ رہا۔ میں نے سوفوکلیز، ایسکی لس، یوری پیدیز، ہومر، ایرس طوف آنیز، کالیداس، بھاس، جارج برنارڈ شا، شیکسپیئر اور کتنے ہی دوسرے فنکاروں کے شہ پارے پڑھے۔ جنھیں پڑھا اور جن سے علم حاصل کیا ان کے ناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ فریزر کی **Golden Bough** سے لے کر والس بج کی **Osiris** اور **Book of the Dead** تک اینتھروپالوجی نیز دوسرے موضوعات کی سینکڑوں کتابیں میں نے درسگاہ سے باہر پڑھیں۔ میرے مطالعے کے موضوعات کوئی درجن بھر ہیں۔

گل نوخیز اختر: کیا موجودہ افسانے میں علامات اور تجرید ختم ہو گئی ہے؟

رحمان مذنب: میں علامت اور تجرید کا ذکر بعد میں کروں گا۔ تجربے کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ تجربہ افسانے کی بنیاد ہے۔ جس طرح مٹی میں بیج کے بغیر پانی اور دھوپ کا عمل کارگر ثابت نہیں ہوتا اسی طرح تجربے کے بغیر بات نہیں بنتی۔ تجربے سے مراد وہ مشاہدات، محسوسات، جذبات، سوچ، واردات، حادثات اور کیفیات ہیں جو فن کار کی ذات اور ان لوگوں کی ذات سے

واسطہ رکھتی ہوں جن سے فن کار کو پالا پڑا ہو۔ خلوص، صداقت، حقیقت اور لگن ایسے اوصاف ہیں جن کا جوہر تجربے ہی کی وساطت سے کھلتا ہے۔ تجربہ جس قدر گہرا اور شدید ہوگا، جس قدر اس میں تنوع ہوگا، جس قدر وسعت ہوگی، اسی قدر افسانے میں جان پڑے گی۔ ریاضت سے فن کار کی تخلیقی صلاحیت نکھرے گی۔ افسانہ نگار کا تجرباتی ظرف جتنا بڑا ہوگا، جس قدر مطالعہ ہوگا، اسی قدر اس کا کینوس بڑا ہوگا اور وہ بڑا افسانہ تخلیق کر سکے گا۔ کتنے ہی ایسے افسانہ نگار ہیں جو تجربے، ریاضت اور تخلیقی صلاحیت کی کمی کے باعث بڑے افسانہ نگار نہ بن سکے۔ افسانہ نہایت ہی مشکل فن ہے۔ بھرپور مطالعے، بھرپور زندگی، بھرپور تجربے اور بھرپور ریاضت ہی سے بات سمجھ میں آتی ہے۔

تجریدی اور علامتی افسانہ لکھنے سے پہلے روایتی افسانے پر عبور حاصل ہونا چاہیے۔

تجریدی افسانہ یا علامتی افسانہ لکھنے کے لئے ہر دور کا ماحول کارآمد ثابت ہوتا ہے لیکن فی نفسہ اس ضمن میں دشواریاں ہیں۔ تجریدی افسانے لکھے تو گئے لیکن سلسلہ بڑھ نہ سکا، پھر علامتی افسانہ لکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ علامت تو روایتی افسانے میں بھی استعمال ہو سکتی اور ہوتی ہے بشرطیکہ اس کا اطلاق بالجبر نہ ہو۔ تخلیق کے دوران ہی میں تو لفظ بھی نازل ہوتے ہیں۔ اگرچہ لفظ ڈکشنری میں موجود ہوتے ہیں لیکن تخلیق میں ہر **Situation** کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ بیک وقت کئی کئی لفظ ٹپک پڑتے ہیں۔ ہر لفظ کی اپنی لے اور موسیقی ہوتی ہے۔ صورت حال کے مطابق اپنی معنویت اور موزونیت ہوتی ہے۔ لفظوں کی پرتیں ہوتی ہیں۔ تجربے اور ریاضت سے لفظوں کے چہرے سامنے آتے ہیں۔ افسانہ نگار کو بلاتوقف موزوں ترین اور موثر ترین جملہ بنانے کے لئے لفظ منتخب کرنا پڑتے ہیں۔ یہ سب کچھ آناً فاناً کرنا پڑتا ہے کیونکہ **Situation** ایک تو نہیں ہوتی۔ اگلی **Situation** فوراً سامنے آتی ہے۔ ایک سیڑھی کے بعد اگلی سیڑھی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ جذبات اور خیالات کا دھارا تیزی سے رواں ہوتا ہے۔ رکاوٹ کا موقع نہیں ہوتا۔ افسانہ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اس کی **Development** قدم بہ قدم اور درجہ بدرجہ ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو افسانہ ٹھس ہو کر رہ جائے۔ افسانہ نگار کی تخلیقی کارگاہ میں افسانے کی بنت اور اسے گھڑنے کا عمل چین سے نہیں بیٹھنے دیتا، البتہ نظر ثانی کے وقت صورت خاصی مختلف ہوتی ہے۔ کانٹ چھانٹ اور تراش خراش چین سے کی جا سکتی ہے۔ رہا علامت کا معاملہ تو اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ یہ

بھی لفظ اور محاورے کی طرح اپنی ساری بیک گراؤنڈ، معنویت اور موزونیت کے ساتھ نازل ہو، زور لگا کر اسے نافذ نہ کرنا پڑے۔ علامت پوری طرح Expressive ہو۔ اس کے لئے افسانہ نگار کو تشریحی نوٹ نہ دینا پڑے۔ علامت سے افسانہ بچ جاتا ہے۔ یہاں یہ بھی کہہ دوں کہ قاری بھی ادب شناس اور رمز شناس ہو۔ اس کا مطالعہ اور ذوقِ ادب اس قدر ہو کہ افسانے کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔ ہمارے یہاں خالص علامتی افسانہ لکھا نہیں گیا۔ میری نظر میں Swift کا سفر نامہ بہترین افسانوی علامتی شاہکار ہے۔ بونوں کی بستی کا تو جواب ہی نہیں۔ درحقیقت Swift ایک قد آور شخص تھا۔ علمی اور ادبی اعتبار سے اعلیٰ مقام رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک حکمرانوں سمیت جملہ سیاست دان بونے تھے۔ اس نے بڑی خوبصورتی اور مہارت سے اپنے عہد کے معاشرتی اور سیاسی حالات نیز محلاتی سازشوں کی پیروڈی کی ہے۔ اس نے نام نہاد عمائدین کی حماقتیں بڑی بے تکلفی سے بیان کی ہیں۔ یہ دلآویزی علامتی سفر نامہ اس کی اپنی اختراع ہے۔ اس وقت مجھے یہی سفر نامہ اپنی بکھری ہوئی کتابوں میں مل نہیں رہا ورنہ میں چند علامتوں کو اس کے عہد کے واقعات اور سانحات سے منطبق کر کے پیش کرتا۔ سرِ دست ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جو Swift کے زمانے کی محلاتی سازش کا نمونہ ہے...... بونوں کے بادشاہ کا دربار لگا ہے۔ بادشاہ سلامت کے پہلو میں ملکہ عالیہ بھی براجمان ہیں۔ ایک وزیر باتدبیر اپنا کمالِ فن دکھا رہا ہے۔ بہت بڑا Rope Dancer (رسن باز) ہے۔ سب درباری (بونے) محظوظ ہو رہے ہیں۔ اچانک کوئی حاسد درباری اس کی ٹانگ کھینچتا ہے۔ وزیر موصوف ملکۂ عالیہ کی پسندیدہ شخصیت ہے۔ وہ فوراً رسی کے نیچے تکیہ رکھ دیتی ہے اور یوں وزیر باتدبیر...... رقاص تکیے پر گرتا اور چوٹ لگنے سے بچ جاتا ہے۔ یہ واقعہ Swift کے اپنے عہد کا ہے۔ اس کا دیکھا بھالا ہے۔ اصل وزیر باتدبیر جس کا مذاق اڑایا گیا ہے وہ قلمکار کے زمانے میں محلاتی سازش کا شکار ہوا۔ زوال کی زد میں آیا تو ملکہ عالیہ نے بروقت مدد کی۔ Swift کی یہ کتاب قابلِ مطالعہ ہے۔ عام انداز میں اس نے بڑی چابکدستی سے اتنا عمدہ فن پارہ تخلیق کیا ہے۔ بہرحال علامتی افسانہ نہایت ہی مشکل چیز ہے۔

گل نوخیز اختر: اردو افسانے کا مستقبل کیا ہے؟

رحمان مذنب: مستقبل کے بارے میں پیشنگوئی کرنا چنداں دشوار نہیں۔ اگر صورت حال جوں

کی توں رہی، تعلیم عام نہ ہوئی، حالات کا جبر قائم رہا، پرچوں اور کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں موجودہ مسائل و مصائب سے نجات نہ ملی تو افسانہ اور ادب کا مستقبل چنداں درخشاں نہیں۔ ادب تو کیا، یہاں تو آدمی...... پورے آدمی کی خیر نہیں۔ پورا معاشرہ ادھیڑ کر رکھ دیا ہے ہمارے مہربانوں نے۔ سب کچھ اتھل پتھل ہو گیا ہے۔ وہ اقدار ہی بدل گئی ہیں جن سے آدمی کی سلامتی اور معاشرے کا فروغ ممکن ہو۔ ادیبوں، شاعروں کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ قلم تو بانجھ نہیں ہوا، ہو بھی نہیں سکتا لیکن قلم کا رزق برائے نام ہے۔ کوئی سچا ادیب قلم کے ذریعے روزی کما سکتا ہے نہ جی سکتا ہے۔ ادیب کی فطری مجبوری ہے۔ قدرت اسے تخلیقی صلاحیت عطا کرتی ہے وہ اس کے اظہار کے لئے ادب پیدا کرنے پر مجبور اور مائل رہتا ہے۔ ادیب کے لئے ادب پیدا کرنا ناگزیر ہے۔ افسانے پیدا ہوتے رہیں گے۔ زندگی کی ناہمواریاں، دشواریاں، حالات، حادثات، قلبی روایات، نیک و بد...... سب کچھ سامنے آتا رہے گا۔ ایسے میں ادیب چپ نہ رہے گا۔ دنیا کی بوقلمونیاں، اچھائیاں اور برائیاں اسے تخلیق پر اکساتی رہیں گی۔ افسانے پیدا ہوتے رہیں گے جہاں تک فرصت، فراغت اور بے فکری کا تعلق ہے، آج کا افسانہ نگار ان نعمتوں سے محروم ہے۔ بہر حال وہ فطرت کی طرف سے قلم کی سلامتی پر مامور ہے۔ وہ تمام مصائب جھیلے گا، مسائل کا سامنا کرے گا۔ اگر حالاتِ کار بہتر ہوں، ادیب کو فرصت، فراغت اور بے فکری کی نعمتیں میسر ہوں، قلم کار اور ناشر دونوں خوش اور خوشحال ہوں، تعلیم اور ذوق، علم و ادب کو فروغ ملے تو افسانہ پنپ سکتا ہے۔ ماحولیات **Ecology** کے حوالے سے **Habitat** حسبِ منشاء ہو تو پھر افسانہ ہی نہیں، تمام اصنافِ ادب کا مستقبل درخشاں ہے ورنہ بے چارہ افسانہ نگار قلم گھسیٹتا رہے گا۔ خود گھسٹتا رہے گا۔ مستقبل افسانہ نگار سے محروم تو نہ رہے گا۔ افسانہ نگار ہر فنکار کی طرح دشواریوں کے باوجود عزم بالجبر سے سرگرمِ عمل رہے گا...... نئے ماحول اور نئے طرزِ احساس کے بموجب پیکر تراشتا رہے گا۔ معاشرہ بھی فرض شناسی کا ثبوت دے۔ ادیب تو سب کچھ تیاگ دیتا اور سود و زیاں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ معاشرے کو وقت کے شعور سے آشنا اور بیدار رکھتا ہے۔ سچ کی قدروں کا پالن کرتا ہے۔ استحصال اور کرپشن کے خلاف قلم اٹھاتا ہے۔ معاشرے کو بھی قدم اٹھانا چاہیے، حکومت کو بھی خیال رکھنا چاہیے۔ حکومت اور معاشرہ ادیب کے ساتھ مل کر جہالت کے خلاف جہاد کریں۔ افسانہ اس

سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ادب اور ادبی اقدار و معیار اور حالات کار کو سنوارنے کے لئے بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ ادبی سرگرمیوں کو زندہ وتابندہ رکھنے کے لئے ادیب کی معاونت کی جائے۔ افسانہ مقبولِ عام صنفِ ادب ہے۔ ادیب اس کے ذریعے ذہنی تزکیہ کرتا ہے۔ یہ صدقہ جاریہ ہے۔ اسے جاری رہنا چاہیے۔

گل نوخیز اختر: آپ گوشہ نشینی کیوں اختیار کیے ہوئے ہیں؟

رحمان مذنب: بندہ پرور! میں نے کبھی گوشہ نشینی اختیار نہیں کی۔ آوارگی میری گھٹی میں پڑی ہے۔ میں تو موتی اور پھول تلاش کرتا رہتا ہوں۔ میرا سفر سدا جاری رہتا ہے۔ کبھی باہر اور کبھی اپنے اندر مشغول سفر رہتا ہوں۔ من میں جو حشر برپا رہتا ہے وہ قلم کی نوک پر آجاتا ہے۔ بیرونی دنیا سے جو کچھ سمیٹتا ہوں وہ کب چین سے بیٹھنے دیتا ہے۔ اگر میں جیتے جاگتے معاشرے میں پہلے کی طرح گھومتا پھرتا دکھائی نہیں دیتا تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ پون صدی کا وہ دلفریب اور پرلطف معاشرہ پایہ تکمیل کو پہنچ کر اب ہم سے رخصت ہو چکا ہے۔ بعض احباب دستِ تعاون سمیٹ کر الگ ہوگئے ہیں۔ علم و ادب کے معاملے میں وہ میرے قدر دان اور معاون تھے۔ میں ان کا قدر دان اور معاون تھا۔ میں دعا گو ہوں کہ اللہ انہیں زندہ اور سلامت بدیر رکھے۔ میں ان کا بدخواہ نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کئی پرانے بندے مجھ سے بچھڑ گئے ہیں۔ انہوں نے جنت الفردوس میں جا کر محفلیں جمالی ہیں۔ حلقہ اربابِ ذوق اور نئی ادبی تنظیم کے زرّیں دور نہ رہے۔ علم و ادب کے وہ شیدائی اب کہاں جو حلقہ اربابِ ذوق کے بھرے جلسے میں آکر بیٹھنے کی جگہ نہ پاتے تو الٹے پاؤں لوٹ نہ جاتے بلکہ وہیں رہتے اور بورڈ روم (وائی ایم سی اے) کی کھڑکی سے لگ کر کھڑے ہو جاتے اور پورا جلسہ سن کر دم لیتے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ 84 برس کا یہ بوڑھا اب گوشہ نشینی پر مجبور ہے۔ تجربے، مشاہدے اور سوچ کا اتنا بڑا ذخیرہ پڑا ہے کہ اسے کام میں لانے کے لئے یکسوئی اور بیٹھک کی سخت ضرورت ہے۔ اللہ کی مہربانی سے میں اب بھی افسانہ لکھ رہا ہوں۔ مطالعہ اور تحقیق و تفتیش کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ حال ہی میں میری ایک خاصی بڑی کتاب...... "قتل کے چند تاریخی مقدمات: سقراط سے ممتاز بیگم امرتسری تک" شائع ہوئی ہے۔ اس میں اڑھائی ہزار سالوں کے دوران میں عدلیہ کے رویوں، انصاف اور ناانصافی، ظلم و استبداد اور بے رحمی کی داستان بہ تحقیق

پیش کی ہے۔ آج کے خداوندِ عدل سے ان کا موازنہ خود قارئین کر سکتے ہیں۔ اس کا دوسرا حصہ مرتب کر رہا ہوں۔ ''دبستانِ ساحری'' کا تیسرا ایڈیشن نئی معلومات کے اضافے کے ساتھ تیار کر رہا ہوں۔ یہ میری آدھی صدی کے مطالعے اور فکری کاوش کا نتیجہ ہے۔ افسانوں کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں۔ اتنے ہی مجموعے محتاجِ اشاعت ہیں، اور بھی کچھ کام پڑے ہیں۔ بہر حال ہوگا وہی جو منظورِ خدا ہوگا۔

گل نوخیز اختر: ادبی گروہ بندیاں کیسی ہیں؟

رحمان مذنب: بہت بری ہیں۔ ادب اور ادیبوں، دونوں کے مضرِ صحت ہیں۔ یہ فرقہ واریت اور دہشت گردی کے مترادف ہیں۔ انہیں چوہدراہٹ کے جنگجو ادیب ہوا دیتے ہیں اور اس کی خاطر ادیبوں میں پھوٹ ڈالی جاتی ہے۔ نئی پود کو گمراہ کرنے اور اپنی جنگی بھٹیوں کا ایندھن بنایا جاتا ہے۔ گالی گلوچ اور کیچڑ اچھال کر ایک دوسرے کی ہستی کو نیستی میں بدلنے کی تدبیر ہوتی ہے۔ ادبی تخلیقی کارگزاری پر توجہ دینے کی بجائے بندوں کو گروہی لاٹھی سے ہانک کر اپنی طرف لایا جاتا ہے۔ لابیاں بنائی جاتی ہیں۔ اچھے کام کی بنیاد میں کانٹے بوئے جاتے ہیں۔ اچھے کام کو سراہا نہیں جاتا۔ ادھر سے توجہ ہٹائی جاتی ہے۔ نوکریاں پکی کی جاتی ہیں۔ حسبِ ضرورت قصیدہ خوانی کی صنعت میں جی کھول کر سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ قلم کی آبرو ذاتی مفاد پر واری جاتی ہے۔ وارے نیارے کئے جاتے ہیں۔ طلائی دف بجا بجا کر اپنی دفلیں مضبوط کی جاتی ہیں۔

گل نوخیز اختر: آپ کے مطبوعہ کام کی تفصیل؟

رحمان مذنب: باسٹھ سال کے کام کی کیا تفصیل بیان کروں؟ چوراسی سال کی زندگی باسٹھ سال کی قلم کاری کی نذر کی۔ میں **Hurdle Race** کا کھلاڑی ہوں۔ کبھی لائن کلیئر نہ ملی۔ میری اچھی سے اچھی کاوش کو بھی اس طرح نہ سراہا گیا جیسا کہ اس کا حق تھا بلکہ اسے خطرۂ جان سمجھ کر بلڈوزر لے کر سامنے آ کھڑے ہوئے۔ ادھر حریفوں کی مزاحمت اور ادھر میں بھی کبھی کبھی اپنے لئے رکاوٹ کھڑی کرتا رہا۔ کسی نے میرے مضمون کی چوری کی اور چوری کا ثبوت بھی میرے حوالے کر دیا، بہر حال پچاس سے زائد کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اتنے ہی مسودے پرچھتی پر پڑے ہیں۔ ان میں تین ناول، تین رف افسانے اور نہایت تحقیقی کتاب ''ڈرامے اور تھیٹر کا دورِ اوّل'' مکمل

حالت میں موجود ہے۔ ناشر کی تلاش ہے۔ 1940ء کے ماہنامہ ''عالمگیر'' میں میرا ڈراما ''مقدس پیالہ'' چھپا۔ یہ لارڈ ٹینی سن کے نہایت ہی نایاب ڈرامے "The Cup" کا ترجمہ تھا۔ لندن کے لائی سیئم تھیئٹر میں 136 رات مسلسل کھیلا گیا۔ اصل ڈراما میں نے اپنے یار فضل کباڑیے سے چونی میں لیا تھا جس کی دکان شفاءالملک حکیم فقیر محمد چشتی کی نئی حویلی ''شفاء منزل'' کے نیچے واقع تھی۔ اسی زمانے میں امپیریل واچ کمپنی کے مالک نے بائبل سوسائٹی کے قریب ایک جگہ پبلشنگ کا کاروبار شروع کیا۔ میں لیک کران کے پاس گیا اور اپنا خاص الخاص ڈراما شائع کرنے کو کہا۔ وہ میری بات سن کر خوش ہوئے اور کہا، ''لائیے، ڈراما دیجئے! ہم ڈراموں کا ایک انتخاب شائع کر رہے ہیں اس میں آپ کا ڈراما شامل کر لیں گے'' میں ان کی طلب پر مایوس ہوا اور بولا، '' آپ اس ڈرامے کی اہمیت سے آگاہ نہیں، میں اسے الگ کتابی شکل میں چھپوانا چاہتا ہوں۔ یہ ڈراما جے سنگھ سنت سنگھ پبلشرز کے ان ڈراموں کی کھیپ سے الگ شے ہے جو انہوں نے دھڑا دھڑ چھاپے ہیں۔ چنانچہ یہ ڈراما چھپ نہ سکا۔ بعد ازاں 1952ء کے لگ بھگ اپنے ڈراموں کا مجموعہ لاہور کے ایک بڑے پبلشر کو دیئے۔ انہوں نے ''کانچ کے پتلے'' کے عنوان سے میرے ڈراموں کی بڑی عمدہ کتابت کروائی، نامور آرٹسٹ جالی سے ٹائٹل بنوایا، ٹائٹل چھپوا بھی لیا۔ اپنی فہرست کتب میں اس کا اشتہار بھی چھاپا لیکن پھر حماقت دیکھیے۔ جب کانچ کے پتلے کی کتابت پریس میں جانے کو تھی، پبلشر نے فرمایا ''ہم رائٹر کو شہرت بخشتے ہیں، اسے چاہیں تو آسمان پر چڑھا دیں'' میں نے عرض کیا، ''اگر رائٹر کے پلے کچھ نہیں تو پبلشر کچھ نہیں کر سکتا۔''

اس نازک گھڑی میں انہیں میری بات بہت بری لگی۔ انہوں نے کتابت شدہ ڈرامے الماری میں رکھ لئے اور پھر آج تک نہ چھپے۔ یہ سب کچھ ہوا۔ 1992ء میں تین افسانوی مجموعے ''تِتلی جان'' ''بالا خانہ'' اور ''رام پیاری'' چھپے۔ پبلشر حسن اشرف نازاں ہیں کہ انہوں نے جس اہتمام اور خوبصورتی سے ''تِتلی جان'' شائع کی ہے، ویسی دوسری کوئی کتاب بازار میں نہیں۔ دو اور کتابیں ''دنیا کے نامور جاسوس...... ''لارنس سے ماتاہری تک'' ''قتل کے چند تاریخی مقدمات'' بھی شائع ہوئیں۔ اوّل الذکر کتاب کا پہلا ایڈیشن فروخت ہو چکا ہے۔ ''اسلام اور جادوگری''، تہذیب و تمدن اور اسلام'' اور ''دینِ ساحری'' علمی کتابیں ہیں۔ ''دین ساحری'' میری تحقیق ہے۔

اس کے دو ایڈیشن چھپے۔ خاصی مدت سے آؤٹ آف پرنٹ ہیں۔ تیسرا ایڈیشن تیار کر رہا ہوں۔ یہ مصور بھی ہو گا اور میں اس میں نئے تحقیقی مضامین بھی شامل کر رہا ہوں۔ یہ میری Pregstigious Book ہوگی۔ میں نے ہمیشہ چیلنج سمجھ کر قلم اٹھایا ہے۔ ترجمے کا کام بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ تخلیقی کام کی نسبت اس میں کم وبیش تین گنا وقت اور محنت درکار ہوتی ہے۔ ''مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے'' کے ترجمے پر رائٹر گلڈ کی طرف سے حبیب بنک لٹریری پرائز برائے 1971ء ملا۔ ٹی ایس ایلیٹ کی کتاب Poetry And Drama کو اردو میں منتقل کیا۔ ہنوز یہ کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا البتہ ماہنامہ ''ساقی'' (کراچی) کے ایک خاص نمبر میں شریکِ اشاعت ہوا۔ ''روس میں اسلام کا خطرہ'' بھی ترجمہ کیا۔ کتاب شائع ہوئی۔ ارسطو کی معروف زمانہ لاجواب کتاب POETICS کا پنجابی میں ترجمہ کیا۔ اس پر طویل دیباچہ لکھا۔ پنجابی ادبی بورڈ نے ''بوطیقا'' کے نام سے اسے چھاپا۔ حسان ضیاء کی نہایت ہی تحقیقی اور دلچسپ کتاب PATHANS OF JULLUNDAR کو حال ہی میں میں نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ میرا کتنا ہی تحقیقی کام اور تین نئے افسانوی مجموعے بھی قابلِ اشاعت ہیں۔ بچوں کا ادب بھی تخلیق کیا ہے۔ بیس پچیس کتابیں مارکیٹ میں موجود ہیں۔ بچوں کے لئے ایک ناولٹ ''لکڑ ہارا اور چور'' پر رائٹرز گلڈ کا انعام لے چکا ہوں۔ بچوں کیلئے ''نئی الف لیلہ'' کے نام سے کتاب لکھی تھی۔ کہانیوں کا پس منظر بغداد اور دمشق کا پرانا ماحول ہے۔ موجودہ عہد کی معاشرتی خرابیاں خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں پیش کی ہیں۔ اس طرح یہ زیادہ دلچسپ ہوگئی ہیں۔ بہر حال اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اپنے کام کی تکمیل کی مہلت اور توفیق عطا فرمائے۔ اس کی عطاء کے بغیر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

O

اردو ادب کے ممتاز افسانہ نگار

رحمان مُذنِب

سے خصوصی ملاقات

ملاقات: سلیم خاں گمی

سوال: ہمارے قارئین کے لئے اپنا اتا پتہ دیجئے، اپنی ابتدائی زندگی سے پردہ اٹھایئے، اپنی قلمی اور نجی زندگی کے بارے میں بتایئے؟

جواب: میرا اتا پتہ نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ ایک ادیب ہی تو ہوں جو افسانے اور ڈرامے لکھتا ہے، ساتھ ساتھ ڈرامے لکھتا ہے، ساتھ ساتھ ڈرامے کی تاریخ، اینتھرو پالوجی (بشریات بحوالہ جادو، دیومالائی اور بت پرستی) اور جنسیات کے موضوعات پر سنجیدہ مطالعے اور تحقیق و تفتیش کی علامت بھی ہے۔ اب لوگ تو نودولتیوں، سمگلروں، چور تاجروں اور جرائم پیشہ لوگوں کو جانتے ہیں۔ ان کے پتے، ٹیلی فون اور کاروں کے نمبر حفظ کر رکھتے ہیں۔ ادیب اور فنکار بے کار ہیں۔ 15 جنوری 1915ء کو عظیم تاریخی اور تہذیبی شہر لاہور (ٹکسالی دروازہ) کی جانب آخری مکان میں پیدا ہوا۔ جائے پیدائش ایسی تھی کہ ادھر اذان کان میں پڑتی اور ادھر بائی جی کی تان سنائی دیتی۔ چند قدم پر عزیز تھیٹر (موجودہ سینما پاکستان ٹاکیز) تھا۔ اس کے عین سامنے خالی میدان تھا جہاں سرِ شام ہی ڈھول اور نفیریاں بجتی تھیں۔ متصلہ گلزار منزل کے پاس بھنگیوں، چرسیوں کا اڈہ تھا۔ موج میں آتے تو وہ دربار کے بغیر راگ درباری گاتے۔ ہیجڑے بھی شجر سایہ دار (عزیز تھیٹر) کی بدولت پرورش پاتے۔ ان کی تالیوں کی گونج بھی سنائی دیتی۔ آدھی رات کو متصلہ مجرا خانے بند ہو جاتے تو ایک گویا شاہی مسجد اور صابر شاہ کے سامنے والی سڑک سے گزرتے گزرتے سوہنی گاتا چلا جاتا لیکن یہ سب

کچھ گھر کے باہر تھا۔ والد مفتی محمد عبدالستار جو تمبر 1937ء تک شاہی مسجد لاہور کے مفتی رہے اور والدہ خیر النساء کے لئے باہر کا ماحول زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ یہ گھر بڑی برکت والا تھا۔ اسے تاریخی اہمیت حاصل ہوئی۔ والد عربی اور فارسی کے بڑے سکالر تھے۔ دن رات یہاں قرآن اور حدیث کی گفتگو ہوتی۔ نانا شمس العلماء پروفیسر مفتی محمد عبداللہ ٹونکی جن کی قلعہ نما حویلی بازار سمیاں میں اب بھی موجود ہے ہمارے یہاں آتے رہتے، کم گو تھے۔ والد کے کتب خانے سے کتابیں لے لے کر پڑھتے، اپنی رائے دیتے۔ نانا اورینٹل کالج، لاہور میں عربی ادبیات کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی میں چلے گئے۔ ان کی آمد سے گھر میں اونچے درجے کا علمی ماحول پیدا ہوتا۔ اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر طلحہ بھی ہر روز ملنے آتے۔ علمی گفتگو کے ساتھ ساتھ یہ بھی مشورہ دیتے ''مولانا! صبح کی سیر ضرور کیا کیجئے، فجر کی نماز کے بعد اسے بھی وظیفۂ حیات بنالیجئے۔'' والد ایک ہی جواب دیتے ''سید صاحب! نماز کے فوراً بعد مقتدیوں کی ایک جماعت نہایت بے قراری سے درسِ حدیث کے لئے رک جاتی ہے۔ سید طلحہ آگے کچھ نہ کہتے۔ والد صبح صبح نہایت باقاعدگی سے درسِ حدیث دیتے۔ میں سکول جانے سے پہلے شریکِ مجلس ہوتا۔ ایک زمانے میں افسانہ نگار غلام عباس درسِ حدیث کے بعد آتے تھے۔ وہ الحمراء کے افسانے اردو میں منتقل کر رہے تھے۔ والد غلام عباس کو اندلس کی تاریخ اور ثقافت سے باخبر کرتے، یورپ کی جہالت کے حالات سناتے۔ افسانوں کے سلسلے میں عربی اشعار کی گتھیاں سلجھاتے۔ ہمارا گھر علم وادب کا گہوارہ تھا۔ یہ میری اولین درس گاہ تھی۔ یہاں سے میں نے جو علم اور تحصیلِ علم میں عادات سیکھیں وہ آج تک میری رہنما ہیں، میرا لافانی اثاثہ ہیں۔

سوال: آپ نے جس مکان میں پرورش پائی، آپ نے اسے تاریخی اہمیت کا حامل بتایا ہے، اس کی کچھ وضاحت کیجئے؟

جواب: یہ سو فیصد درست ہے۔ میں نے سنا تھا کہ ہمارے گھر کے نیچے دو کوٹھڑیاں تھیں۔ ایک میں پنجابی کے لاثانی صوفی شاعر شاہ حسین رہتے تھے۔ یہ تب کی بات ہے جب

دریائے راوی شاہی مسجد اور شاہی قلعہ کی سنگین دیواروں سے لگ کر بہتا تھا۔ مغل بھی بڑی چیز تھے۔ پانی مکان کا دشمن ہے اور مغل بادشاہ دریاؤں کے کناروں پر عمارتیں کھڑی کرتے تھے۔ اس کے اندر بارہ دریاں بناتے تھے۔ دلی کی جامع مسجد اور قلعہ بھی جمنا کے کنارے بنایا گیا۔ یہ میری پیدائش سے بہت پہلے کی بات ہے جب دریائے راوی کی لہریں شاہی مسجد اور شاہی قلعے کی دیواروں سے ٹکراتی تھیں البتہ چھوٹا دریا ضرور دیکھا تھا جو شاہی عمارتوں سے کوئی فرلانگ پر بہتا تھا اور موسم گرما میں سیلاب آتا تو غضبناک ہو جاتا۔ اس کی لہریں بپھر کر بطور فرض ایک آدھ بندے کی جان ضرور لیتیں۔ چند سال پہلے مادھو لعل حسین ہی کی کوٹھڑی میں بے باک، دبنگ، راست گو شاعر استاد دامن یہاں مقیم ہوئے۔ ان کا کمرہ کتابوں کے انبار سے لدا تھا۔ ان کی چارپائی اور ایک دو مہمانوں کے بیٹھنے کی جگہ بمشکل بچتی۔ اکبر لاہوری یہاں ہر روز آتے۔ میں نے اردو کے ایک ہفت روزہ کے لئے یہیں استاد دامن کا انٹرویو لیا۔ یہ مکان اپنی علمی اور تہذیبی کردار کے باعث یقیناً تاریخی اہمیت رکھتا ہے، کھنڈر ہو رہا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اسے آثارِ قدیمہ کی تحویل میں دے جائے تاکہ یہ باقی رکھا جا سکے۔

سوال: آپ نے اپنے گھر کو ابتدائی درس گاہ کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ آپ نے اس سے بڑا فیض پایا یہاں تک کہ آج بھی آپ فیض یاب ہونے کا اعتراف کر رہے ہیں، یہ گھر تو علمی بالخصوص مذہبی نوعیت کا تھا لیکن آپ افسانے اور ڈرامے لکھنے لگے، گھر کی لاج آپ نے کیسے رکھی؟

جواب: تقدیر نے جو گل کھلایا اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ گھر میں "قال قال رسول اللہ" کی پاک صدائیں گونجتیں۔ والد پکے درویش تھے۔ گھر کے لئے جتنا روپیہ درکار ہوتا وہ صرف کرتے۔ فاضل روپیہ حاجت مندوں کو دے دیتے۔ ان کی صحبت نے علمی طور پر مجھے کندن بنایا اور یہ بتایا کہ دین داری اور دنیا داری کو اس طور متوازن رکھو کہ حصول علم میں رکاوٹ نہ پڑے۔ درویشی یعنی سادگی نمایاں رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پتہ مارنے کی عادت ڈالی۔ جم کر کام کرو، ریاضت، ریاضت، ریاضت۔ اس کے بغیر کچھ

حاصل نہیں ہوتا۔ مطالعہ کرو اور خوب کرو! میں نے یہ اوصاف والد سے لئے۔ میرا گھر میرے لئے لاثانی تھا۔ یہاں کی آب وہوا، یہاں کا ماحول اور یہاں کا کلچر خاص تھا۔ پھر جب گھر سے باہر پاؤں دھرتا تو عزیز تھیٹر، مست ملنگوں کا بھنگڑا خانہ، تکیائیوں کے دڑبے، طوائفوں کے بالا خانے اور سوسوروپ میں ڈھل جانے والی عورتیں نظر آتیں۔ جب کبھی کسی متنازعہ فیہ مسئلے کے سلسلے میں فتوے پر تائیدی دستخط لینے کی غرض سے سنہری مسجد کے مولوی یار محمد اور مسجد وزیر خان کے مولانا دلدار علی شاہ کی خدمت میں حاضر ہونا ہوتا تو ہیرامنڈی میں سے گزرنا پڑتا۔ حکیماں بازار جانے کے لیے ٹبی کنجراں میں سے گزرنا پڑتا۔ ٹکسالی دروازے کے باغات بڑے خوبصورت تھے۔ کناروں پر انار کلیاں کھلتیں۔ نہر رات دن بہتی۔ گندے نالے کے کنارے پر مولسری کے پیڑ تھے۔ مولسریوں کا خوشبودار فرش بچھا رہتا۔ گلزار بائی، اللہ وسائی، سردار بائی اور دوسری عورتیں جب داتا دربار سلام کرنے جاتیں تو مولسریاں سمیٹ کر رومال یا دوپٹے کے پلو میں باندھ لیتیں۔ باغ ان کی گزرگاہ تھا۔ برسات کے ایام میں باریک کرتے پہن کر وہ باغ میں آکر جھولا جھولتیں۔ اسی منظر سے انسپائر **Inspire** ہو کر مولانا چراغ حسن حسرت نے کہا ــــــــــ

باغوں میں پڑے جھولے
تم بھول گئے ہم کو
ہم تم کو نہیں بھولے

پھر جب میں نے ہوش سنبھالا اور مجرا خانوں میں آنے جانے لگا تو میں نے بھی کہہ ڈالا ــــــــــ

جب چاند نکلتا ہے
پھر کس کیلئے ساجن
دل میرا مچلتا ہے

کیا باغ اور کیا مجرا خانہ، سبھی جگہ میرے گھر سے مختلف کلچر تھا۔ گھر میں عربی اور فارسی ملی

صاف ستھری، بامحاورہ اردو زبان بولی جاتی۔ عین غین، شین قاف درست ہوتا لیکن باہر آتے ہی پنجابی سے رابطہ پڑتا۔ اردو زبان شائستہ زبان ہے لیکن اس میں تکلف بھی بہت ہے۔ خلاف ازیں پنجابی زبان کھلی ڈلی، ذہنی رکاوٹوں سے مبرّا، بے تکلفی کی زبان ہے۔ ٹکسالی دروازے کے اندر بازار میں تھڑے پر گلی کوچے میں ایسی ہی زبان بولی جاتی تھی۔ ثِقہ حضرات تو یہاں کے بازاری کلچر کو لچر قرار دیتے اور عورتوں کے چلن کو گالی کہتے۔

میں گھر اور بازاروں دونوں جگہوں پر رہتا۔ مختلف ماحول میں مجھے پرورش پانے کا موقع ملا۔ گھر میں علم تھا، سنجیدگی تھی۔ بازار میں افسانہ تھا، ڈراما تھا، شعر تھا۔ باہر تو یہی آوازیں کانوں میں پڑتیں۔ سانچ کہو موسے بتیاں، کہاں گنوائیں ساری رتیاں، پیا بن نہیں آوت چین۔ میں نے بیک وقت گھر اور بازار دونوں جگہ تربیت پائی۔ دولخت ہونے کے اسباب بکثرت پائے جاتے ہیں۔ تب بھی اور اب بھی میں اپنے آپ کو دولخت ہونے سے بچائے ہوئے ہوں۔ میں نے دونوں معاشرتوں اور کلچروں میں تربیت پائی، دونوں انداز سے کام کیا۔ دینِ ساحری پر کتاب لکھی اور بت پرستی کے بارے میں سوشل اینتھروپالوجی کے حوالے سے تحقیقی مواد پیش کیا۔ مذہب اور دینِ ساحری (میجک) کا تقابلی مطالعہ کیا۔ بیسیوں تحقیقی مقالے لکھے۔ ''اسلام اور تہذیب و تمدن''، ''تیز ''اسلام اور جادوگری'' میری ہی کتابیں ہیں جو اسلام کی برتری ثابت کرتی ہیں۔

سوال: آپ کے تحقیقی کام سے آگاہ ہوں، آپ یہی کام کرتے رہتے؟

جواب: ایسا ممکن نہ تھا، میرا گھر زبردست درسگاہ تھا۔ یہیں مجھ میں کتب بینی کا شوق پیدا ہوا اور میں نے کام کیا لیکن بازار بھی اہم درسگاہ تھی۔ گھر اور کتب خانے میں علم کا خزانہ تھا، باہر بھی علم کا خزانہ تھا۔ میرے نزدیک ایک آدمی بھی کتاب ہے۔ ہر آدمی جو زندگی کا تجربہ رکھتا ہے، وہ میرے لئے بہت اہم ہے۔ آدمی افسانہ ہے، ناول ہے، ڈراما ہے، مکمل یا غیر مکمل۔ بہر حال مجھے آدمیوں میں رہنے، گھل مل کر رہنے کا موقع ملا۔ اس طرح مشاہدے اور تجربے کا بے پایاں اثاثہ ملا۔ میں نے اس سلسلے میں اچھے برے کی تمیز نہیں کی۔ ٹبی کنجراں ہو یا فدا حسین اسیر کے عطار خانے کا تھڑا، سردار بائی کا مجرا خانہ

ہو یا سڑی پہلوان کا جوا خانہ، استاد مبارک علی خان کی بیٹھک ہو، برکت علی خان یا استاد بڑے غلام علی خان کا ڈیرہ، تکیہ چیت رام ہو یا ہیرا منڈی کا چوک، بھولو پہلوان کا اکھاڑہ (وریام شالہ) ہو یا مدرسہ نعمانیہ کی جلسہ گاہ ہو یا بزرگانِ دین، علمائے کرام یا شیوخ عظام کی محفلیں، عرس، جلسے، مشاعرے سبھی سے متمتع ہوا۔ باغ میں جھولے پڑے دیکھے۔ موچی اور دلی دروازوں کے سبزہ زاروں میں آتش نوا مقررین کی تقریریں سنیں۔ جہاں جہاں گیا، جہاں جہاں رہا، جہاں جہاں پہنچا، زندہ کتابوں کے اوراق کھلتے رہے۔ قدرت نے مجھے جو تخلیقی صلاحیت عطا کی، اس کے اپنے تقاضے تھے۔ میں نے جوالا کھیاں سلگتی دیکھیں، ان میں کود گیا اور کندن بن گیا۔ سمندر کی تہوں کو کھنگالا اور اس طرح نایاب موتی پائے۔ جذبات، خیالات، تصورات، نظریات، مشاہدات اور تجربات کا اتنا ڈھیر سارا اثاثہ ہو گیا کہ انہیں افسانوں اور ڈراموں میں ڈھالنے پر مجبور ہوا۔ تخلیقی صلاحیت نے مجھے اس کام پر مامور رکھا۔ میں نے شاعری بھی کی ہے۔ اب بھی کبھی کبھار شعر کہہ لیتا ہوں۔ حمد، نعت، غزل اور نظم سب ہی اصناف شاعری سے رجوع کیا لیکن بیشتر وقت فکشن نے لے لیا۔ اللہ کی ذات کا بے پایاں احسان ہے، کبھی شکوہ نہیں کیا۔ اس نے بہتیرا دیا اور دے رہا ہے۔ **84** سال کا ہو گیا ہوں، افسانے لکھ رہا ہوں، تین کتابیں "پتلی جان، بالا خانہ، رام پیاری" شائع ہو چکی ہیں۔ میں نے بیسویں صدی کے لاہور کو اپنے افسانوں میں اجاگر کیا ہے۔ یہ بڑا دلآویز شہر ہے، بڑا حسین ہے، دل موہ لینے والا ہے۔ اس میں بڑے مزیدار اور جی دار لوگ بستے ہیں۔ میں نے ان کا چلن، ان کی روزمرہ کی زندگی، چالاکیاں، پھرتیاں، عیاریاں، مکاریاں، شرافتیں اور سادگیاں بڑی تفصیل اور جزئیات کے ساتھ پیش کی ہیں۔ یہ شہر حیرت خیز ہے۔ میرے افسانے بھی اچھوتے، منفرد اور حیرت خیز ہیں۔ یہ سب قدرت کی دین، قسمت کا کھیل ہے۔ میں نے **84** سال میں جو خام مال اکٹھا کیا ہے اس کے لئے بڑی لمبی عمر اور تندرستی درکار ہے جس پر میرا اختیار نہیں۔ یہ تو میرے مولا کے اختیار میں ہے وہ مجھے کتنے دن اور اس

حسین دنیا میں جینے کیلئے عطا کرتا ہے۔ میں نے پون صدی کی طوائف کو ادب میں جس بھر پور انداز سے زندہ کیا، اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، مولانا صلاح الدین احمد اور ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے میرے کام کو سراہا۔ انہوں نے ''تپکی جان'' کو اردو ادب کا پہلا افسانہ قرار دیا ہے۔ یہ حضرات علم و ادب بالخصوص تنقید میں بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے میرے افسانوں اور قلمی کاوشوں اور قدرت کو صحیح طور پر جانچا پرکھا، وہ تہہ تک پہنچے اور پھر انتہائی خیال افروز مضامین سپردِ قلم کئے۔ ان کی باریک بینی بے مثال ہے۔ مستند اور محتاط نقاد ہیں۔

سوال: آپ کی قلمی عمر کتنی ہے، کب اور کیسے آپ نے آغازِ کار کیا؟

جواب: میں نے **1933**ء میں سنٹرل ماڈل سکول لاہور سے میٹرک کیا۔ مضمون نگاری میں والد کی امداد اور رہنمائی انتہائی مفید ثابت ہوئی۔ انہی کی زیرِ تربیت مجھے لکھنا آیا اور قلم میں پختگی آئی۔ یہی سبب ہے کہ جب میں نے **1937**ء میں ماہنامہ ''ہمایوں'' کے لئے ڈراما لکھا تو ایڈیٹر مولانا حامد علی خان یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ ایکا ایکی یہ نیا ادیب کیسے اور کہاں سے میدانِ ادب میں آ گیا۔ یاد رہے کہ میرے گھر کے قریب عزیز تھیٹر تھا جہاں آغا حشر، ابراہیم محشر اور دوسرے ڈراما نگاروں کے شاہکار بڑی صحت (صحت لفظی)، صحیح لہجے کی اداکاری پیش کرتے تھے۔ میں نے عزیز تھیٹر سے بہت کچھ سیکھا۔ ادھر چوک ہیرا منڈی میں گیٹی تھیٹر تھا جہاں خاموش انگریزی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ کہانی اور ڈرامے کی بنت اور انداز وہاں سے بھی سیکھا۔ ہمایوں، ساقی، نیرنگ خیال اور ادبی کتب بہ کثرت پڑھتا۔ اسی طرح میرے شعور کی تعمیر ہوئی۔ میں نے سب سے پہلے **1932**ء ہی میں نذیر لدھیانوی کے مصور ویکلی میں فلمی مضامین لکھنا شروع کئے۔ جوں جوں بڑا ہوا، نظر میں وسعت آئی، قلم کو سنوارتا گیا۔ **1934**ء میں عزیز تھیٹر کی اسٹیج پر میرا ڈراما ''جہاں آراء'' پیش ہوا۔ اب میں نے ساری توجہ ڈراما نگاری پر صرف کی۔ **"The last days of Pompei"** ''پومپے آئی کے آخری ایام'' کو طویل اردو ڈرامے میں ڈھالا۔ لارڈ ٹینی سن کا نایاب

منظوم ڈراما ''دی کپ'' کا ''مقدس پیالہ'' کے نام سے ترجمہ کیا جو ماہنامہ ''عالمگیر'' کے خاص نمبر میں چھپا۔ بیسیوں ڈرامے لکھے۔ پہلا ڈرامائی مسودہ غالباً 1953ء میں ''کانچ کے پتلے'' کے نام سے ''گوشہ ادب'' کو دیا۔

ادھر ریڈیو ایجاد ہوا، لاہور میں پہلا اسٹیشن کھلا۔ میری بن آئی، اس کی کہانی الگ سے کبھی تحریر میں لاؤں گا۔ بہر حال ڈراما، فیچر، دستاویزی پروگرام اور بات چیت سبھی اصناف میں کام کیا، بھرپور کام کیا۔ ڈرامے کے لئے ضروری ہے کہ یہ پیش کیا جائے۔ اس کے لئے ڈراما نگار، اسٹیج، ریڈیو اور ٹی وی کا محتاج ہوتا ہے۔ بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، چنانچہ 1940ء ہی میں مجھے یہ سوجھا کہ ڈراما نگاری کے پہلو بہ پہلو افسانہ نگاری بھی اختیار کروں۔ افسانے کے لئے اسٹیج کی احتیاج نہ تھی۔ افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ 1949ء میں پہلا اعلیٰ پائے کا افسانہ ''پھول سائیں'' لکھا جسے مرحوم رفیق خاور نے بہت سراہا اور ''ماہ نو'' (شمارہ مارچ 1949ء) میں شریک اشاعت ہوا۔ زندگی کے بوقلموں مناظر، مشاہدے، مطالعے کی دولت سے دامن بھرا۔ محنت، لگن اور پتہ مارنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ جان ماری اور اللہ کے کرم سے اردو ادب کو بے مثال افسانے دیئے۔ افسانے کا خام مال ہاتھ بھر دور ملا۔ یہ خام مال بہت ہی نادر و نایاب، بے بہا اور بے انت تھا۔ میں نے افسانے تو ہر موضوع پر لکھے ہیں لیکن شہرت بازاری خواتین کے افسانوں کی بدولت ملی۔ میں نے جس گہرائی، توجہ اور انہماک سے اس بازار کی عورت کو دیکھا۔ اس کی زندگی کے خفی و جلی پہلوؤں کا مطالعہ کیا، اس کی وفائے جفا نما اسرار و رموز کو جانا پہچانا، معاشرے کی اس گالی کو پھول بن کر مسکراتے اور آباد گھروں کو آگ لگاتے پایا تو میں حیران رہ گیا۔ شرفاء، اخلاقیات کے ٹھیکیداروں، دن رات اسے کوسنے والوں کے ہجوم میں وہ بتیس دانتوں میں زبان تھی جو ناگن کی طرح کام کرتی، لفظوں کی جادوگرنی صدیوں سے ایک آزاد مستحکم معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ آندھی، طوفان، بارش، سیلاب اس کے ایوانوں کی دیواریں منہدم کرنے سے قاصر ہیں۔ میں نے اس عورت کو دیکھا، سمجھا، اس کے کاروباری

آداب، طریقِ کار، اس کی عیاری، فریب کاری، ہنر مندی کے کرشمے دیکھے۔ اس کے کارنامے اور اس کی فتوحات بے مثال ہیں۔ میں نے پون صدی کے لاہور کی طوائف کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھرپور انداز سے زندہ جاوید کر دیا ہے۔ یہ میرا عظیم ترین ادبی کارنامہ ہے۔ میں نے ایک ایسا موضوع لیا ہے جو نیا ہے، اچھوتا ہے، اس پر اوروں نے بھی افسانے لکھے ہیں۔ منٹو کا ذکر بھی اس ضمن میں لیا جاتا ہے لیکن سب کا کام ادھورا ہے۔ طوائف بھرپور انداز سے اس گناہگار ہی نے پیش کی ہے۔ میں اب بھی اس پر افسانے لکھ رہا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے کسی دوسرے موضوع پر افسانے نہیں لکھے۔ پھول سائیں، پھرکی، رام پیاری، زرینہ اور ہاشم، گھر کا رانجھا کیسری لاچا، سلطانہ، بدر بہادر ڈکیت، فرنگن، قیصراں اور کتنے ہی دوسرے افسانوں کا تعلق اس بازار سے نہیں۔ موضوع کی دلکشی اور اچھوتا پن اپنی جگہ اہم ہیں لیکن افسانہ نگاری کی ٹیکنیکی خوبی، مہارت، تجربے کی گہرائی اور وسعت، مشاہدے کا کمال اہم تر ہے۔ میرے ہر موضوع کے افسانوں میں فنی کام یکساں طور پر اہم ہے البتہ طوائف / عورت کی حکایت شیریں کچھ زیادہ ہی اپنے اندر کشش رکھتی ہے۔ بہر حال مجھے تعلّی کی عادت نہیں، مجھے جو مقام میرے افسانوں کے حوالے سے مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر وزیر آغا اور بعض دیگر اعلیٰ پائے کے نقادوں نے دیا اور میری ذاتی رائے کا استحکام بخشتے ہیں۔ بہر حال میرا یہ کارنامہ ہے کہ میں نے پچھلی پون صدی کی طوائف کو اپنے افسانوں میں اسیر کر لیا ہے جو مر چکی ہے، اس کے بطن سے نئی طوائف پیدا ہو چکی ہے لیکن اپنی ماں سے بہت مختلف ہے۔

o

رحمان مُذنب

تنویر ظہور

س: آپ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ منٹو سے بہتر افسانہ نگار پیدا ہو گیا ہے، کیا یہ سچ ہے؟

ج: سچ ہے، بالکل سچ ہے، البتہ پیدا ہو گیا ہے کے بارے میں صراحت کر دوں کہ تخلیقی جوہر قدرت عطا کرتی ہے۔ اس جوہر کو سنبھالنا، نکھارنا اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا بندے کا کام ہے۔ اس سلسلے میں مجھے ریاضت، مسلسل ریاضت، رات دن ریاضت کرنی پڑی۔ آداب فن سیکھنے اور ان پر تبحر پانے کے لئے بے پناہ مطالعہ کرنا پڑا۔ ملکی اور غیر ملکی ادب پڑھنا پڑا۔ فقط کتابی کیڑا نہیں بنا۔ لوگوں سے ملا، ان کے ظاہر و باطن کو جانا جانچا، انہیں ٹٹولا کھنگالا، پھر اپنے مشاہدات و تجربات کو اپنے جذبات، محسوسات، سوچ، خیالات، تصورات کے ساتھ یکجا کیا۔ سب کو جانچا پرکھا۔ فنی تقاضوں کی روشنی میں سب کچھ دیکھا اور تخلیقی کارگاہ سے وہ اکائی نکال کر لایا جسے افسانہ کہتے ہیں۔ تمام مراحل سے گزر کر...... مطلوبہ تجربہ مکمل کر کے، آداب فن سیکھ کر ہی میں نے بڑے اور بھرپور افسانے دیئے ہیں۔ کاتا اور لے دوڑی والا معاملہ نہیں کیا۔ بڑی جاں سوزی کی، سخت محنت کی۔

''پتلی جان، رام پیاری اور بالا خانہ'' تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ڈھکی چھپی کوئی بات نہیں۔ قارئین کرام میرے افسانے پڑھیں، از خود معلوم ہو جائے گا کہ یہ کس پائے کے فن پارے ہیں، کس قدر محنت اور مشقت کا ثمر ہیں یہ!

کہانی کی بنت، کردار نگاری، ماحول کی عکاسی، اندازِ بیاں میں اپنے آپ مہارت،

ندرت اور انفرادیت پیدا نہیں ہوئی۔ بڑی جان مارنی پڑی ہے، اگر میں خود کو رواں صدی کا بڑا افسانہ نگار سمجھتا ہوں تو یہ ان افسانوں کی بدولت ہے جو مالک کی مہربانی، میری انتھک محنت اور برسوں کی لگاتار سعی سے معرضِ ظہور میں آئے ہیں۔

س: آپ پر فحش نگاری کا الزام ہے؟ اگرچہ یہ بات مختلف تاثر رکھتی ہے جو منٹو کے حوالے سے ذہن میں آتی ہے، آپ کیسے فحش نگار ہیں؟

ج: مجھ پر کوئی فحش نگاری کا الزام نہیں، میں ہرگز ہرگز فحش نگار نہیں۔ میں تو فحش نگاری کے سخت خلاف ہوں البتہ اگر کسی نے اپنے طور پر ازراہ حسد یا تعصب میرے خلاف ذہن میں بات بٹھالی اور اپنے حلقہ اثر و ارادت میں پھیلائی ہو تو اور بات ہے ورنہ مجھ پر جن صفِ اول کے نقادوں نے مضامین لکھے ہیں، ان میں سے کسی نے بھی ادھر اشارہ نہیں کیا۔ مولانا صلاح الدین احمد، مرزا ادیب، ڈاکٹر وزیر آغا، انور سدید، غلام الثقلین نقوی، صابر لودھی میں سے کسی نے بھی تحریری طور پر یا زبانی ایسا کوئی خدشہ اشارتاً اور کنایتہً بھی ظاہر نہیں کیا۔ آج سے پچاس پچپن سال قبل شبلی بی۔کام کے عہدِ ادارت میں ماہنامہ عالمگیر میں اس موضوع پر میرا مضمون بھی شائع ہوا تھا۔ علم دوست حضرات نے اس کے اجزاء اپنے مقالوں میں شامل کئے تھے...... مجھے فحش نگاری کی ضرورت نہیں، میں اپنے افسانوں میں بیسیوں جگہ بچ نکلا ہوں۔ اللہ کے فضل سے میرے پاس ذخیرہ الفاظ بھی ہے اور انداز بیاں بھی۔ میں فحش سے فحش بات کو نا قابلِ اعتراض اسلوب سے ظاہر کرنے پر قادر ہوں، منٹو مرحوم کی اور بات تھی۔ بوتل نے اس کی روزمرہ کی زندگی اور اس کے قلم پر جو اثرِ بد ڈالا اس سے اس کے افسانے متاثر ہوئے، وہ ہمیشہ جلدی میں ہوتا تھا۔

س: آپ نے ہندو مائیتھولوجی کا مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاتی ہے۔ اس بات کی کیا حقیقت ہے اور اس کا جواب کیا ہے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ پاکستانی ادب لکھتے ہوئے ہندی مائیتھولوجی کا سہارا لیا جائے؟

ج: میں Social Anthropology کا سنجیدہ طالب علم ہوں۔ 28 اگست

1951ء کو میں نے بابائے بشریات کی لافانی تالیفGolden Bough کا پہلا ورق کھولا اور پھر یہ موضوع میری توجہ سمیٹتا گیا۔ ترقی یافتہ ممالک کی یونیورسٹیوں میں اس موضوع کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ بشریات کے حوالے سے اربوں کھربوں روپے کے نوادرات عجائب گھروں میں بہ حفاظت رکھے گئے ہیں......

یہ بہت بڑا موضوع ہے۔ میرا پہلا ہدف یونانی ادب، یونانی دیومالا، یونانی روایات ورسومات اور یونانی کلچر تھا۔ اس کے بھرپور مطالعے کے بعد میں نے اپنا تحقیقی مقالہ، یونان کا عہدِ جاہلیت اور دیومالا کا ارتقاء (مطبوعہ سہ ماہی، اقبال، لاہور، پہلی قسط اکتوبر 1964ء دوسری قسط اپریل 1965ء صفحات 66) پیش کیا اور مقالے بھی لکھے۔ مطالعے سے معلوم ہوا کہ یونان کا استاد تو مصر تھا اور وہیں سے یونان کو دیومالا ملی۔ چنانچہ مصریات کا مطالعہ کیا، بھرپور مطالعہ کیا۔ بھارت کی دیومالا کا مطالعہ بھی اسی دوران میں کرتا رہا۔ زیادہ توجہ سنسکرت تھیٹر اور ڈرامے پر رہی۔ (قبل ازیں یونان کے ڈرامے اور تھیٹر پر کام کیا) یونان کا تھیٹر، سوفوکلیز، دو مقالے سہ ماہی اقبال میں چھپے۔ بعض مقالے ہنوز غیر مطبوعہ حالت میں ہیں...... دیومالا کے قصے، ہومر کی داستانیں، مصر اور یونان کا قدیم ادب یہ سب ہمارے ماضی کا قیمتی سرمایہ ہے۔ داستانوں، افسانوں، ناولوں، ڈراموں اور تھیٹر کے ارتقاء کی تاریخ کی ابتداء میں بڑی حد تک قدیم دیومالائی سرمائے سے ہوئی۔ یاد رہے کہ ''الف لیلہ'' کی سب سے مشہور کہانی ''علی بابا اور چالیس چور'' مصر کے ایک فرعون کی سچی کہانی ہے جسے ہیرودوطس نے اپنے سیاحت نامے میں بیان کیا ہے۔ ہندی دیومالا یا کسی دوسرے ملک کی دیومالا سے استفادہ کرنا کسی طور پر شجرِ ممنوعہ نہیں۔ میری دو کتابیں ''دینِ ساحری، اسلام اور جادوگری'' بشریات ہی سے متعلق ہیں۔ دھرتی دھرم کا مطالعہ کرنا اور اس موضوع پر لکھنا جرم نہیں اس پر ایمان لانا جرم ہے، گناہ کبیرہ ہے۔ میرے افسانے پاکستانی ادب میں شمار کئے جائیں گے۔ ہندی دیومالا پر میں نے الگ مقالے لکھے ہیں۔ دیومالا یا دھرتی دھرم جھوٹا مسلک ہے لیکن اگر ڈاکٹر وزیر آغا

نے میرا جی کی شاعری میں اس کے عناصر دریافت کیے ہیں تو انہوں نے حقیقت کا اظہار کیا ہے اور یہ ان کا قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ موہنجوداڑو بھی دھرتی دھرم کا سرچشمہ تھا۔ ہم موہنجوداڑو کا کھوج لگا رہے ہیں، اسے پوج نہیں رہے۔

تمام دنیا کے علمائے بشریات دھرتی دھرم، دھرتی پوجا، شمس پرستی اور بیسیوں موضوعات پر کام کر رہے ہیں۔ وہ اپنے مسلک کی قیمت پر تو ایسا نہیں کر رہے۔ میرا موضوع اسلام اور قبل اسلام کے ادیان سے ہے۔

پاکستان کے ادب اور مائیتھولوجی لازم و ملزوم تو نہیں لیکن ہمارا ادب ان محاوروں اور علامات سے خالی نہیں جو دیو مالا سے لے لی گئیں۔ پنیدورا کا پٹارہ، جس کی لاٹھی اس کی بھینس، غرور کی خدائی، فرعون کی خدائی، پرومی تھیوس، ایڈی پس وغیرہ سب کا ماخذ قدیم دیو مالائی کہانیاں ہیں۔

س: آپ نے ڈرامے لکھے ہیں، مگر ان کا کوئی امپیکٹ نہیں بن سکا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: میں ڈرامے لکھتا ہوں اور تھیٹر پر تحقیقی کام کرتا ہوں۔ امپیکٹ بنے نہ بنے، خدا کے فضل و کرم سے میرا قلم رواں رہتا ہے۔ چالیس کے لگ بھگ کتابیں ہیں۔ امپیکٹ نہیں بنا تو کیا کروں؟ امپیکٹ نقاد بناتے ہیں۔ پی آر سے بنتا ہے۔ اگر نقادوں کا ایک گروہ مجھے جان بوجھ کر نظر انداز کر رہا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ مولانا صلاح الدین احمد، مرزا ادیب، وزیر آغا، غلام الثقلین نقوی، انور سدید، اے حمید، اسلم رانا، افضل پرویز، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، طاہر لاہوری، محسن فارانی، قمر زیدی، پروفیسر سید حسن طاہر اور بعض دیگر اصحاب نے مجھ پر کچھ لکھا ہے تو میں ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ اتنا ہی کافی ہے۔ مجھے امپیکٹ بنانے کے گر آتے ہیں لیکن میرے پاس وقت نہیں، لکھنے پڑھنے سے فرصت نہیں۔ میرا کام قلمکاری ہے۔ میری تحریروں کو جانچنا، پرکھنا اور پھیلانا کسی اور کا کام ہے۔ اگر دوسرے لوگ اپنا کام نہ کریں تو وہ جانیں، میں ادائے فرض میں کوتاہی نہیں کر رہا۔

س: آپ نے زندگی میں بہت کام کیا ہے اور مختلف علمی اور ادبی شعبوں میں کام کیا ہے

لیکن لوگوں نے آپ کی کامیابیوں کو پوری طرح قبول نہیں کیا؟

ج: میرے کام کو ان لوگوں نے قبول نہیں کیا جو تعصب کے مارے ہیں، جو حسن کی آگ میں جلتے ہیں، جو کور چشم ہیں، جو قلم کی عظمت سے ناواقف ہیں، جو صرف اپنے کام کو سراہتے ہیں، آپ اپنی ڈفلی بجاتے اور شور مچاتے ہیں۔ میں ایسا نہیں کرتا کیونکہ میرے پاس ایسی حرکتوں کے لئے وقت نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک زندگی کا ہر لمحہ نہایت قیمتی ہے۔ اسے صرف اور صرف اس عظیم مشن کی تکمیل میں صرف کرنا چاہیئے جس کے لئے قدرت نے تخلیقی جوہر ایسی نادرونایاب چیز عطا کی ہے اور جو سیم وزر کے انباروں کے عوض بھی میسر نہیں آتی۔ ادیب سیم وزر کے انباروں سے مبرتر اور بالاتر ہوتا ہے۔

میں مطمئن ہوں کہ میں نے اللہ کے فضل سے افسانے، ڈرامے اور بعض علوم کے فروغ کے لئے کام کیا۔ اس ضمن میں تھوڑی بہت جو شہرت ملی ہے میں اس پر قناعت کرتا ہوں۔ مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے، پر حبیب بنک ادبی انعام برائے **1971**ء ماحولیات کے موضوع پر مقالے (وادی سندھ اور اس کا ماحول) پر پاکستان سائنس فاؤنڈیشن کا انعام، بچوں کے ناولٹ (لکڑہارا اور چور) پر پاکستان رائٹرز گلڈ اور ترقی اردو بورڈ کراچی کا انعام میرے لئے کافی ہے۔ یونان کا عہدِ جاہلیت اور دیومالا کا ارتقاء، ڈرامے کی ابتداء اور بعض دوسرے تحقیقی مقالات میرے لئے دائمی تسکین کا موجب ہیں۔ ''تپلی جان، پھول سائیں، خلاء، چڑھتا سورج، بالا خانہ، باسی گلی، کوباں کی جنت، گشتی اور قیصراں'' میرے بہترین افسانے ہیں اور کوئی بھی دیانت دات نقاد اردو ادب کے ان شاہکاروں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ لاریب یہ اردو کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔

س: آپ لگن والے آدمی ہیں چنانچہ تنہائی میں بیٹھے کام کرتے رہتے ہیں۔ کیا آپ کو گوشہ نشینی میں زیادہ مزہ آتا ہے؟

ج: میں لگن سے کام ضرور کرتا ہوں لیکن تنہائی پسند ہرگز نہیں۔ گھر میں کوئی گوشہ یا کوئی کمرہ کام کے مخصوص نہیں کیا۔ ایسا نہیں کہ کام کرتے وقت دروازے بند کر کے بیٹھ جاؤں۔

میں ہر کمرے میں کھلے بندوں کام کرنے کا عادی ہوں۔ گھر میں شور اور ہنگامہ ہو رہا ہو، گلی میں ڈھول بج رہا ہو، لڑکے غل مچا رہے ہوں، میری بلا سے۔ بس اتنا ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگا ہو اور مجھے بلائے نہیں۔ میں اطمینان سے کام کرتا رہتا ہوں البتہ جب ننھے منے پوتے پوتیاں آئیں، میرے گرد جمع ہو جائیں۔ قلم، کاغذ، کتاب اور عینک چھیننے چھیڑنے لگیں تو میں کام چھوڑ دیتا ہوں اور ان سے کھیلنے لگتا ہوں، پھر جب وہ دودھ پی کر سو جاتے یا ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے لگتے اور مجھے فراموش کر دیتے ہیں تو میں کام کر لیتا ہوں۔

یہی میرا اصول ہے۔ میں روزِ اول سے آوارہ واقع ہوا ہوں۔ نیک و بد سے گھلنا ملنا، ان کی زندگی میں داخل ہونا اور انہیں اپنی زندگی میں داخل کرنا میرا معمول ہے، میں ہر آدمی کو کتاب کا درجہ دیتا ہوں۔ ہر آدمی ...... برا بھلا جیسا بھی ہو میرے لئے قابلِ مطالعہ ہوتا ہے۔ مکمل افسانہ یا ڈراما ہوتا ہے، کسی افسانے یا ڈرامے کا چھوٹا یا بڑا کردار ہوتا ہے۔ وہ عبادت گاہ میں ہو، بازار یا کوچے میں ہو، مجرا خانے، چانڈو خانے، کوٹھے، کوٹھی یا کوٹھڑی میں ہو، میں اس تک فرض کے طور پر پہنچتا ہوں۔ ہزاروں آدمیوں سے ملا۔ برسوں ان سے ملاقاتیں رہیں۔ ان سے بہت کچھ سیکھا۔

س: آج کل لوگ شہرت کے لئے مرے جا رہے ہیں۔ آپ نے کبھی نہیں سوچا کہ مشہور ہو جائیں؟

ج: شہرت کی طلب فطری امر ہے۔ مجھ میں شہرت کی خواہش ہے لیکن اس کے لئے جتن کرنا پڑتا ہے، بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، مجھ سے یہ نہیں ہوتا۔ کام کرتا اور ڈوری خدا پر چھوڑ دیتا ہوں۔ وہی عزت دیتا ہے، وہی ذلت دیتا ہے۔

س: آپ نے پنجابی میں بھی کام کیا ہے جبکہ ایک سیاسی اور مذہبی لیڈر نے اس زبان کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے؟

ج: مجھے پنجابی، اردو اور عربی سے محبت ہے۔ پنجابی میرے دیس پنجاب کی زبان ہے۔ میں نے اس میں ڈرامے اور افسانے لکھے ہیں۔ ارسطو کی بوطیقا کا پنجابی میں ترجمہ کیا ہے۔

47 صفحوں کا دیباچہ لکھا ہے۔ پنجابی میں علمی کام بہت کم ہوا ہے۔ اگر کوئی سیاستدان سیاسی یا مذہبی نظریے کے تحت پنجابی کی مخالفت کرتا ہے تو یہ ظالمانہ رویہ ہے۔ ہمیں انگریزی سے تو محبت ہے لیکن پنجابی سے نفرت ہے، اردو اور تمام علاقائی زبانیں ہمارے کلچر کا حصہ ہیں۔ ان کا فروغ ہماری تہذیبی سوچ کے فروغ کا باعث ہیں۔ ان سے یا ان میں سے کسی سے تعصب برتنا سخت افسوس ناک ہے۔

س: کیا بحیثیت مجموعی آپ معاصر افسانہ نگاروں کے فن سے مطمئن ہیں؟

ج: قطعاً مطمئن نہیں۔ آج کا افسانہ نگار حالات کی چکی میں پس رہا ہے۔ اسے دال روٹی کا بندوبست کرنے ہی سے فرصت نہیں۔ نہ پڑھنے کا وقت ملتا ہے نہ لکھنے کے لئے۔ زندگی کے معمولات، مشاغل اور روزمرہ کی ضروریات بے حساب ہیں۔ آج سے نصف صدی قبل زندگی بہت سادہ تھی، بیکاری تھی، ادبی کام کرنے کے لئے بکثرت وقت مل جاتا تھا۔ ادب ہمہ وقتی مشغلہ ہے۔ اب افسانہ نگار ہمہ وقت کام نہیں کر پاتا۔ آج بڑے افسانے کا فقدان ہے کیونکہ بڑا افسانہ وقت مانگتا ہے، مشاہدے اور تجربے کے لئے، ریاضت کے لئے، مطالعے کے لئے، یہی میسر نہیں۔

س: ڈاکٹر وزیر آغا خود کو لفظ انشائیہ اور صنف دونوں کا موجد بتاتے ہیں، آپ ان کو واقعی ایجاد کنندہ تصور کرتے ہیں؟

ج: وزیر آغا خاص نوع کا انشائیہ لکھتے ہیں جس سے کچھ اس نوع کا تاثر پیدا ہوتا ہے، معطر معطر، خراماں خراماں نسیم آرہی ہے کہ وہ آرہے ہیں۔

میرے نزدیک **Essay** کا دامن بہت کشادہ ہے۔ فلک پیما سے لے کر اب تک انشائیے نے بڑی ترقی کی ہے اور وزیر آغا نے اس کے لئے بڑا کام کیا ہے۔ میں نے جب نصف صدی قبل طامس ہکسلے کے **Essays** پڑھے۔ بالخصوص، ارتقائے حیات کے موضوع پر یا ہیزلٹ اور دیگر اہلِ قلم کے **Essays** پڑھے تو اردو کا انشائیہ ایک نئی شے معلوم ہوا کیونکہ اس میں طامس ہکسلے کو شامل ہی نہیں کیا جاسکتا۔ انشائیے کے اسکوپ کو سکیڑنا نہیں چاہیے۔ وزیر آغا نے انشائیے ہی نہیں دیگر اصناف

میں بھی تاریخی کام کیا ہے۔

س: سرگودھا سکول کی خدمات آپ کی نظر میں ادبی حوالے سے کیا ہیں؟

ج: میرے نزدیک سرگودھا سکول، لاہور سکول سے جدا نہیں۔ اسے علاحدہ سکول کہنے کی کیا ضرورت؟ جہاں جہاں بھی کوئی ہے، اس کی قلمی کاوشوں کو ادبی حوالے سے جانچنا پرکھنا چاہیئے۔ وزیر آغا نے علم و ادب کے لئے قابلِ قدر کام کیا ہے۔ لاہور میں رہ کر بھی، سرگودھا اور وزیر کوٹ میں بیٹھ کر بھی۔ اسی طرح دوسرے ادیبوں، شاعروں اور محققوں نے بھی کام کیا۔ سبھی کا وجود مبارک ہے۔ وزیر آغا نے سرگودھا کو دوسرا لاہور بنا دیا ہے۔

س: آپ کو ڈاکٹر وزیر آغا کے گروہ کا فرد سمجھا جاتا ہے، کیا آپ اس الزام کو تسلیم کرتے ہیں؟

ج: گروہ نہیں ٹیم کہیئے! میں کسی لابی، کسی گروہ یا کسی جھگڑے میں شامل نہیں۔ وزیر آغا سے میرا تعلق حلقہ اربابِ ذوق کے حوالے سے اور دوستی قلم کے حوالے سے ہے۔ ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے تتلی جان اور میرے دوسرے افسانوں کے حوالے سے مجھے دریافت کیا۔ وہ بڑے زیرک نقاد ہیں، دقت نظر سے کام لیتے ہیں، بڑی گہرائی تک جاتے ہیں۔ اس دور کے سب سے بڑے نقاد ہیں۔ انہوں نے میری تحریریں شوق سے اپنے پرچے میں چھاپیں۔ ادب میں میرا مقام متعین کیا۔ اسی طرح مولانا صلاح الدین احمد، مرزا ادیب، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، حکیم یوسف حسن، شبلی بی کام، رفیق خاور، میاں ایم ایم شریف، نذیر لدھیانوی (مدیر مصور ویکلی) حامد علی خان اور خالد اقبال یاسر نے مجھے اپنے پرچوں میں جگہ دی۔ حامد علی خان نے پچاس ساٹھ سال پہلے میرے ڈراموں کے بارے میں جو خطوط لکھے، وہ حرزِ جاں سمجھ کر میں نے سنبھال رکھے ہیں۔ میں مذکورہ بالا مدیران جرائد کا شکر گزار ہوں۔ میرے دل میں ان کے لئے بڑی عزت ہے۔ اگر میں وزیر آغا کے کام کو سراہتا ہوں لیکن کسی دوسرے کا مخالف نہیں۔ میری رفاقت علمی اور ادبی واسطے سے ہے۔ لٹھ بندی کے حوالے سے نہیں۔ لڑائی جھگڑے میں، میں کسی کا طرف دار نہیں۔ اس لئے لفظ گروہ سے مجھے چڑ ہے۔ اس کی بجائے ٹیم کہتا ہوں۔ اس ٹیم کے سربراہ وزیر آغا ہیں۔

س: تجریدی اور علامتی افسانہ نگاری کا مستقبل کیا ہے؟

ج: ان کا کوئی مستقبل نہیں۔صرف روایتی افسانے کا مستقبل ہے، ویسے علامت کو شاعری اور افسانے میں استعمال کرتے ہیں۔اس سے حسن پیدا ہوتا ہے۔علامت اعلیٰ نوع کی فنی جمالیاتی شے ہے۔

س: آپ نے بحیثیت افسانہ نگار اور ناول نویس کن اہم ادبی شخصیات سے اثرات قبول کئے ہیں؟

ج: میں نے اردو، فرنگی، فرانسیسی، روسی، یونانی ادیبوں کو پڑھا ہے۔افسانہ نگاری میں منشی پریم چند کو اپنا استاد مانتا ہوں، سبھی کو پڑھتا ہوں۔بیلزیک کے اندازِ بیاں کو بے حد پسند کرتا ہوں لیکن میں نے کسی کو نقل نہیں کیا۔میرا اپنا اندازِ بیاں ہے اور اس میں انفرادیت ہے۔میری اپنی تکنیک ہے۔میں نے دوسروں سے سیکھا ہے لیکن اپنا راستہ خود بنایا ہے۔

س: کیا آپ توہم پرست ہیں؟

ج: میں قطعاً توہم پرست نہیں، لیکن دینِ ساحری Magic کے حوالے سے توہم پرستی کا وسیع مطالعہ ضرور کیا ہے۔

س: کیا آپ کی اولاد میں سے کوئی ادب کی طرف آیا؟

ج: جی نہیں! میری ایک بیٹی نے ادھر توجہ دینا چاہی تو میں نے اس کی حوصلہ شکنی کی۔جس میں بھوکا مرنے کا حوصلہ ہو، وہ ادھر آئے۔اللہ کا کرم ہے، میری ادب پسند بیٹی گریڈ سترہ میں ایک درسگاہ میں پڑھاتی ہے اور مطمئن ہے۔

............O............

رحمان مذنب سے ملاقات

شازیہ الیاس صمدانی

مثل مشہور ہے کہ خدا کو کسی نے دیکھا نہیں اس کی قدرت سے پہچانا ہے۔ دنیا میں اس کی قدرت کی نشانیاں خوبصورت جسم و جان اور دلکش پیکر کے ساتھ زندہ ...... بن کر ہمارے روبرو کھڑی ہو کر پوچھتی ہیں کیا مجھ جیسا کوئی حسین ہے؟ اگر نہیں تو پھر میری شخصیت (پہچان) کے بارے میں جانو اور ہم اس شخصیت کو ڈھونڈنے کے لئے اس پیکر کو سرتا پا ٹھونک بجا کر دیکھتے ہیں۔

مجھے ایم۔اے اردو کی تحقیقی مقالہ کے لئے جس موضوع پر کام کرنا تھا وہ ''رحمان مذنب کی شخصیت و فن'' تھا۔ مجھے اکثر ادباء، شعراء، سیاستدانوں، تاجروں، آفیسروں اور متعدد شعبہ ہائے زندگی کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن رحمان مذنب سے ملنا مجھے حواس باختہ کر گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے مجھے ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہو جس کے نیچے گہری کھائی ہو اور اوپر پتھریلے پہاڑ ہوں اور مجھے کسی ایک راستے کا انتخاب کرنا ہو۔ میں بڑی مشکل میں تھی اور خوب جانتی تھی کہ کسی ادبی شخصیت سے ملاقات کرنا کتنا دشوار کام ہے؟ کیونکہ اگر ملنے والا اس کے پائے کا بندہ ہے تو ڈنگل کانٹے دار ہے اگر دونوں مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک ہیں تو برابر کی چوٹ ہے۔ اگر ایک تیز طرار اور دوسرا بردبار ہے تو ماحول خوشگوار ہے۔ مجھے پھر متفکر خیالات نے آگھیرا اور میں سوچنے لگی کہ تپلی جان، بالا خانہ اور رام پیاری جیسے افسانوی مجموعے لکھنے والا شخص ضرور اوباش اور دلچسپ آدمی ہوگا۔ عورت بالخصوص پیشہ ور عورت کی زندگی کھنگالنے والا جہاندیدہ شخص انتہائی آزاد خیال، اخلاقی لحاظ سے غیر مہذب اور روحانی اعتبار سے مشکوک ہوگا یا پھر اپنے آپ کو کھنڈر کرنے، اپنی دنیا کو بگاڑنے کے بعد سنوارنے، اللہ اللہ کرنے، تسبیح پھیرنے والا

بوڑھا بابا ہوگا لیکن مجھے اپنا یہ خاکہ سوچ کی لہروں پر اڑتا اور ڈانواڈول محسوس ہوتا کیونکہ بقول صابر لودھی......

''وہ نہ تو احساسِ گناہ کا شکار ہے اور نہ کسی طرح کے کمپلیکس میں مبتلا ہے۔'' پھر ذہن نے ایک اور خاکہ بنایا کہ ریڈیو، ٹی وی کا پیٹ افسانوں، ڈراموں سے بھرنے والا رحمان مذنب اب قلم کو بڑھاپے کی لاٹھی بنائے کاغذی سفر کر رہا ہوگا۔...... عجب کہ سوفوکلیز، یوری پیڈیز اور ایسکی لس کے شاہکار کا یہ حافظ ''علی بابا'' ٹائپ ہو۔...... خیر کیا تھا میرے دل کو ڈھارس بندھی اور میں نے اللہ کا نام لیا اور 26 جولائی......کو اپنے عزیز جہانگیر کے ہمراہ خوابوں کے شہر لاہور میں اس بزرگ کامل کی تلاش میں نکلی۔ اچانک ایک منٹ کے دسویں سیکنڈ میں مجھے احساس ہو گیا یہ ''رحمان''......''مذنب'' کی پیچیدگی کی طرح اس کا ایڈریس بھی پیچیدہ ہے۔ عطاء الحق قاسمی...... یونس بٹ اور پروڈیوسر عابد بخاری و قمر علی شاہ اپنی پوری کوشش سے ناکام ہو چکے تھے۔ بہر حال طاہر اسلم گورا اور خواجہ زکریا صاحب کی یادداشت کے سہارے اتحاد کالونی، شیراز پارک، ملتان روڈ تک رسائی حاصل ہوگئی۔ جب اس ایڈریس کو لے کر چلے تو ایک صاحب کتاب نے انکشاف کیا کہ آپ مغز ماری نہ کریں وہ تو کسی بالا خانے میں پڑا ہوگا۔ میں نے جو کافی عرصہ سے اس کی متلاشی تھی اس رائے کو بلا چوں و چرا قبول کر کے آمنا و صدقنا کہا لیکن جہانگیر صاحب بضد تھے کہ اس ''ملنگ'' کو ضرور ڈھونڈنا ہے چنانچہ ازسرِ نو را انجھا را انجھا ہونے لگی۔ ایک عمر رسیدہ بزرگوار کی مدد سے چلچلاتی دوپہر میں سکیم موڑ، پٹرول پمپ، ڈاکٹر نارو کلینک، کیپٹن نعیم شہید روڈ سے ہوتے ہوئے مجاہد روڈ پر 18 غزالی سٹریٹ پہنچے۔ گلی کا نکڑ کا پلاٹ خالی تھا جس کے ساتھ بہت خوبصورت صاف ستھری پھولوں سے ڈھکی Wreath ساڑھے بارہ مرلہ کی دو منزلہ وائٹ بلڈنگ پوری گلی سے منفرد نظر آ رہی تھی۔ جس کے سفید گیٹ کے ایک جانب نیم پلیٹ پر رحمان مذنب جلی حروف میں لکھا تھا اور دوسری جانب Call-Bell نمایاں تھی۔

میں نے بیل بجاتے ہوئے یوں سکون کا سانس لیا جیسے بیل کی ٹرن ٹرن کے ساتھ میرے گلے میں چبھی ہوئی پھانس اچانک نکل گئی ہو۔ قدموں کی آواز آئی اور بڑے باوقار انداز سے پوچھا گیا......

''کون ہے؟''

میں نے کہا! ''طالب علم۔''

اور زیرِ لب دہرایا ''بڑی دیر کردی مہرباں آتے آتے'' دروازہ کھلا، سامنے سیاہ و سفید بالوں والا ایک راست قامت شخص چاکلیٹ کلر کی شلوار اور سفید بنیان پاؤں میں سلیپر پہنے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی پیچھے کو ہولیا اور فرمایا......

''کس سے ملنا ہے؟''

میں نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے جھٹ کہا......

''سر! رحمان مذنب صاحب سے ملنا ہے۔''

''کیوں ملنا ہے؟ کیا کام ہے؟ کہاں سے آئے ہیں؟''

''اچھا چلیے تشریف لے آئیے۔''

ہم آگے آگے اور وہ شخص پیچھے پیچھے چھوٹا سا برآمدہ عبور کر کے گھر کے اندر چلا گیا۔ **Right-side** پر ایک تختہ دار دروازہ کھول کر ہم اندر چلے گئے۔ یہ ڈرائنگ روم تھا۔ فرش پر پھولوں والا براؤن کلر کا کارپٹ بچھا تھا۔ چاروں اطراف صوفہ سیٹ تھے۔ سامنے دیوار گیر شیشے کی الماری تھی جس میں کچھ تصاویر اور ڈیکوریشن لگی ہوئی تھی۔

اتنے میں وہی شخص کف کالر والی قمیض پورے بٹن گلے تک بند کیے ہوئے آیا اور بولا......

''میں رحمان مذنب ہوں۔''

''آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟''

اس سے پہلے کہ میں سنبھلتی کولڈ ڈرنک آگئے۔ یہ رحمان مذنب تو میرے تصور سے بالکل مختلف تھا۔ درمیانہ قد، بغیر مانگ کے سیاہ و سفید بال، جھکے جھکے پپوٹے، گہرے رنگ کی چمکدار آنکھیں جیسے سرِ شام بادل چھا جائیں، باریک گہرے سرخ ہونٹ، اوپر والا ہونٹ قدرے خمیدہ، چھوٹی ٹھوڑی، کشادہ پیشانی، چپٹے رخسار، کلین شیو، مخروطی ہاتھ...... قدرے ٹیڑھی انگلیاں۔ اسی (80) سالہ یہ رحمان مذنب مجھے بہت اچھا لگا، میرا ڈر خوف جاتا رہا۔ پھر سوالات کا ایک

طویل سلسلہ شروع ہوا۔ میں نے رحمان مذنب کی شخصیت کو بہت قریب سے دیکھا اور نتیجہ نکالا۔

رحمان مذنب ایک کثیر الجہت شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت کی بہت سی پرتیں ہیں۔ ہر پرت اتنی مضبوط ہے جیسے یہی بنیادی پرت ہو۔ رحمان مذنب نابغہ روزگار شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ بیک وقت ڈرامہ نگار، افسانہ نگار، دانشور، مترجم، محقق، تبصرہ نگار کے ساتھ ساتھ ایک محبت کرنے والے شوہر، مشفق باپ اور بچوں کے ہمدرد دادا و نانا ہیں۔ رحمان مذنب طوائفوں Prostitues کے ساتھ رہتے رہتے اپنے اندر بھی طوائف بسا بیٹھے ہیں جو بہت خود سرانا پرست ہے۔ اس طوائف نے ان کی شخصیت پر خود پسندی Presumptuous کا رنگ چوکھا چڑھایا ہے۔ وہ کسی دوسرے کو خود پر حاوی نہیں دیکھ سکتے۔ وہ ایک Out-standing persobnality رکھتے ہیں۔

رحمان مذنب کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی ''انفرادیت پسندی'' ہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں سے منفرد رہنا چاہتے ہیں اور اس کے اظہار کے لئے منفرد انداز اپناتے ہیں جہاں ایک مفکر کی سوچ کا دائرہ تمام ہوتا ہے۔ رحمان مذنب اس نقطہ سے اپنی سوچ کا آغاز کرتے ہیں۔ وہ اکثر خاموشی سے سر جھکائے ٹہلتے ہوئے کچھ سوچتے رہتے ہیں۔

بقول مذنب......

مضطرب رکھتا ہے میرا دلِ بیتاب مجھے
عین ہستی ہے تڑپ صورتِ سیماب مجھے

رحمان مذنب کی شخصیت کا ایک اور نمایاں پہلو ''کاملیت'' ہے۔ رحمان مذنب کے اندر کاملیت کا شوق ان کے والد صاحب نے پیدا کیا تھا جس کے باعث وہ اپنی سوچ، طریقہ،...... تخلیق اور طریقہ تحریر میں جاذبیت پیدا کرتے ہیں۔ ''شاکر میوزیم'' میں 18 دسمبر 1984ء میں دیو مالا اور اس کی حقیقت کے موضوع پر انہوں نے اتنا سیر حاصل فی البدیہہ لیکچر دیا کہ لوگ عش عش کر اٹھے اور بقول ڈاکٹر وزیر آغا ''رحمان مذنب دیو مالا کا سمندر ہیں۔''

رحمان مذنب اپنی فنکارانہ عظمت کا خود اعتراف کرتے ہیں لیکن جگہ جگہ اپنے نام کی دف نہیں بجاتے پھرتے۔ انہوں نے ہمیشہ چاہا کہ لوگ ان کی فنکارانہ عظمت کا اعتراف کریں،

انہیں سراہیں، ان سے استفادہ کریں، انہیں چاہیں اور یہ غلط بھی نہیں ہے بلکہ یہ تو ہر تخلیق کار کا بنیادی حق ہے۔ بقول مذنب......

''بعض اوقات میں نے ایسی ذمہ داریاں بھی نبھائی ہیں جن کو نبھانے کا کوئی دوسرا شخص متحمل نہیں ہوسکتا اور چونکہ ادیب ہونے کے ناطے میری طبیعت میں ایک تعلّی پائی جاتی ہے۔ اس لئے خود کو منوانے اور اپنے آپ کو اہل ثابت کرنے کے لئے میں ایسی بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا لیتا ہوں۔ ان ذمہ داریوں کے عوض کم از کم شاباش وصول کرنا میرا حق ہے۔''

رحمان مذنب غصے کی حالت میں کبھی کنٹرول نہیں کرتے اور برملا اس کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا غصہ ہمیشہ وقتی ہوتا ہے۔ وہ کسی بات کو دل میں نہیں رکھتے اور نہ ہی کڑھتے ہیں۔ جو دل میں ہوتا ہے بیان کر دیتے ہیں اور یہی ان کی جدید جوانی کا راز ہے۔

رحمان مذنب کی ہفت رنگ شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ''قوتِ عمل'' کے دلدادہ ہیں۔ یہ وہی وقتِ عمل ہے جسے شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے ''جہدِ مسلسل'' کا نام دیا ہے۔ رحمان مذنب اس قول کا چلتا پھرتا عمل ہیں۔ انہیں اس وقت تک سکون نہیں ملتا جب تک وہ اپنا مقصد حاصل نہ کرلیں کہ......

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے سے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

رحمان مذنب ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے ''میں فارغ نہیں بیٹھ سکتا کیونکہ زندگی کم ہے اور کام بہت زیادہ ہے۔ انسان کو ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے اور اس لمحے کو غنیمت سمجھنا چاہیے جس میں وہ کوئی کام کرتا ہے۔'' ایک اور جگہ کہتے ہیں بقول رحمان مذنب: ''میرا خیال ہے کہ دنیا میں باؤلے پن کی بیشتر واردات بے کاری کی وجہ سے ہوتی ہے اور بے کاری بیماری کا پیش خیمہ ہے، اس لئے بندے کو کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے۔''

رحمان مذنب ایک ''خوش گفتار'' انسان ہیں، جہاں وہ اپنی تحریروں سے دوسروں کے ذہنوں کو متاثر کرتے ہیں وہاں اپنی گفتگو خصوصاً آواز اور لہجے سے بھی دوسروں کے دلوں میں گھر

کرتے ہیں اور یہی ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

رحمان مذنب کی تحریروں میں ''ارتقاء'' پایا جاتا ہے، ان کی تحریروں میں جذبات کی ایک سلجھی اور منجھی ہوئی کیفیت ملتی ہے۔ یہ شائد ان کی شخصیت کا ارتقاء ہے۔ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ انہوں نے جب پریم چند کا افسانہ ''کفن'' پڑھا تو اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ وہ اس جیسا بلکہ اس سے بھی بہتر افسانہ لکھیں گے اور اس کے مقابلہ میں وہ ''تیلی جان'' کو پیش کرتے ہیں جو فن کی انتہائی بلندیوں کو چھوتا ہے اور اپنی طرز کا ایک انوکھا اور جدید افسانہ ہے جس کے بارے میں انور سدید کہتے ہیں......

> ''تیلی جان کے سب افسانے اس بازار کے افسانے ہیں۔
> تیلی جان اس انوکھی مخلوق کا افسانہ جو نہ عورت ہے اور نہ مرد۔ یہ قدرت کی عملی ستم ظریفی ہے۔ یعنی عورت اور مرد کے سنگم پر تیسری جنس۔
> رحمان مذنب نے اردو ادب میں پہلی دفعہ اس مخلوق کے احساسات و جذبات تک رسائی حاصل کی اور اسے انسانوں کی صنف میں لا کھڑا کیا...... وزیر آغا نے ایک مقالہ ''اردو کے چند انوکھے افسانے'' لکھا تو اس کا ذکر اور تجزیہ بالخصوص کیا۔ اب اس موضوع پر ''تیلی جان'' رحمان مذنب کا نادر اور لاجواب افسانہ شمار ہوتا ہے۔''

رحمان مذنب کی شخصیت کا ایک پہلو ''حقیقی سچائی'' ہے جو فرسودہ سچائی سے بالاتر ہے جس کا اظہار ان کی گھریلو زندگی اور معاشرتی زندگی میں ہوتا ہے اور یہ عکس ان کی تحریروں میں جا بجا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے کیے پر نہ احساسِ ندامت محسوس کرتے ہیں اور نہ ہی پشیمان ہوتے ہیں۔ وہ سچائی کے اس قدر معترف ہیں کہ یہ سچ کبھی ہمدرد سچ، کبھی کڑوا سچ، کبھی برہنہ سچ، کبھی مخفی سچ اور کبھی خود غرض سچ بن کر ان کی تحریروں اور تقریروں میں جھلکتا ہے اور رحمان مذنب ہر جگہ صدقۂ جاریہ سمجھ کر اس کی ترغیب دوسروں کو دیتے نظر آتے ہیں۔ رحمان مذنب کے نزدیک ''کامیاب انسان اور بہترین انسان'' میں فرق ہے۔ کامیاب انسان اپنی بنیاد ''مادیت'' پر استوار کرتا ہے اور بہترین انسان اپنی اساس ''اعلیٰ کردار کی تشکیل'' سے بنتا ہے۔ رحمان مذنب بہترین

انسان کو پسند کرتے ہیں۔ وہ قرآن اور حدیث کے مطابق زندگی بسر کرنے کو انسانیت کی معراج سمجھتے ہیں کہ......

اب چند وہ سوالات پیشِ خدمت ہیں جو میں نے رحمان مذنب سے کئے:

س: رحمان صاحب کیا آپ اہلِ زبان ہیں؟

ج: نہیں! ہمارے گھر میں اردو بولی جاتی تھی۔ ہمارے بزرگ دہلی یا لکھنؤ کے نہیں بلکہ راجپوتانے کے تھے تاہم ہمارے یہاں تلفظ اور ادائیگی Pronounciation کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی اس لئے میرے لہجے کی بناوٹ، آواز میں تراش خراش نستعلیق انداز کی ہے۔

س: آپ نے جس بھی صنف پر کام کیا اسے انتہائی سیریس لیا تو کیا آپ بیک وقت اتنی محنت اور ریاضت کر لیتے تھے کہ ہر میدان کے شاہسوار بن سکیں؟

ج: میرے والد نے نصیحت کی تھی کہ بیٹا جو کچھ پڑھو اس کی جگالی کرتے رہو۔ اپنے علم کو دوسروں تک پہنچاؤ۔ علم کے حصول کے لئے خود کفالتی کا درجہ حاصل کر لو۔ ہر وقت خود کو طالبِ علم سمجھو، قناعت مت کرو۔ مہد سے لحد تک علم حاصل کرو۔ اس نصیحت پر میں نے عمل کیا۔ کام، کام اور صرف کام کیا۔ ادب سے میری Commitment مہد سے لحد تک ہے۔ میں کام کو محض کام نہیں سمجھتا بلکہ چیلنج سمجھتا ہوں۔ اس لئے اللہ کے فضل سے کامیاب ہوں۔

س: آپ نے کیوں سوچا کہ طوائف کو اپنے افسانوں کا موضوع اپنانا چاہیے؟

ج: میں ہمیشہ نپے تلے قدموں سے چلتا ہوں، میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہوا۔ یہ ماحول ایسا تھا جس نے مجھے دولخت کر دیا۔ مجھے تضاد کے ایسے مہیب سنگم سے پالا پڑا کہ میرے کم و بیش ستر سال خود کو دولخت ہونے سے بچانے میں گزر گئے۔ میرے افسانوں میں وہی کردار ہیں جو میری زندگی میں شریک تھے اور میں جن کی زندگی میں شریک تھا۔ یہ میری آپ بیتی بھی ہے اور دوسروں کی داستانِ حیات بھی، انسان جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، ذہن میں وہی تصویر بناتا ہے۔

میرے ماحول میں طوائف موجود تھی اس لئے اس کا میرے افسانوں کا موضوع بننا قطعی اچھنبے کی بات نہیں ہے۔

س: کیا آپ کو بچپن سے اندازہ تھا کہ آپ بڑے ہو کر رائٹر بنیں گے؟

ج: ہاں! مجھے بہت اچھی طرح علم تھا کہ میں بڑا ہو کر رائٹر بنوں گا اس کی ایک وجہ شائد یہ تھی کہ ٹکسالی دروازہ کے قریب ایک میاں گھسیٹا رہتے تھے جو لاہوری شان رکھتے تھے۔ ہر ایک سے تعارف حاصل کرتے تھے۔ میں سات سال کا تھا جب ایک دن مجھے نکیائیوں کی گلی سے برآمد ہوتا ہوا دیکھ کر پوچھنے لگے......

''کاکا! توں گلی وچ رہنا ایں؟''

''نہیں میاں جی''

''فیر گلی وِلوں کیوں آونا ایں؟''

''رستہ چھوٹا ہے''

''ٹھیک اے! توں وی تے حالی چھوٹا ایں''

''سکولے جانداں ایں؟''

''ہاں میاں جی''

''کدا پتر ایں؟''

''مفتی صاحب دا''

''اوئے مفتی عبدالستار دا؟''

''ہلا ہلا چنگے رستے پیا ایں وڈا ہو کے چنگی کھنتی کریں گا''

یہ وہ فقرات تھے جو مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے اور یہی فقرات میری شخصیت کو دولخت کرنے اور جوڑنے میں مسمریزم کا کام کرتے رہے۔

یہ عجب منطقی حقیقت ہے کہ رحمان مذنب کے اندر کے بالا خانہ میں جا کر بھی کوئی مفتی چھپا رہا جس نے اس کو بھٹکنے نہیں دیا۔ کالیداس ''شکنتلا'' میں لکھتا ہے ''دیکھو، کنول کا پھول کیچڑ میں رہ کر بھی کنول کا پھول ہی رہتا ہے۔ خوبصورت و سپید۔''

رحمان مذنب بھی کنول کے پھول کی مانند اجلے اور سپید رہے۔

س: کیا طوائفوں کو علم تھا کہ آپ ان پر لکھتے ہیں؟

ج: میں نے جسم و جان کو آگ میں جھلسا کر ان کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے ماحول کو سمجھا ہے۔ میں ان کے ہاٹ پر اپنا قلم سجانے اور قلمکاری کے لئے مواد اکٹھا کرنے کی نیت سے نہیں گیا، میں تو نمک کی کان میں گیا اور نمک ہو گیا۔ مطالعہ اور تجربہ از خود ہوا اور یہ مشاہدہ اور تجربہ بعد میں میرا قیمتی اثاثہ بن گیا جو میرے افسانوں اور ڈراموں کا خام مال ہے، جسے میں نے بے باکی سے اپنے افسانوں میں کھپایا۔ بے باکی شرط اوّل تھی، اس کے بغیر وہ حقیقت بیان ہی نہ ہو سکتی تھی جو مجھے جہنم کے بیچوں بیچ لے گئی اور مجھے یہ کام کرنا پڑا بلکہ یہ میرا مقدر تھا کہ......

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

میرے اندر کا رحمان مذنب مجھے مہمیز دیتا اور اور سرگرم عمل رکھتا ہے۔

آلام روزگار کو آسان کر دیا !

جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

میرے خیال میں اگر Mental Reservation ہو تو حقیقت بیان نہیں کی جا سکتی اور اچھا افسانہ نہیں بن سکتا۔ افسانہ نگار Desprate نہ ہو تو پوری سچائی اور پوری حقیقت کیسے عیاں ہو گی اور میرا خیال ہے کہ ادب کے گوتم بدھ کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے، یہ عمر بھر کا قضیہ ہے۔ تخلیقی جوہر امر ہے یہ اوپر والے کی دین ہے ...... فنکار کو لکھنے پر مائل بلکہ مامور اور مجبور کرتی ہے لیکن شوق اظہار کے ساتھ لکھنے کا سلیقہ درکار ہوتا ہے، اس لئے بندہ پڑھتا ہے، لفظوں اور خیالوں کا ذخیرہ جمع کرتا ہے، جس علاقے میں رہتا ہے، جہاں زندگی گزارتا ہے، وہاں سے خام مال اکٹھا کرتا ہے، پھر بھلا اس کے اظہار میں بددیانتی کیوں کرے؟

س: آپ کتنے وقت میں ایک افسانہ، مضمون یا ڈرامہ لکھ لیتے ہیں؟

ج: میرے خیال میں ایک افسانہ ایک مہینے میں بھی ہو جائے تو کافی ہے۔ تخلیقی عمل کی عجب

کیفیت ہوتی ہے بوقتِ تخلیق یوں لگتا ہے جیسے آدمی لو میں تپ جھلس رہا ہو۔ جب بندہ کام سے فارغ ہو جاتا ہے تو ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے چلتے ہیں۔ تخلیقی کام ہر دوسرے کام سے دور کر دیتا ہے۔ یہ ایسا کمبل ہے جو چمٹ جائے تو پھر چمٹا ہی رہتا ہے۔ یہ سخت کھردرا بلکہ خاردار بھی ہے اور ملائم بھی، جب قلمکار کچھ لکھتا ہے تو سولی پر چڑھتا ہے۔ جب لکھ چکتا ہے تو تسکین پاتا ہے۔ ادیب ملک وقوم کے امین ہوتے ہیں اس لئے انہیں سوچ سمجھ کر قلم استعمال کرنا چاہیئے۔ آج کل پروفیشنلو نے قلموں اور ذہنوں کو خرید لیا ہے۔

رحمان مذنب تجربے اور تجرباتی دانش کے ذخیرہ اندوز ہیں۔ جو بھی انہیں ملتا ہے وہ معلومات کی نئی دنیا لے کر جاتا ہے لیکن اس فہم وفراست کی دنیا کا پرچار کرنے میں تنگ ظرفی کا مظاہرہ کرتا ہے، کوئی ان کے حق میں نعرہ تحسین **Plaudit** بلند نہیں کرتا اور نہ ہی انہیں خراجِ تحسین **Tribute** دیتا ہے۔ اس بات کا شکوہ انہوں نے اپنے انٹرویو میں بھی کیا ہے اور اپنے افسانوی مجموعے میں بھی......

> ''شکوہ ہے تو اس بات کا کہ وہ جو قد آور نقاد بنے پھرتے ہیں جنہوں نے بڑی بڑی اینٹ البحریں چھپوائیں ان کی آنکھوں میں روشنی ہی نہ رہی کہ میرے افسانوں کو پڑھ ہی لیتے۔ وہ عصبیتوں کی عینکیں چڑھائے پھرتے رہے۔ قلم چلتے رہے اور ساون کے اندھے قطار در قطار میرے سامنے سے گزرتے رہے۔''

لیکن میرا مذنب کے بارے میں خیال ہے ''از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد''

س: آپ کے بارے میں ایک عام رائے ہے کہ آپ نے اپنے افسانوں میں صرف طوائف ہی کو جگہ دی ہے۔ اس میں کہاں تک سچائی پائی جاتی ہے؟

ج: نہیں یہ بات نہیں ہے ''پھول سائیں'' ایسا افسانہ تھا جس نے مجھے ادبی حلقوں میں متعارف کروایا۔ ''پتلی جان'' افسانے سے میری پہچان بن گئی۔ اس کے علاوہ میں نے زرینہ اور ہاشم، کیسری لاچا، کرنل سمتھ خان، بدر بہادر ڈکیٹ، پھرکی، درندوں کی

رانی، صحرا کا انتقام اور ایسی بہت سی کہانیاں لکھیں جن میں طوائف کا گزر نہیں ہے لیکن بدقسمتی سے صرف طوائف کے افسانوں کی وجہ سے مشہور ہو کہ ــــــ

جگر! میں نے چھپایا لاکھ اپنا درد و غم لیکن
بیان کردیں میری صورت نے سب کیفیتیں دل کی

میں نے فوراً ٹکڑا لگایا نہیں رحمان صاحب یوں کہیے ......

میرا تو کمال فن یہی ہے بس اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانے پر چھا گیا

س: رحمان صاحب اس وقت کے **Brothel home** اور اب کے **Brothel home** میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں ہیں۔ آپ ان میں کیا چیز مشترک سمجھتے ہیں؟

ج: جی ہاں، اس وقت کے حالات میں اور اب کے حالات میں بہت فرق ہے۔ اسی سال کا فرق ہے۔ پہلا دور اچھا تھا۔ پہلے دس کا نوٹ بہت بڑا تھا۔ اب تو ہزار کا نوٹ بھی چھوٹا ہو گیا ہے۔ پہلے آواز زیادہ بکتی تھی، اب تو ہزاروں میں رات بک جاتی ہے اور آواز کا کوئی خریدار نہیں ہوتا۔ ایک چیز مشترک ہے، جنسی ہاٹ کی اپنی رسومات ہیں اپنے آداب ہیں۔ یہاں کی الف لیلیٰ ہزار زاویے، ہزار پہلو، ہزار پیچ و خم رکھتی ہے۔ یہاں کی دانش، حکمتِ عملی، دفاع اور جارحیت کی تکنیک یہیں کی پیداوار ہے، یہاں ققنس اپنی ہی آگ میں جلتا ہے اور اپنی ہی راکھ میں پیدا ہوتا ہے۔

یہ ایسی سوسائٹی ہے، جس کی جڑیں شاہی قلعہ سے بھی زیادہ مضبوط ہیں۔ یہ سوسائٹی گناہ کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ گناہ کی کوکھ سے رزق حاصل کرتی ہیں اور گناہ کی کوکھ میں دم توڑ دیتی ہے کسی کو ان سے کوئی غرض نہیں ہوتی ماسوائے جنسی اشتہاء کے۔ یہ بات تب بھی تھی اور اب بھی ہے۔

س: رحمان صاحب ''اس بازار'' سے ہٹ کر آپ نے دیو مالا اور یونانی تھیٹر اور ڈرامہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اس طرف آپ کا ذہن کیسے آیا؟

ج: ڈرامہ میرے ماحول کی خوراک تھی، چنانچہ اس کی حقیقت اور ماہیت کو جاننے کے لئے

مجھے انگریزی اور یونانی تاریخ کو جاننا پڑا۔اس وقت کی دریافت کے ساتھ ساتھ مجھے دیو مالا، اولمپک کھیل، جادو وطلسم کے بارے میں معلومات بھی ملیں آپ کو علم ہے کہ اپنے زمانے (پانچویں صدی ق۔م) میں اہلِ یونان دنیا میں سب سے زیادہ دانشور قوم تھی خصوصاً علم وفن کا تو یہ مرکز تھا۔ جہاں تک میرے ذہن کا اس فیلڈ میں آنے کا تعلق ہے تو 1950ء میں ڈاکٹر تاثیر مرحوم، شہزاد احمد، غلام محمد اور میں ''تسکین ہوٹل'' میں بیٹھتے تھے۔ میری عادت تھی میں جو کچھ پڑھتا تھا اپنے دوستوں میں اس پر تبصرہ ضرور کرتا تھا۔ اس گروپ میں سب سے زیادہ میں بولتا تھا۔ ایک دن باتوں کے دوران ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے ''بوطیقا'' کا ذکر چھیڑ دیا۔ جس کے بارے میں میری معلومات صفر تھیں چنانچہ اگلے دن ارسطو کی لاثانی کتاب Poetics خریدی۔ اسے پڑھا تو محسوس ہوا کہ اسے سمجھنے کے لئے یونانی ڈرامہ پڑھنا ضروری ہے۔ سوفوکلیز، یوری پیدیز، ایسکی لس اور ارسطوف آتیز کے ڈرامے خریدے۔ انہیں پڑھا تو پتہ چلا کہ یونانی تھیٹر، یونانی (دیو مالا) کلچر اور تاریخ پڑھے بغیر یہ بھی پوری طرح سمجھ میں نہیں آتے۔ چنانچہ کسی حد تک یونانیات کا مطالعہ جاری رہا۔ وہاں سے مصریات کا دروازہ کھلا کیونکہ مصر ہی یونان کا استاد تھا۔ آج تک میں یونانیات، مصریات اور عتیقات کے طلسم سے نہیں چھوٹا۔

س: آپ کی کوئی ایسی ریسرچ جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہو اور آپ کو شدت سے اس کی پبلشنگ کا انتظار ہو؟

ج: ہاں میری بہت سی ایسی کتابیں جو میں نے بڑی محنت سے لکھیں لیکن مناسب پبلشر نہ ملنے کی وجہ سے ابھی تک اشاعت کی منتظر ہیں۔ مثلاً ''ڈرامے اور تھیٹر کا دورِ اوّل'' مزید افسانوی مجموعے اور ''دینِ ساحری'' ناول وغیرہ۔ میری مترجمہ کتاب ''مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے'' 1971ء کی ادبی انعام یافتہ ہے۔ اس کا اصل مسودہ پبلشر سے گم ہو گیا۔ پھر نیا مسودہ لکھ کر دیا اور ''تہذیب وتمدن اور اسلام'' کے نام سے دوبارہ کتاب مارکیٹ میں آئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کتاب دیدہ زیب ہو، میری مرضی

کے مطابق چھپے۔ میں تو سرورق بھی اپنی پسند کا چاہتا ہوں۔

س: آپ ایک طرف اسلامی زندگی کو اپنانے کی تلقین کرتے ہیں اور دوسری طرف بشریات، جنس کی تحقیق میں بہت دور نکل جاتے ہیں۔ یہ تضاد آپ کے ذہن کی پیداوار ہے یا ماحول کی؟

ج: میں سحریات کا عامل نہیں۔ عامل ملا بھی نہیں، مجھے علم کے مطالعہ کا شوق ہے۔ کسی بھی موضوع کے مطالعہ کے بعد میرے ذہن میں جو سوال ابھرتے ہیں حل کرنے کی کوشش کرتا ہوں مثلاً ماضی میں ڈارون کے نظریہ ارتقاء کا چرچا ہوا تو میں نے ارتقاء کو سمجھنے کیلئے طامس ہکسلے کے مضامین پڑھنے شروع کئے اور اس کے علاوہ جو کچھ اس موضوع پر ہاتھ لگا، پڑھا۔ صوفی ازم کو سمجھنے کا سوال پیدا ہوا تو کتابیں اور رسالے کھنگالے۔ اس طرح جنسیات ماحولیات، بشریات، یونانیات اور مصریات وغیرہ کے بارے میں پڑھتا رہا اور پڑھتا رہتا ہوں اور اسے ذہن میں ہی محفوظ رکھتا ہوں۔ اگر کوئی سوال آپ کے ذہن میں بے چینی پیدا کرتا ہے تو آپ اس کا جواب طلب کرتے ہیں۔ اس طرح اپنے اوپر علم کا دروازہ کھولتے ہیں۔ یوں سلسلہ چلتا ہے اور علم لاتعداد اصناف اور موضوعات پر محیط ہوتا ہے۔ میں اپنی بساط کے مطابق علم حاصل کرتا رہتا ہوں۔ صنف اور موضوع کی بندش نہیں۔ میں ایک عظیم القدر طالب علم ہوں جس کی علمی طلب تاحیات قائم رہے گی۔ علم کی طلب تشنۂ تکمیل رہتی ہے۔

س: آپ اپنی مضامین نگاری سے کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج: میں جس کتاب کا مطالعہ کرتا ہوں، جس موضوع پر قلم اٹھاتا ہوں اس کے بارے میں نہایت سوچ بچار کرتا ہوں، میں نے جو کچھ پڑھا وقتاً فوقتاً اسے اپنی قلم کی زینت بنایا۔ مضامین کے معیار کی جہاں تک بات ہے تو وہ صحیح ہے، معیار تو وقت کے ساتھ ساتھ، ریاضت کے بعد پختہ اور قابلِ رشک ہوتا ہے کہ جو موضوع میں نے پڑھا، جانا، اسے اپنے قلم میں سمو دیا۔ بہت سے مضامین ایسے ہیں جو تحقیق کا ثمر ہیں۔ کچھ تو میں نے شائع کروالئے اور کچھ ہنوز قابلِ اشاعت ہیں جیسے "سیرت النبیؐ" وغیرہ۔ میں نے

جس دور میں جو بھی مضمون لکھا اس کے معیار سے مطمئن ہوں۔ اب میری خواہش ہے کہ میں تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھوں۔ اس میں ایک رکاوٹ خصوصاً نایاب کتابوں کے حصول کی ہے۔ یہ کتابیں بہت دور دراز ملکوں کی لائبریریوں میں موجود ہیں اور خاصی مہنگی ہیں، میں آسانی سے انہیں خرید نہیں سکتا تاہم جہاں تک بن پڑتا ہے انہیں خریدتا ہوں، پڑھتا ہوں اور پڑھتا رہوں گا۔ انشاءاللہ مستقبل قریب میں بہت انوکھے اور وقیع مضامین لکھوں گا۔

میری دعا ہے کہ رحمان مذنب کو خدا تعالیٰ ہمت اور حوصلہ نیز درازی عمر عطا فرمائے اور وہ اپنے علم سے اردو ادب کے سرمائے میں اضافہ کرتے رہیں۔

ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں
تم رہو زندہ جاوداں! آمین

O

رحمان مُذنب سے ملاقات

انور سدید

انور سدید: رحمان مذنب صاحب! آپ کو ابتداء ہی سے افسانے میں شہرت مل گئی۔ اگر چہ آپ نے اساطیر پر بھی بہت کام کیا ہے لیکن افسانے میں آپ کا کام اور نام زیادہ ہے۔ کیا آپ ہمیں یہ بات بتائیں گے کہ آپ افسانہ نگاری کی طرف کس طرح آئے؟

رحمان مذنب: انور سدید صاحب! آپ نے درست کہا کہ مجھے اردو افسانے کے حوالے سے زیادہ شہرت ملی اور میں نے کام بھی کیا لیکن میرے نزدیک ڈرامے اور سوشل اینتھر وپالوجی بالخصوص مائیتھولوجی میں بھی میرا کام قابلِ توجہ ہے لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ اس موضوع کے زیادہ قاری پیدا نہیں ہوئے۔ مغرب کی ہر زبان میں سوشل اینتھر وپالوجی پر سینکڑوں کتابیں ہیں لیکن ہمارے چند مہربان اس اہم موضوع سے خود نابلد رہنا اور قارئین کو نابلد رکھنا چاہتے ہیں۔ افسانے سے پہلے میں نے ڈرامے لکھے۔ ان کی پذیرائی جس طور ہوئی اس سے مجھ میں بڑا اعتماد پیدا ہوا۔ میں نے ڈرامے بھی لکھے۔ اب بھی لکھتا ہوں۔ ڈرامانویسی کے ساتھ ساتھ ڈرامے اور تھیئٹر کا (عالمی سطح پر) بکثرت مطالعہ کیا۔ ڈرامے اور تھیئٹر کی تاریخ کے باب میں تحقیقی کام بھی کیا۔

مجھے گھر سے ذوقِ مطالعہ اور شوقِ تحقیق ملا تھا۔ باہر سے افسانے اور ڈرامے کا سامان۔ قلمی زندگی کا آغاز فلمی صحافت سے کیا۔ 1932ء اور 1933 میں نذیر لدھیانوی کے پرچے مصور ویکلی (ممبئی) میں مسلسل لکھتا رہا۔ پارس ویکلی میں بھی ایک دو مضمون لکھے۔ گھر سے باہر جنتِ ابلیس بڑی دلکشی اور شانِ دلربائی سے آباد تھی۔ یہ میری گزرگاہ بھی تھی، سیرگاہ بھی اور ایک زمانے میں قیام گاہ بھی۔ چاروں طرف سے شرفاء کی بستیوں، گیارہ مسجدوں، ایک دینی درسگاہ اور تین چار مزاروں میں گھرا ہوا یہ علاقہ روشنیوں کی اندھیر نگری تھا۔ آندھی اور طوفان اٹھتے اور

یہاں آ کر دم توڑ دیتے یا سرنگوں ہو جاتے۔ گھر سے چار قدم پر رئیسِ اعظم میاں عبدالحمید کی بہت بڑی کنڑی اور ان کا عزیز تھیٹر جہاں سارا سال ناٹک کھیلے جاتے۔ اگلے چار قدم پر گیٹی تھیٹر تھا جہاں خاموش انگریزی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ پھر جب اردو متکلم فلموں کا دور آیا تو یہ نام بدل کر ٹاکیز (سینما) بن گیا...... اسی کے ساتھ عزیز تھیٹر، پاکستان ٹاکیز بن گیا۔ جنتِ ابلیس اور شرفاء کے علاقے کو مطالعے، مشاہدے، تجربے اور تفریح کے اعتبار سے میرے لئے بڑی اہمیت حاصل رہی۔ یہی تربیت گاہ تھی، یہی درس گاہ تھی۔ پون صدی یہیں گزری...... گھر بڑا مقدس تھا۔ یہاں ہر وقت علم کے چراغ جلتے۔ میرے نانا شمس العلماء پروفیسر مفتی محمد عبداللہ ٹونکی، پروفیسر سید طلحہ (اورینٹل کالج) اور بعض دوسری ہستیاں یہاں آتی جاتی رہتیں۔ بہنوئی پروفیسر سید منظور علی (ڈیلی کالج، اندور) موسم گرما کی تعطیلات بھی یہاں گزارتے۔ والد مفتی محمد عبدالستار کی موجودگی میں علم وعرفان کی باتیں ہوتیں۔ عربی اور فارسی کی بڑی بڑی وزنی کتابیں حوالوں کی غرض سے کھولی موندی جاتیں۔ اک سیل دلائل اور دریائے حیرت ولطافت رواں ہوتا۔ میرا بچپن غوطے مارتے گزرا۔ بہرحال ان علمی صحبتوں کی بدولت میں جلد سن بلوغ کو پہنچا۔

جنتِ ابلیس اور ملحقہ علاقے زندگی کے استعجاب انگیز افسانوں اور ڈراموں سے لبریز تھے۔ ان کے کرداروں میں میں شامل رہا۔ ہم سب پر جو گزری میرے قلب ونظر اور حافظے پر اپنے نقوش چھوڑ جاتی۔ یہ زندگی فرطِ انبساط اور فرطِ الم سے معمور رہی۔ دکھ اور سکھ کی کیفیات پوری شدت سے مجھ پر طاری رہیں۔ **1934**ء میں میرا ناٹک ''جہاں آرا'' عزیز تھیٹر کی اسٹیج پر کھیلا گیا۔ پہلا ڈراما ''سپاہی'' اگست **1937**ء میں ماہنامہ ہمایوں میں شریک اشاعت ہوا۔ پہلا افسانہ **1940**ء کے لگ بھگ لکھا۔ تب میں لاہور سے دور بہنوئی پروفیسر سید منظور علی کے گاؤں حاجی پور میں مقیم تھا۔ وہاں کے روز وشب، طرزِ بود وباش اور معاشرت سے متعلق پہلی بار ایک ساتھ دو افسانے لکھے۔ ایک کا نام ''پیال'' (پرالی) اور دوسرے کا نام ''ڈرائیور'' تھا۔ کچھ مدت کے بعد حاجی پور سے بھوپال آیا تو افسانے ساتھ لایا۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ مدیر جامعہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی بھوپال آئے ہوئے ہیں، محمد احمد سبزواری کے یہاں قیام ہے۔ سبزواری نہایت خلیق، خوش مزاج اور نامور قلمکار تھے۔ ان کی محفل میں ہر سہ پہر محفلِ تثلیث جمتی۔ میں ''جامعہ'' میں چھپتا تھا۔

یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر ہاشمی کی تحریک پر میں نے مکتبہ جامعہ کے لئے اپنی پہلی کتاب ''بیورج پلان'' لکھی۔ دونوں افسانے ڈاکٹر ہاشمی کو دیئے تاکہ وہ پڑھ کر بتائیں کہ میں افسانہ نگاری میں کیسا رہوں گا۔ انہوں نے افسانے پڑھے، حوصلہ افزائی کی اور میں افسانے لکھنے لگا۔ اسی اثناء میں منشی پریم چند کا افسانہ 'کفن' جامعہ یا کسی دوسرے پرچے میں چھپا۔ اس افسانے نے میری آنکھیں کھول دیں۔ دل پر نقش ہو گیا۔ قبل ازیں میں پنجاب پبلک لائبریری کے ریڈنگ روم میں بیٹھ کر پریم پچیسی اور پریم چالیسی پڑھ چکا تھا۔ اس دور میں پچیسی اور چالیسی کا چلن تھا۔ میں نے سدرشن پچیسی اور سدرشن چالیسی کا بھی مطالعہ کیا۔ پریم چند کے افسانے مجھے پسند تھے۔ اپنے دوست فضل کباڑیئے کے یہاں جا کر ایسے رسالے نکالتا جن میں پریم چند کے افسانے چھپتے۔ پریم چند کی شخصیت پر ایک ڈراما 'کنگال' بھی لکھا۔ یہ ماہنامہ 'ہمایوں' کے سالگرہ نمبر **1941**ء میں شریکِ اشاعت ہوا۔

''کفن'' کے پائے کا افسانہ مجھے پریم چند کے اس تخلیقی انبار میں کہیں نہ ملا جس کا میں نے مطالعہ کیا تھا اور کسی افسانہ نگار کے یہاں بھی اتنا مکمل، بھرپور اور چار کھونٹ مضبوط افسانہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ 'کفن' میں کہانی کی بنت اور کردار نگاری معراج پر تھی، یہ فنی مہارت نامہ کا بین ثبوت تھا۔ منشی پریم چند کے فن کی انتہا تھی۔ کسی افسانہ نگار کا یہاں تک پہنچنا معجزے سے کم نہیں۔

'کفن' پڑھ کر مجھ میں ہلچل سی مچ گئی۔ بہ شدت تحریک ہوئی کہ میں اس انتہاء تک پہنچوں اور افسانے لکھوں تو اس پائے کے ہوں۔ منزل کڑی تھی لیکن اسے سر کرنے کا جنوں بھی کم نہ تھا۔ مطالعہ جاری رہا۔ ریاضت جنگی بنیاد پر کرتا رہا۔ ریڈیو اور رسائل میں جگہ بناتا رہا۔ **1984**ء یا **1949**ء میں ایک افسانہ ''پھول سائیں'' لکھا جو ''ماہِ نو'' مارچ **1949**ء میں شریکِ اشاعت ہوا۔ تب رفیق خاور پرچے کے مدیر تھے۔ ان کے خط ملتے رہے۔ وہ مسلسل حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ حسن طلب کا جادو مجھ پر کام کرتا رہا۔ اس سے اعتمادِ ذات میں اضافہ ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر وزیر آغا، مرزا ادیب، حامد علی خاں، نظیر لدھیانوی، حکیم یوسف حسن، شبلی بی کام (بعد ازاں ایم کام) امجد الطاف، سبط حسن، شاہد دہلوی، قیوم نظر، سبھی کو اپنا محسن سمجھتا ہوں۔ ان کے تعریفی کلمات نے بڑا کام کیا۔

لکھتا رہا، چھپتا رہا، 'کفن' کے خواب دیکھتا رہا۔ 'نئی تحریریں' کے پہلے شمارے (ستمبر

1954ء) میں میرا افسانہ ''تپلی جان'' چھپا۔ اس نے میرے لئے مشکل کھڑی کردی۔ ایسا معیار قائم کردیا جسے برقرار رکھنے کے لئے مجھے مسلسل ریاضت کرنی پڑی۔ ریاضب میری دیرینہ عادت تھی۔ اس سے کبھی کنی نہیں کترائی۔

انور سدید صاحب! میں اس ریاضت اور جانفشانی کی تفصیل کیا بیان کروں۔

''تپلی جان'' سے ''بالا خانہ'' تک کا سفر **Killing Job** تھا۔ حیات بخش بھی تھا۔

آپ کے سوال کا آخری حصہ بہت اہم ہے۔ اکتساب اور تخلیق کا فرق عیاں ہے۔ اکتساب اور تخلیق میں ربط ہے۔ اکتسابی معلومات تخلیق کے عمل کا حصہ بن جائیں تو فرق جاتا رہتا ہے۔ یہ امر لابدی ہے کہ فن کے آداب اور ضابطے قائم رہیں، جو کچھ ہوا انہی کے مطابق ہوا۔ کتابیں پڑھ لینے اور زندگی کا تجربہ بٹور لینے سے بندہ سیانا تو ہو جاتا ہے لیکن فنکار تبھی بنتا ہے جب اس پر اللہ کی عنایت ہو اور اسے تخلیقی صلاحیت نصیب ہو۔ اصل مہیج و محرک تخلیقی جوہر ہے۔

جب افسانہ یا ڈراما لکھتا ہوں تو بیک وقت لفظ، کہانی، ماحول، کردار، خیال سبھی کا نزول ہوتا ہے۔ لفظ تو ڈکشنری میں موجود ہوتے ہیں۔ سوئے ہوتے ہیں، ان کے معانی بھی مخفی نہیں رہتے۔ جب تخلیقی عمل شروع ہوتا ہے تو لفظ عالم خوابیدگی سے نکلتے، کہانی کی ضرورت اور موزونیت کے مطابق نگینے کی طرح جڑتے جاتے ہیں۔ لفظ بھی تخلیق ہوتا ہے۔ لفظ میں نئی شان پیدا ہوتی ہے۔ ایک لفظ دوسرے لفظ سے مل کر مفہوم و معانی کی نئی دنیا بناتا ہے۔ لفظوں کے موزوں اور صحیح ملاپ سے صوتی آہنگ اور نغمگی بروئے کار آتی ہے۔ پہلے خود افسانہ بنتا ہوں، پھر افسانہ تخلیق ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو دریا کی طغیانی ایسی منہ زور ہوتی ہے کہ قلم ساتھ نہیں دیتا۔ ایک بار لکھ لیتا ہوں۔ اس رف مسودے کو دوبارہ صاف کرتا ہوں۔ یہ میری پرانی عادت ہے۔ جب تک افسانہ، ڈراما یا مقالہ پوسٹ بکس کی نذر نہ ہو تب تک اس کی نوک پلک سنوارتا رہتا ہوں۔ یہ نظر ثانی بھی تخلیقی عمل ہی ہے۔ نیا، بہتر اور موزوں تر جملہ نازل ہوتا ہے، تبھی پرانے جملے کی جگہ لیتا ہے۔ نظر ثانی کے دوران میں قلمکار پھر اسی طرح **Re-live** کرتا ہے جس طرح بوقتِ تخلیق **Re-live** کرتا ہے البتہ اس مرتبہ کام سہل ہوتا ہے اور ٹینشن یا دباؤ نہیں پڑتا۔

انور سدید: آپ نے بالعموم افسانے میں طوائف کو کم اور طوائفوں کے معاشرے کو زیادہ اہمیت

دی ہے۔ اس موضوع کے گرد ہی افسانے لکھے چنانچہ بعض لوگوں نے آپ کو ایک موضوعی افسانہ نگار قرار دیا۔ آپ کے نزدیک اس موضوع کی اہمیت کیا ہے اور آپ اس موضوع کی طرف کس طرح آئے؟

رحمان مذنب: میں نے بالجبر کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ افسانہ نازل ہونے سے پہلے نہ جانے کب سے شعور اور لاشعور کی تہوں میں کروٹیں لے رہا اور کلبلا رہا ہوتا ہے۔ پھر جب تولیدگی کی گھڑی آتی ہے تو سوچ، تجربے، مشاہدے اور جذبات واحساسات کا طوفان لئے تخلیقی سرچشمے سے پھوٹ پڑتا اور نوک قلم پر آجاتا ہے۔ میں نے جس ڈرامائی ماحول میں پرورش پائی، اس میں ڈوب گیا۔ اسی ماحول نے ذہنی تخلیقی کارگاہ میں راہ پائی۔ میں نے ہوا اور خلاء میں زندگی بسر نہیں کی۔ مجھے شرفاء اور غیر شرفاء دونوں ہی سے سروکار رہا۔ میرے پہلے دو افسانے ...... پیال اور ڈرائیور حاجی پور کی دو عورتوں کے بارے میں تھے۔ یہ طوائفیں نہیں تھیں۔ میرے قیام کے ایام میں وہیں ایک بیڑنی اور اس کی لڑکی بھی رہتی تھیں۔ ان پر میں افسانہ نہیں بنا پایا۔ پھول سائیں، کرنل سمتھ خاں، قیصراں، کیسری لاچا، خوشبو کا دھواں، خوشبودار عورتیں، تو گالہ، رام پیاری، زرینہ اور ہاشم، پھرکی، پنجرے کے پنچھی، بدر بہادر ڈکیت اور بیسیوں دوسرے افسانے طوائف سے سروکار نہیں رکھتے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ میں نے جس طور پر افسانوں میں پیش کیا، وہ قابل توجہ موضوع بن گیا۔ شائد کسی اور افسانہ نگار نے طوائف کو فن کے حوالے سے میرے طرح قابل اعتناء نہیں سمجھا۔ میں ایسی طرح دار، پہلودار، گرگٹ کی طرح جلد جلد رنگ بدلنے والی بھرپور عورت کو کیونکر نظر انداز کرتا؟ مجھ سے یہ نہ ہوسکا۔ 'کفن' کی جان گھسی پسی گھریلو عورت تھی، جو اس عورت کو جانتے پہچانتے ہیں وہ اس پر ضرور افسانے لکھیں۔ مجھے اس عورت کے بارے میں کچھ علم ضرور ہے۔ چند افسانے لکھے بھی ہیں اس کے بارے میں۔ مگر طوائف میرے نزدیک ایک پھندہ ہے، جال ہے۔ اس جال میں جتنی گرہیں اور جتنے خانے ہیں اس کی زندگی میں اتنی ہی گرہیں اور خانے ہیں۔ میں نے اسے اچھی طرح دیکھا بھالا اور دریافت کیا۔ اس نے جس قوت اور شدت سے میری زندگی پر دھاوا بولا تھا، اسی قوت اور شدت سے میرے قلم پر دھاوا بولا۔ وہ افسانہ جو میری پہچان بنا ''پتلی جان'' ہے۔ یہ تیسری جنس کا کردار ہے۔ اردو ادب میں یہ بالکل نئی چیز ہے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے ڈاکٹر

وزیر آغا ایسا نقاد میسر آیا جس نے سب سے پہلی تپلی جان کو موضوع بنایا۔ 'تپلی جان' پر ان کی تنقید سے بھارت میں ہنگامہ بھی کھڑا ہوا۔ ہمارے یہاں کے کئی چھٹ بھیے اور نام نہاد نقاد بھی بلبلا اٹھے۔

انور سدید صاحب! آپ کے سوال میں افسانے کے اجزائے ترکیبی معاشرے اور طوائف میں توازن و تناسب کے بارے میں بھی اشارہ ملتا ہے۔ میں عرض کر دوں کہ طوائف کا اپنا ایک معاشرہ ہے۔ یہ معاشرہ بھی نادر اور انوکھا ہے۔ طوائف کو معاشرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ ناخن گوشت میں پیوست رہ کر ہی اپنا کام کر سکتا ہے۔ معاشرے سے باہر رہ کر طوائف بے معنی ہو جاتی ہے۔ حالت یہ ہے کہ طوائف بازار سے علاحدہ ہو جائے تب بھی معاشرے کی لاج رہتی اور جہاں رہتی ہے وہاں اپنا معاشرہ قائم کر لیتی ہے۔

انور سدید: اچھا آپ بتائیے کہ کیا آپ نے طوائف کے علاوہ کسی اور موضوع پر بھی افسانے لکھے ہیں یعنی کوئی ایسا افسانہ جو طوائف کے معاشرے سے تعلق نہ رکھتا ہو؟

رحمان مذنب: جی ہاں۔ میں نے بے شمار ایسے افسانے لکھے ہیں جو طوائف اور اس کے معاشرے سے تعلق نہیں رکھتے۔ میرے لئے کوئی موضوع ٹبو نہیں، شرط یہ ہے کہ میری گرفت میں ہو، مجھے سوجھ جائے، جس کیلئے میری ذہنی کارگاہ میں سامانِ تخلیق موجود ہو، جو میرے احساسات و جذبات کو بیدار کرے۔ پھول سائیں کی ہیروئن امیر گھرانے کی خاتون ہے۔ قیصراں گندی گلی کی رہنے والی ہے۔ پھرکی، مہترانی ہے...... رام پیاری مشرقی پاکستان کی دختر نیک اختر تھی۔ زرینہ اور ہاشم قبائلی علاقے کے دو جیالے کردار تھے۔ صحرا کا انتقام ایک شریر یہودن کا افسانہ ہے۔ تو گالہ افریقہ کی پیداوار ہے۔ کباڑیا انگلستان اور افریقہ دونوں کا عکاس ہے۔ درندوں کی رانی قدیم مصر کے فراعنہ کے گھرانے کی حکمران خاتون...... حاط شیب سوط ہے جو خود کو فرعون کہتی تھی۔ کتنے ہی افسانے طوائف کے ماحول سے سروکار نہیں رکھتے۔

انور سدید: طوائف کے موضوع پر ہمارے ہاں منٹو کے افسانوں کو بہت شہرت ملی حالانکہ غلام عباس نے بھی اس موضوع کو خوب خوب استعمال کیا ہے۔ اس موضوع پر آپ کے افسانے دوسرے لوگوں سے کس طرح مختلف ہیں۔ کیا آپ سب میں کوئی قدر مشترک بھی ہے؟

رحمان مذنب: منٹو کی انفرادیت اس کی طنز نگاری ہے۔ پھر ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''کھول دو'' کے

مقدمات نے اسے بہت ابھارا۔ طوائف کے حوالے سے اس کے اور میرے افسانوں میں جو فرق ہے اسے ''پتلی جان'' (کتاب) کے پیش لفظ میں ڈاکٹر وزیر آغا نے پوری وضاحت اور ذمہ داری سے بیان کر دیا ہے۔ آپ نے آغا صاحب کی رائے پڑھی ہے، وہی کافی ہے۔ رہا غلام عباس کا معاملہ تو وہ میرے گھر سے فرلانگ بھر دور...... میاں عبدالحمید کی کٹڑی میں رہتے تھے۔ والد مرحوم کے پاس عربی اشعار کے مطلب پوچھنے آتے تھے۔ تب غالباً وہ الحمرا کے افسانے اردو میں منتقل کر رہے تھے۔ میں تب بچہ ہی تھا۔ طوائف کو جانتے تھے۔ نرم دم گفتگو تھے۔ مرنجاں مرنج قسم کے افسانہ نگار تھے۔ 'اوور کوٹ' ان کا بڑا افسانہ ہے لیکن وہ طوائف کے بارے میں نہیں ہے۔ میرے معاملہ میں یہ شومئی تقدیر ضرور ہے کہ میں نے طوائف اور تکیائی کو دیکھا۔ ان کے معاشرے اور ماحول کو کھنگالا ہے۔ نتائج بھی بھگتے ہیں۔ طوائف ڈیروں، مجرا خانوں اور عشرت کدوں کی پیداوار ہے۔ میں اس قتالہ کی شوخیوں، شرارتوں، غمزہ ہائے غماز، ہوشیاری اور فریب کاری کے لطف آفریں اور ہلاکت خیز لمحوں سے گزرا ہوں۔ میں نے اسے اصل رنگ میں بھرپور انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ 'بالا خانہ' پڑھ لیجئے! فرق واضح ہو جائے گا۔

انور سدید: تجریدی اور علامتی افسانوں کے دور میں آپ نے اس تجربے کی طرف توجہ نہیں دی، اس کی وجہ کیا ہے؟ یعنی کیا یہ تجربہ آپ کو پسند نہیں تھا یا تجرید آپ کے افسانے کے مطالب و معانی کو محیط نہیں کر سکتی تھی؟

رحمان مذنب: جب بھی روایت سے ہٹ کر کوئی تجربہ کیا جائے تو اس کی کوئی وجہ ہونی چاہیے۔ افسانے کی روایت اتنی وسعت رکھتی ہے اور یہ اب اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ تنگ دامانی کی شکایت نہیں کی جا سکتی۔ روایتی افسانے سے بہتر واضح تر، سہل تر اور ابلاغ کے نقطۂ نظر سے موثر تر کسی نوع کا غیر روایتی افسانہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔ ہومر سے آج تک روایتی افسانے نے بڑی کامیابی سے سفر کیا ہے۔ آئندہ بھی کرتا رہے گا۔ تجریدی یا علامتی افسانے کے لئے وجہ جواز مفقود ہے۔ تجریدی یا علامتی افسانہ اردو میں تجربے کے طور پر آیا اور چلا گیا۔ اس کا کوئی **Impact** نہیں۔ اس میں الجھن اور اجنبیت ہوتی ہے کیونکہ اسے معرضِ وجود میں لانے والے بیانیہ افسانے کے حدود اربعہ، مطالب و معانی کے ابلاغ اور اثر انگیزی سے آگاہ نہیں ہوتے۔

تجریدی افسانہ نگاروں کے پاس کتابی علم تو تھا کہ علامات کتاب ہی سے لی جاتی ہیں (ہیر رانجھا اور کیدو لنگا کو بطور علامات استعمال کر سکنے سے وارث شاہ کو صرف پڑھنا بلکہ اس کے بارے میں ہمہ جہتی معلومات حاصل کرنا از بس ضروری ہے) لیکن روایت کے خلاف کوئی محکم دلیل نہیں۔ روایتی افسانے کی طویل مشق اور نہایت کامیاب روایتی افسانے لکھے بغیر بطور تجربہ تجریدی اور علامتی افسانے کی طرف نہ آنا چاہیے۔ میرے نزدیک روایتی افسانے کا کوئی بدل نہیں۔ تجرید نہایت مشکل کام ہے۔ علامتیں ایسی لی جائیں کہ فی نفسہٖ مفہوم کی جانب واضح اشارہ کریں۔ افسانہ نگار کو تشریح نہ کرنی پڑے۔ تجریدی جملے جو بظاہر غیر مربوط ہوں فی الباطن ربط و تسلسل رکھتے ہوں۔ کہانی، واقعات و سانحات کی گرہیں کھلتی جائیں۔ بات بن نہ پڑے تو سمجھئے کہ فن کار کا عجز اسے نئے تجربے کی جانب لایا ہے۔

انور سدید: بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ کے ہاں ہنر مندی زیادہ ہے اور آپ اپنے افسانے کلاسیکی انداز میں لکھنے کی کوشش کرتے ہیں، کبھی کبھی افسانہ داستان بن جاتا ہے۔ آپ کے خیال میں کیا یہ باتیں درست ہیں؟

رحمان مذنب: آپ نے ہنر مندی کا ذکر چھیڑا ہے۔ ہنر مندی تخلیق کا ایک اہم عنصر ہے۔ بات کرنے کا سلیقہ، کام کرنے کا سلیقہ، میل جول کا سلیقہ ہر ایک کو کہاں نصیب ہوتا ہے؟ ہنر مندی میں سلیقہ اور دیگر اوصاف شامل ہیں۔ جیسا ہنر مند ویسا اس کا افسانہ، ڈراما، سفر نامہ ہوگا۔ وہ تخلیق کار جس نے چلو سے پانی پیا اس نے نقالی کی، کھوپڑی یا ناریل کے ٹوٹے خول سے پیالہ بنالیا۔ آگے چل کر اس نے مٹی سے پیالہ بنالیا۔ آنے والے زمانے کے ہنر مندوں نے ساغر و مینا، صراحی، گھڑا، ماٹ، کوزہ وغیرہ بنالیا۔ کوزہ گری بہت اہم تخلیقی فن بن گیا۔ ہزاروں سال سے ہنر مندوں کی ذہانت اس میں صرف ہو رہی ہے۔ آج لاتعداد نوع کے ظروف معاشرے میں مستعمل ہیں۔ موسیقی کو لیجئے! قدرت نے ہر شخص کو گانا اور رونا سکھایا ہے، ہر ایک کو سر دیئے ہیں لیکن صرف چند لوگ ہی سریلے ہوتے اور گانے کا شوق پورا کرتے ہیں۔ راگ راگنی میں سر بندھے ہیں لیکن قدرت نے لحن عطا کیا ہو تو لحن داؤدی تک بات پہنچتی ہے۔ نغمگی قدرت کا عطیہ تو ہے لیکن ریاضت شرط ہے۔ ریاضت کا انت نہیں۔ اس سے سروں میں حسن اور چمک پیدا ہوتی ہے۔

خاں صاحب عبدالکریم خاں اور استاد بڑے غلام علی (جو سامعین کی قلت اور ناقدری کے باعث بھارت چلے گئے) ایسے سریلے گویے کتنے ہیں؟ استاد عبدالکریم خان نے 'پیا بن نا ہے آوت چین' (ٹھمری) گائی نہیں، جادو جگایا ہے۔ سننے والا مبہوت ہو جاتا ہے۔ ریاضت، لگن، ہنر مندی اور تخلیقی جوہر ہو تو ہر فن میں جادو اتر آتا ہے۔

آپ نے داستان کی بات کی ہے۔ داستان افسانے کی سگی ماں ہے لیکن ماں کا دور ختم ہوا۔ اب افسانے کا دور ہے، اس کا اپنا سٹائل ہے، اپنی ڈکشن ہے۔ وقت کا طرزِ احساس ہے۔ وقت کے تقاضے ہیں۔ معاشرے کا مزاج ہے، زمانہ بدل گیا ہے۔ داستان کی اپنی شان ہے۔ یہ ادب کے عہدِ طفولیت کی یادگار ہے۔ اس نے نئے افسانوی ادب کو جنم دیا۔ دنیا کا پہلا سفرنامہ فراعنہ کے پروہتوں نے لکھا، پہلی مہماتی کہانی ہومر نے لکھی، ماضی کے اندوختے کو نذرِ مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ ہزاروں علامات اور تلمیحات اس سے فراہم ہوں گی۔ بہرحال میں افسانہ لکھتا ہوں۔ بیانیہ افسانہ اور بس۔

انور سدید: کہا جاتا ہے کہ افسانے پر نقادوں نے مناسب توجہ نہیں دی۔ اس طرح بعض افسانہ نگاروں نے یہ خیال پیش کیا کہ انہیں تنقید کی ضرورت نہیں۔ ان دونوں باتوں میں خاصا تضاد ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

رحمان مذنب: اردو تنقید بالخصوص اردو افسانے کے حوالے سے عصبیت کا شکار رہی ہے۔ پہلے ایک گروہ آیا۔ اس نے گنگا جمنی فنکاروں کو خوب خوب اچھالا۔ مجھ ایسے افسانہ نگار، ڈرامانویس اور محقق کے افسانے، ڈرامے اور مقالے حلقہ اربابِ ذوق کی نشستوں پر بیٹھ کر سنے لیکن جھوٹ موٹ بھی کلمہ خیر زبان سے نہ نکالا۔ گنگا جمنی فنکاروں کی دوم، سوم درجے کی تحریریں پڑھ کر خوب خوب تعریفوں کے پل باندھتے، انہیں آسمان پر چڑھاتے۔ ادھر نام نہاد ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں نے اودھم مچایا۔ وہ بھی ڈفلی بجاتے رہے اور کمیونسٹ پارٹی کے ادبی ہدایت نامے پر عمل کرتے رہے۔ انہیں ادیب سے کم اور کمیونزم سے زیادہ تعلق خاطر تھا۔ ان کے نقادادبی نکتہ خیال سے نہیں، اشتراکی نقطہ نظر سے تنقید کرتے رہے۔ غیر کمیونسٹوں کو انہوں نے نظر انداز ہی نہیں کیا بلکہ چھپنے چھپانے کے معاملے میں بھی پوری قوت سے رکاوٹ ڈالی، ایڈیٹروں پر دباؤ ڈالا۔

مقصود یہ تھا کہ غیر کمیونسٹ ادیبوں ...... افسانہ نگاروں اور شاعروں کا امیج نہ بنے۔ انہوں نے افسانوں کے انتخابات چھاپے، مخالفین کے شاہپاروں کو جگہ نہ دی۔ مجھ پر تو خاص طور پر نظرِ عنایت رہی ان کی۔

میں اپنی بات کرتا ہوں۔ حلقہ اربابِ ذوق (قیوم نظر کے دور میں) سب سے زیادہ میری کنٹری بیوشن رہی، زیادہ سے زیادہ افسانے، ڈرامے اور مقالے پڑھے لیکن حلقے کے کسی نقاد نے مجھ پر مقالہ نہیں لکھا۔ الغرض اپنوں اور پرایوں کی ذاتی مصلحتیں اور پیشہ ورانہ رقابتیں نیز میری بے نیازی یا درویشی مجھے کھا گئی۔

میں نقادوں کی کرشمہ کاریوں سے بخوبی آگاہ ہوں۔ نقاد کا وجود بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ افسانہ نگار ہو یا کوئی دوسرا فنکار، وہ مانے نہ مانے، اس کے دل میں آرزو ضرور رہتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں پہچانا جائے، اس کا امیج بنے، جو بڑے بے نیاز بنتے اور بظاہر نقادوں کی احتیاج نہیں رکھتے دراصل نقادوں کی گروہ بندی اور ذاتی خصومت سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔

انور سدید: جب آپ اپنے افسانوں کو قاری کی حیثیت میں پڑھتے ہیں تو آپ پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟ کیا اس وقت آپ نقاد کا کردار ادا کرتے ہیں؟

رحمان مذنب: انور سدید صاحب! یہ سوال دل کو لگا ہے۔ میرا قاعدہ ہے کہ افسانہ لکھ کر رکھ دیتا ہوں اور کسی دوسرے کام میں لگ جاتا ہوں۔ کام چور نہیں، کام کی کیا کمی ہے؟ افسانہ، ڈراما، مقالہ اور بعض دوسری اصناف علم و ادب ابتدا ہی سے میرے دائرہ کار میں رہی ہیں۔ ایک سے فارغ ہوتے ہی دوسری صنف میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ چند دن کے بعد افسانے کے رف مسودے کی نظر ثانی کرتا ہوں۔ کہیں جھول، ناہمواری Inconsistancy یا اور کسی نوع کی خامی نظر آئے تو اسے دور کرتا ہوں۔ اندازِ بیاں کو سدھارتا سنوارتا ہوں۔ تیسری بار بھی لکھتا ہوں۔ میں پرفیکٹ افسانہ لکھنے کے لئے مشقت کرتا ہوں۔ صبر آزما سفر کے بعد ہی منزل پر پہنچتا ہوں۔ یہ کارروائی تخلیقی نوعیت کی ہے۔ اسی طرح محنت ثمر ور ہوتی ہے۔

انور سدید: رحمان مذنب صاحب! آپ نے آزادی سے پہلے افسانہ لکھنا شروع کیا تھا، اب تک آپ کا قلم رواں ہے۔ آپ متعدد افسانہ نگاروں سے ذاتی سطح پر واقف ہیں، کیا آپ اپنے

معاصرین کے فن پر اپنی رائے سے نوازیں گے؟

رحمان مذنب: اللہ کا کرم ہے کہ اب تک قلم رواں ہے۔ میں بعض معاصرین سے ذاتی سطح پر واقف ہوں، بعض سے جرائد و رسائل کے ذریعے آگاہ ہوں۔ غیر ملکی افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کو بھی پڑھتا ہوں۔ گورکی، چیخوف، دوستوایوسکی، موپساں، پرل ایس بک، گالز وردی، ہیرلڈ لیب اور بعض دوسرے مصنفوں کو بھی پڑھا ہے۔ بیلز یک کو گاہے گاہے پڑھتا رہتا ہوں۔ اس کا اندازِ بیاں اچھا لگا ہے۔ یلدرم سے انتظار حسین تک کتنے ہی افسانہ نگاروں کو شوق سے پڑھا ہے۔ قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، غلام الثقلین نقوی، فرخندہ لودھی، اشفاق احمد اور مرزا ادیب بڑے افسانہ نگار ہیں۔ یلدرم کا ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' پرلطف افسانہ نما آپ بیتی ہے۔ علی عباس حسینی کا افسانہ ''میلہ گھومنی'' غلام عباس کا ''اوورکوٹ'' حسن عسکری کا ''پھسلن'' فرخندہ لودھی کا ''شرابی''، شمس آغا کا ''شکست''، شفیق الرحمٰن کا ''سناٹا'' کرتار سنگھ دگل کا ''کالو'' غلام علی چوہدری کا ''اینٹ کا چہرہ'' اور چند دوسرے افسانہ نگاروں کے فن پارے اردو ادب کی جان ہیں۔ آغا بابر کا ''گلاب دین چٹھی رساں'' اگرچہ ماخوذ ہے لیکن اصل ماخوذ سے خاصی دور ہے اور خوب ہے۔

نئی پود میں سلیم آغا منفرد انداز لے کر آئے ہیں۔ ایک دن بڑے افسانہ نگار بن جائیں گے اور بعض افسانہ نگار پاؤں جما رہے ہیں۔

انور سدید: میں آپ سے یہ بھی پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے شاعری کی طرف زیادہ توجہ کیوں نہیں دی حالانکہ ہمارے ہاں ادیب لوگ ابتداء ہی غزل سے کرتے ہیں؟

رحمان مذنب: میری قلمی زندگی کی ابتداء نظم و نثر دونوں ہی سے ایک ساتھ ہوئی۔ 1925ء کے لگ بھگ ناٹک کے ایک اداکار نیاز حسین اختر لسبیلوی کے ذریعے امرناتھ سیدھا سے ملاقات ہوئی جنہوں نے رسول اکرم ﷺ کی سیرت پاک منظوم کی تھی۔ ملاقاتیں مسلسل ہوئیں۔ بعد ازاں انہوں نے موہری دروازے میں دفتر بنایا اور 'طوفان ویکلی' جاری کیا۔ میری نظمیں ہر شمارے کے پورے صفحہ اول پر شائع ہونے لگیں۔ اسی کے ساتھ میں مزاحیہ کالم بھی لکھنے لگا۔ اسی طرح میں نے دوپہر کے عنوان سے نظم لکھی۔ یہ 'ہمایوں' میں چھپی، نیرنگِ خیال میں میری طویل نظم 'رقاصہ' چھپی۔ بھوپال میں رہا تو وہاں کے مشاعروں میں برابر شریک رہا۔ غالب کے شارح

سہا مجددی اور شاعر بھوپالی سے ملاقاتیں رہیں۔ اندور میں مہو چھاؤنی کے مشاعروں میں حصہ لیا۔ ادیب سہارنپوری ہمارے ہاں آتے رہتے تھے۔ ممبئی میں آل انڈیا مشاعرے میں شریک ہوا۔ حفیظ جالندھری اور جوش ملیح آبادی کو خصوصیت سے مدعو کیا گیا۔ حفیظ تو آئے۔ انہوں نے اپنا کلام بھی پڑھا، جوش بھی جھومتے جھومتے آئے لیکن مدہوشی کے باعث مشاعرہ نہ پڑھ سکے۔

ابتداء ہی میں ایک حادثہ بھی ہوا۔ اسلم حیات وکیل نے بازار شیخو پوریاں کے ایک چوبارے میں دفتر بنایا۔ میں ان سے ملتا رہا میرے ہاتھ میں ہمہ وقت کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ہوتی تھی۔ ایک دن گیتوں کی کاپی ہاتھ میں تھی۔ ملنے گیا تو انہوں نے کاپی دیکھنے کو لی، رکھ لی اور پھر کبھی واپس نہ کی۔ غزلیں، نظمیں، نعتیں، حمد اور قطعے کہے۔ حلقہ اربابِ ذوق (ادبی) وغیرہ کے ماہانہ مشاعروں میں کلام پڑھتا رہا لیکن بوجوہ مشاعرے کا شاعر نہ بن سکا۔ ادھر نثر کا وسیع میدان سامنے کھلا پڑا تھا۔ افسانے، ڈرامے اور تحقیق کے کام نے توجہ جذب کر لی۔ شاعری کے لئے زیادہ وقت نہ ملتا۔ بہر حال میرا کلام بکھرا پڑا ہے، اسے جمع کر رہا ہوں۔

انور سدید: آپ اپنے افسانوں میں پلاٹ، کردار اور فضاء میں سے کس چیز کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں؟ اس کے ساتھ یہ بھی بتائیے کہ افسانہ آپ پر کس طرح اترتا ہے؟ یعنی یہ خیال ہوتا ہے یا پورا واقعہ جو آخر افسانہ بن جاتا ہے؟ یا آپ پلاٹ کو سوچ کر افسانہ مرتب کرتے ہیں؟

انور سدید: انور سدید صاحب! ہوش سنبھالتے ہی مشاہدے، تجربے اور سوچ کا عمل شروع ہو گیا۔ ڈرامائی اور افسانوی دنیا میرے سامنے آ گئی۔ مطالعے سے مجھے اصناف ادب کا شعور ملا۔ اس کے پہلو بہ پہلو ذہنی ارتقاء ہوتا رہا۔ کتابوں اور انسانوں یعنی چلتی پھرتی کتابوں نے مجھے بہت کچھ دیا۔ متخیلہ کی چلو میں قافلہ دل رواں رہا۔ فکری اور تجرباتی اندوختہ بڑھتا رہا۔ اس طرح تخلیقی کارگاہ میں تخلیقی عمل سے قبل خام مال کے ڈھیر لگ گئے۔ تخلیقی سوچ کارفرما رہی۔ چشمہ جاری ہوا تو افسانے اور ڈرامے نوکِ قلم پر آنے لگے۔ کبھی تو ایسا ہوا کہ سانحات و واقعات، تجربات و مشاہدات کو یکجا کرنے کے لئے کئی کئی دنوں اور مہینوں سوچتا رہا اور کبھی اچانک پورا افسانہ، پورا ڈراما مع مکالمات نازل ہوا۔ الف سے ی تک تمام عناصر و اجزاء ہوئے۔ قلم ہاتھ میں آیا افسانہ یا ڈراما الفاظ کے پیرائے میں صفحہ قرطاس پر منتقل ہونے لگا۔ پلاٹ، کردار اور فضاء باہم یکجا ہوتے ہیں۔ ان تینوں کا

حصہ حسبِ ضرورت انہیں ملتا ہے۔ یہ تینوں ایک دوسرے سے مل کر وہ عمارت تیار کرتے ہیں جسے افسانہ کہا جاتا ہے۔ پلاٹ کی بنت میں کردار (اپنے حالات، واقعات وسانحات، رویّے، سوچ، جذبات ومحسوسات اور الفاظ کے ساتھ) حصہ لیتے ہیں۔ ماحول اور **Habitat** سے ان کی شکل وصورت نمو پذیر ہوتی ہے۔ انہی سے ایک خاص فضاء بنتی ہے، جس پر ان کی ضرورت اور اہمیت کے مطابق توجہ درکار ہوتی ہے۔ معمار صرف گچ گارے ہی کو اہم نہیں سمجھتا اور اسی سے دیوار کھڑی نہیں کرتا بلکہ اینٹ، پتھر اور لوہے کو بھی پیوست کرتا ہے۔ تجربے اور ریاضت کی بدولت مجھے معلوم ہے کہ افسانوی اکائی تخلیق کرنے کے لئے کس عنصر کی کہاں کتنی ضرورت واہمیت ہے۔

الفاظ کو لیجئے! یہ بھی نازل ہوتے اور تخلیقی عمل کا حصہ بنتے ہیں۔ پورے افسانے کے انداز بیاں کا مسئلہ ہو یا کسی کردار کی زبان کا، الفاظ کی بڑی قدر ومنزلت ہے۔ افسانہ لکھتے وقت لفظوں کے طلسم سے ان کی انفرادی اور پورے جملے، پورے پیراگراف اور پورے افسانے کی موسیقی بروئے کار آتی ہے۔ میں اپنے بیتے ہوئے دنوں میں **Re-Live** کرتا اور لفظوں کی مدد سے انہیں فنی پیمانے میں ڈھالتا ہوں۔ تخلیقی جوہر جو در پئے تشکیل ہوتا ہے وہی میرے متخیلہ اور سوچ کر تحریک دیتا ہے...... قلم میں حرکت آنے سے قبل ذہن میں افسانے کا ہیولا معرضِ وجود میں آچکا ہوتا ہے۔ اسی میں افسانے کا پورا مواد، جملہ اجزائے ترکیبی اور عناصر پائے جاتے ہیں۔

انور سدید: رحمان مذنب صاحب! کیا آپ نے کبھی محسوس کیا ہے کہ آپ افسانے میں جو بات کہنا چاہتے تھے، وہ کہہ نہیں سکے؟ یا تشنگی رہ گئی ہے؟ کیا کبھی کردار اتنا منہ زور ثابت ہوا کہ راستہ روک کر کھڑا ہو گیا؟ آپ کو بے بس کر دیا؟

رحمان مذنب: میرا افسانہ اور اس کے کردار پوری معنویت، مقصدیت اور غرض وغایت لئے ہوتے ہیں۔ خیر وشر کے تصادم اور معاشرے کی ناہمواریوں کو اجاگر کر کے ہی بات بنتی ہے۔ میرا اپنا نظریہ ہے، اپنی سوچ ہے جس کی روشنی میں افسانے کو معنوی سمت دیتا ہوں۔

جہاں تک کسی منہ زور کردار کے راستہ روک کر کھڑا ہونے کی بات ہے تو عرض ہے کہ جب تک کردار مع جملہ لوازمات وحالات پوری طرح میری گرفت میں نہ آئے میں افسانہ لکھتا ہی نہیں۔ نوکِ قلم پر آنے سے پہلے فکر اور تخیل ذہن میں افسانے کا جو ہیولیٰ تیار کرتے ہیں وہ کاملاً

میرے لئے قابل فہم ہوتا ہے اور میں عمل تخلیق میں Desperate ہوتا ہوں۔

Mental Reservations نہیں رکھتا۔ آپ نے تو ''گشتی'' کا مطالعہ کیا اور اپنے ایک انتخاب میں شامل بھی کیا ہے؟ اس سے زیادہ منہ زور کردار اور کون سا ہوگا؟ وہ بڑی قوت اور شدت سے منظرِ عام پر جلوہ گر ہے۔ میرے نزدیک حقیقت فہمی اور حقیقت نگاری میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

انور سدید: افسانوں کی تین کتابیں شائع ہو جانے کے بعد اب آپ کے مستقبل کے کیا منصوبے ہیں؟

رحمان مذنب: کرنے کو بہتیرا کام پڑا ہے۔ اللہ کو منظور ہوا تو افسانوں کے مزید دو تین مجموعے منظرِ عام پر آجائیں گے۔ قبل اسلام کے ادیان پر دو کتابیں (دین ساحری۔ اسلام اور جادوگری) چھپ چکی ہیں۔ اس سلسلے میں بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈرامے اور تھیئٹر کا دورِ اوّل، کا مسودہ پرچھتی پر رکھا ہے۔ جب تک دم میں دم ہے، کام کرتا رہوں گا۔ توفیقِ الٰہی کا طلبگار رہوں۔

..........o..........

رحمان مُذنب سے ایک اور ملاقات

انور سدید

انور سدید: آپ ادب میں کیسے آئے؟ آپ کے گھر کا ماحول کیسا تھا؟

رحمان مذنب: اسے کرشمہ کہیئے کہ میں ادب میں آ گیا۔ میرے گھر کا ماحول عالمانہ تھا۔ عربی کی جہازی سائز کی بڑی بڑی ضخیم کتابیں صندوقوں کے اندر اور ان کے اوپر رکھی رہتیں۔ والد مفتی عبدالستار 1937ء تک (تادم آخر) شاہی مسجد (لاہور) کے مفتی رہے۔ عربی کے بہت بڑے عالم تھے۔ قال قال رسول اللہ کا ورد رات دن رہتا۔ شمس العلماء پروفیسر مفتی محمد عبداللہ ٹونکی (سربراہ شعبہ عربی) اورینٹل کالج بھی ہمارے یہاں تشریف لاتے رہے۔ نانی کلثوم بی (شمس العلماء کی خالہ زاد بہن اور رضاعی بہن) معلمہ تھیں۔ بڑی آپا اشفاق النساء رشیدہ باجی کے سکول میں پڑھتی تھیں۔ بلا کی ذہین، خوش گفتار، خوش رو اور ہنس مکھ تھیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کی دل پسند کہانیاں پڑھ کر سناتیں۔ چند سال ہوئے پبلشر حسن اشرف نے یہ کہانیاں چھاپیں تو مجھے کتاب کا دیباچہ لکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ بڑی آپا اونچی آواز میں بہشتی زیور بھی پڑھ کر سناتیں۔ آواز میں بڑا لوچ تھا، نغمگی تھی، نظمیں گاتی تھیں، انہیں کبھی ٹوکا نہیں گیا۔ والد سورج نرائن دہلوی کا کلام لے آئے، ہنسی کے گول گپے میں خود خرید لاتا تھا۔ حضرت یوسف اور زلیخا کا قصہ، جنگ بدر، جنگ احد اور جنگ خندق ایسی مہمات نیز رسول پاک ﷺ کی زندگی کے واقعات اور انمٹ نقوش کا بیان والد صبح کے درس حدیث میں کرتے، میں بھی سنتا۔ سہ پہر کو علمی اور سیاسی نشست ہوتی۔ میرِ مجلس والد ہوتے۔ پروفیسر سید طلحہ (آف اورینٹل کالج) باقاعدہ آتے لیکن بالعموم چپ رہتے، باتیں سنتے، کبھی کبھی ہونٹوں پر مونا لیزا کی مسکراہٹ آ جاتی۔ منشی الٰہی بخش روزنامہ ''زمیندار'' پڑھ کر سناتے۔ غلام غوث اور دیگر اشخاص بھی موجود ہوتے۔ تحریک خلافت کے تذکرے ہوتے۔ یہی

میرا سب سے اہم سرچشمہ علم وادب تھا۔ اس کی ضیاء میرے لئے بصیرت افروز تھی۔ یہ میرا گھر تھا، میری درس گاہ تھی۔ یہاں کی تعلیم وتربیت عمر بھر کام آئی۔

انور سدید: یہ احسان فروشی یا کفران نعمت نہیں کہ آپ دینی عالم بننے کے بجائے ادیب بن گئے؟

رحمان مذنب: علم وادب دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں نے دونوں سے رابطہ اور واسطہ رکھا۔ میرے گھر اور باہر کے ماحول میں ہم آہنگی نہ تھی۔ ادھر اذان کان میں پڑتی، ادھر بائی جی کی تان سنائی دیتی۔ تاتن تنا کی لہر میں سرگم کی رو شامل ہو جاتی اور دین وایمان کو لوٹ لیتی۔ ادھر استاد برکت علی کی نقل اتارتے ہوئے کوئی نو آموز ''سانچ کہو مو سے بتیاں، کہاں گنوائیں ساری رتیاں'' گاتا چلا جاتا۔ میرا گھر یقیناً میری پہلی درسگاہ تھا۔ یہاں وہ چشمہ بہتا جو دیدۂ دل کو سیراب کرتا۔ باہر بے وفاؤں کی بستی تھی جہاں منڈوا تھا، تپلی جان کی بیٹھک تھی۔ اللہ وسائی، سردار بائی، عیدن بائی، گلزار بائی اور درجنوں عورتوں کے ڈیرے تھے۔ ان کے پہلو میں بدنصیب نکیائیوں کے دڑبے تھے جو مرنے سے پہلے مر جاتیں۔ ان کے دتے رات کی تاریکی میں انہیں کسی گڑھے میں پھینک آتے۔ ادھر مرنے والی کا دڑبہ خالی ہوتا ادھر دوسری نکیائی آ جاتی۔ گھر میں علم تھا، پاکبازی تھی، درویشی تھی، دانائی تھی۔ باہر افسانہ اور ڈراما تھا، ہر آن کوئی واقعہ، کوئی سانحہ دیکھنے میں آتا۔ صابر حجام کی دکان میں خوشیا ملاح کو کسی نے استرا مار دیا۔ سڑی پہلوان نے اپنے جوا خانے کو نئے خطوط پر ترتیب دینے اور محفوظ کرنے کے لئے ٹبی کے تھانیدار سے نیا معاہدہ کر لیا۔ بے وفاؤں کی بستی میں، کوٹھی خانوں کے کونوں میں، کلال خانے میں اور بھرے بازار میں دن اور رات میں کیا کیا گل کھلتے، حسن وعشق کی جوالامکھیوں میں پروانے کس طرح جلتے مرتے۔ جنت اور جہنم کے حیرت خیز مناظر کم وبیش ساٹھ سال تک میں نے دیکھے۔ یہ تماشے مجھ پر گزرے۔ کنارے پر کھڑے ہو کر نہیں، جوالامکھی میں کود کر تجربہ کیا۔ یہ سب فکشن کا گراں قدر خام مال تھا۔ اس نادر ونایاب اثاثے نے مجھے ڈراما نگار اور افسانہ نگار بنا دیا۔ میں ماحول کی پیداوار ہوں۔ ''کانچ کے پتلے'' کا غیر مطبوعہ مجموعہ بازار کی دین ہے۔ تین مطبوعہ افسانوی مجموعے...... ''تپلی جان''، ''بالا خانہ'' اور ''رام پیاری'' کی بیخ وبن یہیں پڑی۔ گھر میں بیٹھ کر جو مطالعہ کیا۔ والد کی صحبت سے جو دانش ملی، تیسرے مجموعے میں اس کے عناصر ملتے ہیں۔ دولخت ہوتے ہوئے بھی میں نے جسم وجان کی

اکائی برقرار رکھی۔ گھر کے ماحول کی بدولت اسلام اور دیگر ادیان کا تقابلی مطالعہ بھی کیا اور کتابیں بھی لکھیں۔ میرے مولا نے چاہا تو یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

انور سدید: آپ کو صرف طوائف کا افسانہ نگار کیوں کہا جاتا ہے؟

رحمان مذنب: ظاہر ہے کہ طوائف کے بارے میں جس قدر مجھے تجربہ ہوا، جتنا مواد میرے پاس تھا، اتنا مواد منٹو یا کسی اور کے پاس نہ تھا۔ غلام عباس کے پاس بھی بڑا مواد تھا لیکن بدنامی کے خوف سے اس نے ادھر رخ نہ کیا حالانکہ وہ اس گھرانے کا فرد تھا۔ میں نے طوائف کو دریافت کیا۔ طوائف کی اندرونی، پوشیدہ زندگی اور اس کے معاشرے کے خط و خال، حالات و معاملات اور سرگرمیوں کو جانا، طوائف کیا ہوتی ہے، کاروبار کیسے کرتی ہے، اس کی محبتوں اور وفاؤں کی حقیقت کیا ہے، اس کی ذمہ داریاں، ضرورتیں اور مجبوریاں کیا ہیں، اس کی ماں نائکہ نے مجرا خانے سمیت گھر کی باگ دوڑ کیوں اور کیسے سنبھالی؟ طوائف کو کون ہنسی خوشی لوٹ مار کے سہل مواقع فراہم کرتا ہے؟ کون اپنے آپ اس کا شکار ہوتا اور کبھی اس کے ناز و انداز اور کبھی ظلم و ستم کا شکار ہوتا ہے؟ مجرا خانے اور خواب گاہ کے درمیان جو چار قدم کا فاصلہ ہے، وہیں مذبح ہے۔ کون یہاں قتل ہوتا ہے؟ کون یہاں طوائف کو قتل کرتا ہے؟ قتل تمیزن کا ذمہ دار کون ہے؟ نگو کیوں ماری گئی؟ بخمل کے کنوارپن کی حفاظت کس دن کے لئے کی جاتی ہے؟ بڑے بڑے نوسر باز، ہیر پھیر کے ماہر تاجر، بلیکیئے، خرانٹ بینکار طوائف کی چوکھٹ پر آ کر کیسے جھک مارتے اور جھک جاتے ہیں؟ کیوں لٹ جاتے ہیں؟ طوائف گالی ہے، سب اس کے دشمن ہیں لیکن واری واری جایئے اس کی دانش پر! یہ صف شکن انسانوں کے عدم تعاون اور ان کی نفرتوں کے درمیان راستہ بناتی اور بتیس دانتوں میں قینچی کی طرح چلتی ہے۔ منٹو اور غلام عباس طوائف کے بارے میں دو چار افسانے لکھ کر سمجھ بیٹھے کہ انہوں نے میدان مار لیا۔ مقدموں نے تو منٹو کو اور بھی سرخرو کر دیا۔ دو چار نخروں سے طوائف نہیں بنتی۔ طوائف بہت بڑی چیز ہے۔ چالاک ہے، مکار ہے اور ایک طرف مجبور و مظلوم بھی۔ منٹو کے بس کی بات نہ تھی۔ میں نے بیسیوں افسانے طوائف کی زندگی، اس کی نجی اور کاروباری زندگی پر، طور طریقوں اور فتوحات پر لکھے اور لکھ رہا ہوں۔ میں نے پہلا بڑا افسانہ ''پھول سائیں'' (مطبوعہ ''ماہ نو'') ایک شریف خاندان کی تباہی پر لکھا اور پھر بیسیوں افسانے شرفا کے بارے میں

لکھے۔ ٹیکنیکی بالخصوص اندازِ بیاں کے اعتبار سے کسی طور طوائف کے افسانوں سے کمتر نہیں لیکن قسمت طوائف کی جاگی، مقبولیت اور شہرت اسی کو ملی۔ طوائف کے افسانے زیادہ دلکش ثابت ہوئے کیونکہ یہ پراسرار ہستی، بازار کی یہ بلبل اپنی تہہ در تہہ شخصیت اور ہزار فتنوں سمیت ادب میں کھل کر نہ آئی تھی۔ میں نے جو کام کیا، مکمل بھی تھا، بھرپور بھی تھا اور حیرت خیز بھی۔ اس لئے طوائف بالخصوص تتلی جان male prostitute میری پہچان بنی۔ میں نے طوائف کی پچھتر (75) سالہ زندگی کو کاغذ پر اتار دیا ہے۔ یہ ایک اہم، عظیم تاریخی اور ادبی کارنامہ ہے۔ میرے افسانوں نے اس کلچر اور اس طوائف کو دوام بخشا جواب مر چکی ہے۔ اس کی حکایتیں اور روایتیں میں نے محفوظ کر لی ہیں۔

انور سدید: آپ کا موازنہ سعادت حسن منٹو سے کرنا مناسب ہے؟

رحمان مذنب: کیوں نہیں؟ موضوع جو ایک ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا جو ملک کے بلاشبہ بہت بڑے دانشور، بہت بڑے ادیب اور منفرد نقاد ہیں۔ ان کی تنقیدی نظر ادبی موضوعات کے حوالے سے بہت دور رس اور یکتا ہے۔ ان کا تنقیدی اسلوب تخلیقی ہے اور نہایت وقیع ہے، مدلل ہے، ان کے پائے کا دوسرا نقاد نہیں۔ انہوں نے جب میرے افسانے پڑھے اور ان کے مقابل منٹو کے کام کو جانچا تو مجھے بلند تر پایا۔ میرے یہاں جو جزئیات نگاری ہے، جو معلومات، انکشافات اور معلومات ہیں منٹو تو کیا، کسی کے یہاں بھی نہیں۔ طوائف کا موضوع بڑا وسیع ہے۔ طوائف پر قابو پانا اور اس کے قد و قامت کو ناپنا، اس کے پہلو دار چلن کو جاننا، اس کی ہنر مندی...... چالاکی اور مکاریوں کو بھانپنا، اس کی وفا و جفا، محبت اور نفرت کا پردہ چاک کرنا منٹو کے بس کا روگ نہ تھا۔ میں 1952ء سے اس ذات شریف پر افسانے لکھ رہا ہوں لیکن یہ نئے نئے پہلو سے جلوہ فرما ہو رہی ہے۔ ساٹھ سال پر پھیلے ہوئے کینوس کو قلم رنگ دے رہا ہے۔ ہر افسانہ، ہر کہانی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ''گشتی'' کی طوائف ''بلوری بلبل'' کی طوائف سے یکسر مختلف ہے۔ ''کوہاں کی جنت'' کی ہیروئن ''خلاء'' کی تنکیائی الگ الگ داستانوں کے عنوان ہیں۔ ''باسی گلی'' جسے مولانا صلاح الدین احمد نے ''ادبی دنیا'' کے ایک ضخیم شمارے کا بہترین افسانہ قرار دیا۔ گاؤں سے بازار تک کی طویل اور مکمل کہانی ہے۔ ''ایشاں'' کے نقش و نگار اور طرزِ حیات بالی اور گوہری بلکہ کسی بھی میری کہانی کی طوائف سے نہیں ملتی۔ ''بالا خانہ'' طوائف کی تین نسلوں کا افسانہ ہے اور پھر ''تتلی جان'' Male

prostitute بقول ڈاکٹر وزیر آغا تیسری جنس کا پہلا افسانہ ہے جسے رحمان مذنب نے اردو ادب کو عطا کیا۔ڈاکٹر انور سدید! آپ نے اور ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے تائید کی ہے۔ یہ ایک تاریخی کارنامہ ہے، تاریخی حقیقت ہے۔ میں منٹو یا کسی اور کا کریڈٹ نہیں لینا چاہتا اور اپنا کریڈٹ بھی کم نہیں کرنا چاہتا۔ میری ساٹھ سال کی کمائی ہے۔

انور سدید: طوائف پر غلام عباس، ایم اسلم اور آغا بابر نے بھی اچھے افسانے لکھے ہیں، کیا یہ افسانہ نگار موضوعی اعتبار سے آپ سے مختلف ہیں؟

رحمان مذنب: نقادان حضرات کو Due کریڈٹ دیں۔ میں کسی سے جلتا نہیں لیکن نام نہیں، کام ملحوظ خاطر رکھیں۔ ایم اسلم نے ادب کی خدمت ضرور کی ہے۔ مرحوم عبدالسلام فروغی نے ان کی کتابیں بڑی عقیدت سے چھاپیں اور یکے بعد دیگرے سانس لئے بغیر چھاپیں۔ لیکن نجو بائی جسے فتنہ قیامت کہا جائے گا، ایم اسلم سے فرلانگ بھر دور نوگزے کی خانقاہ کے پاس رہتی تھی، ان کی نظر اس پر نہ پڑی، ایم اسلم کا قلم نہ جانے کہاں بھٹکتا رہا۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ ایم اسلم دوسرے درجے کے ادیب تھے۔ گراموفون کے ریکارڈ سن کر موڈ میں آتے، موضوع کی بجائے جانوروں کا شکار کرتے۔ طوائف کو نکھارنے سنوارنے، کام سوتر میں بتائے ہوئے سولہ سنگھار سے آراستہ کرنے، دشمنِ ایمان و آگہی بنانے اور سکندر و دارا کو اس کے حضور سر بہ سجود دکھانے کے لئے ژرف نگاہی اور ہنرمندی کی ضرورت ہے، ایم اسلم کے بس کی بات نہ تھی۔ غلام عباس نے بھی حق ادا نہیں کیا۔ وہ طوائف کی آغوش میں پلے، پروان چڑھے، نصیبن کے نصیب کشمیری بازار کے دین محمد اینڈ سنز کے رائٹر محمد دین شوق کی جیب سے کھلے۔ غلام عباس اور سعید کٹڑی میاں عبدالحمید چھوڑ گئے۔ غلام عباس نے گھر کے موضوع پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ آغا بابر ان دونوں افسانہ نگاروں ...... ایم اسلم اور غلام عباس سے بہتر ہیں لیکن انہوں نے طوائف کو منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے استعمال کیا۔ وہ اس کی گلی میں کب گئے؟ کب انہیں جان و دل عزیز نہ رہے، مجھے معلوم نہیں۔ طوائف تو ایک صحرا ہے، سمندر ہے۔ اسے کون پاٹ سکے گا؟ برسوں کون اس سے دوستی کرے گا؟ تباہی و بربادی جھیلے گا، کون اس ''خوبصورت بلا'' کو اس دل پسند قاتلہ کو گلے لگائے رہے گا۔ اس حسینہ نازنین کے پہلو میں فرحت ہے، راحت ہے لیکن یہ قہرناک ہے۔ سراپا آگ ہے، جلتا ہوا چولہا ہے جو بڑی بے

وردی سے بندے کو جال دیتا ہے۔ آغا بابر بڑے افسانہ نگار ہیں لیکن طوائف ان کا موضوع سرِ راہے ہے۔ یہی بات منٹو کی ہے۔ طوائف بڑا دلآویز اور پرکشش موضوع ہے لیکن مشکل اور پراسرار موضوع ہے۔ قلمکار میں اتنا حوصلہ ہو کہ اپنی پوری زندگی، تمام توانائی اور ساکھ آتش نمرود میں جھونک دے۔ جان پر کھیل جائے اور پھر کھرا سونا بن کر طلوع ہو۔ مجھے قسمت نے ایسی جگہ پیدا کیا جہاں چار قدم پر منڈوا، عزیز تھیٹر موجودہ پاکستان ٹاکیز، تِلّی جان کی بیٹھک، رحیم بخش سبزی فروش کے ناخلف فرزند سڑی پہلوان کا جوا خانہ، بھنگ نوشوں کا اڈہ، چانڈو خانے، تکیائیوں کے دڑبے، تکیہ چیت رام، ڈیرہ دارنیوں کے کوٹھے، کوٹھی خانے، اکی پہلوان (بھولو پہلوان کا بھائی نہیں)، عاشق بھیڈو، بابو پہلوان، سردار پہلوان کا تکیہ اور کیا کچھ نہ تھا یہاں۔ شہرِ نگاراں میں عمر گزری ہے میری، یہ سب کچھ قسمت کی مہربانی تھی۔ میں نے افسانوں اور ڈراموں کے لئے اتنا مواد جمع کرلیا کہ ہنوز ختم نہیں ہوا۔ جسے پون صدی کی طوائف کا دیدار کرنا ہو وہ میرے افسانے پڑھ لے (تِلّی جان اور بالا خانہ میں سمیٹ لیا میں نے طوائف کو) کام کب ختم ہوا ہے۔ تخلیق کا دروازہ کب بند ہوا۔ یہ تازہ افسانے ''پرانا شہر'' اور ''کواڑ کی آڑ میں'' ہیں۔ مزید تین افسانوں کے ڈھانچے ذہن میں گشت کر رہے ہیں، تین چار مہینے فرصت کے ملیں تو انہیں کاغذی پیرہن پہنا دوں۔ ان کا روپ پہلے افسانوں سے الگ ہوگا۔ شہرِ نگاراں کی ہر عورت ایک انوکھا افسانہ ہے، منفرد کہانی ہے۔ میں نے جتنی عورتیں اپنے افسانوں کی زینت بنائی ہیں سب ایک دوسرے سے کوئی مماثلت نہیں رکھتیں۔ یہی میرا کمال ہے۔

انور سدید: کیا آپ کو نقادوں نے نظر انداز کئے رکھا یا آپ کو کسی بڑے نقاد کا تعاون حاصل رہا، کیا کسی بڑے نقاد نے دوست داری نبھائی یا آپ کا تجزیہ فن کی قدروں کے مطابق کیا؟

رحمان مذنب: ہمارے یہاں نقادوں کی شدید قلت ہے۔ دوسرے تیسرے درجے کے نقادوں کی افراط ہے۔ ہر دف کے اپنے نقاد ہیں۔ مجھے نقادوں نے نظر انداز ضرور کیا ہے۔ کسی نے کہا، یہ ہم میں سے نہیں، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن شکوہ بے سود ہے۔ جہاں تک تعاون اور دوستی کا تعلق ہے، افسانہ نگار اور نقاد میں تعلق ہونا چاہئے۔ یہ دونوں کے حق میں اچھا ہے۔ اس طرح فنی اعتبار سے بھید کھلتے ہیں۔ نکتے نکلتے ہیں۔ افہام و تفہیم ہوتی ہے لیکن کوئی نقاد دوستی کے حوالے سے کسی فن

پارے پر تنقید نہیں کرتا، فیصلہ نہیں دیتا، اپنی رائے فنی اصول کے مطابق قائم کرتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو میری نظر میں یہ بد دیانتی ہے۔ ادیبوں (تخلیق کاروں) اور نقادوں کے باہمی تعلقات فطری امر ہیں۔ یہ لابدی ہیں۔ یہ برادری بڑی اہم ہے۔ اس کے افراد میں مکانی فاصلے تو ہو سکتے ہیں لیکن میل ملاپ فکری اور نظریاتی سطح پر ضرور ہونا چاہئے اور یہ ہوتا بھی ہے۔ میری اس برادری میں شمولیت تو 1932ء سے ہے (پینسٹھ 65 سال ہوئے ہیں قلمی زندگی کو)۔ دلی اور بھوپال میں ادیبوں اور شاعروں سے تعلق ہوا لیکن لاہوری برادری سے ابتداء ہی میں تعلق قائم ہوا۔ مولانا حامد علی خاں، شبلی بی کام (بعد ازاں ایم کام) میرزا ادیب، احسان بی۔ اے، اسلم کاشمیری اور دیگر متعدد ہمعصروں سے ملتا جلتا رہا، لیکن بہار تب آئی جب میں 1951ء کے لگ بھگ انجم رومانی کے اکسانے پر حلقہ ارباب ذوق میں آنے جانے لگا۔ اس سے کئی سال پہلے جب ایس پی کے ایس کے ہال (چوک موری دروازہ) میں حلقے کے جلسے ہوتے تھے میرا پھیرا رہتا تھا۔ آزادی کے بعد حلقہ پورے شباب پر آیا۔ اس کا بانکپن قابلِ دید تھا۔ اس کا رکن ہونا بہت بڑا اعزاز تھا۔ کتنے ہی سرکاری افراد اور غیر سرکاری ادیب انتہائی خشوع وخضوع سے شرکت کرتے۔ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے بورڈ روم میں ہر اتوار کو باقاعدگی سے اجلاس ہوتا۔ اجلاس سے پہلے اور بعد میں ارباب پاک ٹی ہاؤس میں جمع ہوتے۔ علمی و ادبی گفتگو ہوتی۔ میں نے اس کے جلسوں میں افسانے، ڈرامے اور تحقیقی مقالے پڑھے۔ ان کی تعداد کسی سے کم نہیں اور دورانیے سے کہیں زیادہ طویل ہوتے۔ چند افسانے جو حلقہ ارباب ذوق میں پڑھے، یہ ہیں..... ''تِکّی جان'' جو میری پہچان بنی اور متعدد انتخابی مجموعوں میں شامل ہوا۔ سب سے پہلے حلقہ ارباب ذوق میں پڑھا۔ پھر ''نئی تحریریں'' میں ستمبر 1951ء میں چھپا۔ ''چڑھتا سورج'' 29 ستمبر 1956 کے اجلاس میں پڑھا (بعد ازاں ''کامران'' میں چھپا)۔ ''ملنگ'' 18 اگست 1968ء کے اجلاس میں ''پھرکی'' 24 ستمبر 1961ء کے اجلاس میں ''خلا'' اور کتنے ہی اور افسانے پڑھے۔ یہ افسانے کس پائے کے ہیں انہیں میرے افسانوی مجموعوں تِکّی جان اور بالا خانہ میں پڑھ لیجئے۔ حلقہ ارباب ذوق میں شمولیت سے خوب دوستیاں ہوئیں لیکن کیا کہئے ان دوستیوں کو؟ بعض بلند مرتبہ ارباب اجلاس میں منہ پر چپ کی مہر لگائے بیٹھے رہتے۔ اکیلے میں ملتے تو جی کھول کے تعریفیں کرتے۔ اربابِ حلقہ

میں سے کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ مجھ پر کچھ لکھتا۔ اگر یہ افسانے منٹو لکھتا تو خوب چرچا ہوتا۔
سرخاب کے پر لگ جاتے اسے۔ خوب خوب مقالات اور خطوط لکھے جاتے۔ بہرحال میں شاکی
نہیں۔ دوستی اپنی جگہ، میں نے دوستی کا واسطہ دے کر کبھی کسی کو لکھنے کے لئے نہیں کہا اور انور سدید
صاحب! آپ تو لکھتے ہی تب ہیں جب کوئی ادب پارہ...... افسانہ یا شعر آپ سے گفتگو کرے۔
مجھے اس بات کا رنج ہے کہ ارباب ذوق کا قلم میرے لئے بانجھ رہا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ بلاوجہ مجھے
درخور اعتنا کرتے، دوستی نبھاتے اور رعایتی نمبر دیتے لیکن وہ مجھے میرا **Share** تو دیتے، سچ
بولتے، انصاف کرتے اور فنی سطح پر میرے فن کی قدر و منزلت کرتے۔ اب اگر میں مولانا صلاح
الدین، ڈاکٹر وزیر آغا، سجاد نقوی اور آپ کو اپنا محسن کہوں تو میری اس سے تسکی نہیں ہوتی۔ حلقے کے
دوار کان انتظار حسین اور مظفر علی سید نے ٹانگ کھینچنے کی احمقانہ کوشش کی۔ افسانے کے حوالے سے
ان کو شعور معمولی، فن کی پہچان برائے نام ہے۔ دونوں حضرات افسانہ فہم نہیں۔ انتظار حسین کا حلقۂ
احباب خاصا بڑا ہے جس کے سربراہ عبادت بریلوی ہیں۔ انتظار عصبیت کی تنگ نائے میں اسیر
ہیں۔ ان کے یہاں دوسروں کے لئے خیر کا پہلو عنقا ہے۔ پروفیسر سلیم الرحمان میری طرح انتظار کو
افسانہ نگار اور ناول نگار نہیں مانتے۔ انتظار اوسط درجے کے خاکہ نگار ہیں۔ بہاریں آئیں اور گزر
گئیں، بیچارے انتظار ایک ہی نقطے پر اڑے اٹکے ہوئے ہیں۔ اخباری کالم پشت پناہ ہے۔ رہے
مظفر علی سیّد، نقاد ہیں نہ افسانہ نگار۔ انہوں نے میرے افسانے پڑھے ہی نہیں۔ انتظار کی طرح سنی
سنائی باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ دوسروں کی **Quotations** اور آراء پیش کرتے ہیں۔ اپنے
پلّے کیا ہے ان کے؟ انہوں نے میرے افسانے سرے سے پڑھے ہی نہیں۔ کسی انگریزی پرچے
میں میرے خلاف مضمون لکھ بیٹھے۔ میرا جواب تیار تھا کہ سجاد نقوی نے ان کے لتے لئے۔ سیّد صاحب
نے چند سال قبل حلقہ ارباب ذوق کے ایک سالانہ اجلاس میں بھی میرے خلاف بے ہودہ گوئی کی
تھی۔ سجاد نقوی کے منہ توڑ جواب پر بلبلا اٹھے۔ لیک کر وزیر کوٹ گئے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے گھٹنے
پکڑے اور بڑی مشکل سے جان چھڑا کر پلٹے۔ مجھے ایسے اناڑیوں سے کیا سروکار؟ جہاں تک
بڑے نقادوں کا تعلق ہے تو سب سے پہلے مولانا صلاح الدین احمد اور ڈاکٹر وزیر آغا کا نام لوں گا۔
اس پائے کے لوگ دوست داری اور طرفداری نہیں کرتے۔ صحیح طور پر فن شناس ہیں۔ انہوں نے

فنی قدروں کی لاج رکھی اور انہیں فروغ دیا۔ ان کی ادبی خدمات Contribution لائق صد تحسین ہیں، دائمی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا بہت بڑے سکالر ہیں۔ انہوں نے حلقہ اربابِ ذوق کے ساونتوں کا طلسم توڑا۔ ''اردو زبان'' (شمارہ جنوری فروری 1969ء) میں میرے افسانوں کے بارے میں ان کا نہایت بصیرت افروز مقالہ چھپا۔ اسے میں نے اپنے افسانوی مجموعے ''تِلی جان'' میں پیش لفظ کے طور پر شامل کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کو اندرون ملک اور بیرون ملک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ بے پایاں ادبی اور علمی دولت رکھتے ہیں۔ ان کی بصیرت اور بصارت کی وسعت اور گہرائی کی ایک دنیا قائل ہے۔ کوئی ادیب دوستی کی وساطت یا کسی اور ذریعے سے اپنے فن کے بارے میں ان سے ایک لفظ بھی نہیں لکھوا سکتا۔ ان کی راست گوئی تنقید کے حوالے سے شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر انور سدید آپ گواہی دیں گے کہ آپ سے دیرینہ دوستی ہے لیکن آپ ایک الگ رائے رکھتے ہیں۔ دوستی اپنی جگہ، فنی تقاضے اس سے ماوراء ہوتے ہیں۔ نقاد سمیت ہر ادیب اور شاعر سے دوستی کرنا چاہیئے۔ کسی سے اپنے حق میں اپنے مطلب کی رائے طلب کرنا احمقانہ حرکت ہے۔ اس ضمن میں پاک وہند کی جانی پہچانی شخصیت اور اردو ادب کے صفِ اوّل کے نقاد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''اردو ادب روایت اور مسائل'' میں یہ گراں پایہ مقالہ شریکِ اشاعت کیا ہے۔ کھرا ادب، سچا فنکار اور نقاد بکاؤ نہیں ہوتا۔ مولانا صلاح الدین احمد سے نیاز مندی تھی۔ ڈاکٹر وزیر آغا، سدید اور غلام الثقلین نقوی سے دوستی ہے، قدرِ مشترک ادب ہے۔ میرے ایک محسن ہیں ثروت علی۔ ان سے دوستی تو کجا، ملاقات بھی نہیں۔ ملاقات کی آرزو ضرور ہے۔ انہوں نے The Courtesan Phenomenon کے عنوان سے نہایت نفیس مضمون لکھا جو فرنٹیئر پوسٹ مورخہ 11 مارچ 1992ء میں چھپا۔ میرے مخالفوں اور نام نہاد نقادوں کو یہ مضمون ضرور پڑھنا چاہیئے۔ اسی طرح ڈاکٹر مرزا حامد بیگ سے میں آج تک نہیں ملا، کیا عجب ہے کہ کبھی ملاقات ہو جائے۔ انہوں نے اپنی ضخیم تالیف افسانے کی روایت میں بڑی فراخ دلی سے میرا تذکرہ کیا ہے۔ قمر زیدی کا ''ماہ نو'' میں میری کتاب ''بالا خانہ'' پر بڑا طویل تبصرہ شائع ہوا، پھر جب انہوں نے ''تِلی جان'' پر تبصرہ چھپوانا چاہا تو بڑے صاحب نے اسے چھاپنے سے حکماً روک دیا۔ یہ سب کچھ ازل سے یونہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ میں اسے

پارٹ آف دی گیم کہوں گا۔ بڑے کھلاڑی کو گول کرنے سے پہلے بڑی رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ میں بفضلِ الٰہی گول کر چکا ہوں۔ رکاوٹیں میرا کیا بگاڑیں گی۔ ڈاکٹر وزیر آغا ادب میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے افسانہ نگاری کے حوالے سے میرا جو مقام متعین کیا ہے، میرے لئے وہی کافی ہے۔

انور سدید: آپ کے خیال میں ترقی پسند مصنفین کے افسانہ نگاروں نے افسانے پر کیا منفی اثرات ڈالے ہیں؟

رحمان مذنب: یہ حضرات ہم میں سے نہیں تھے۔ یہ تو ماسکو کے کھونٹے سے بندھے ہوئے تھے۔ ادب کے نام پر سیاسی مہم جوئی کرنے والے تھے۔ ان کا تو قبلہ ہی درست نہیں تھا۔ ملک میں کمیونزم کا زہر پھیلاتے تھے۔ انہوں نے اچھی فصل کاٹی۔ ادب کے بے دریغ سیاست کا آلہ کار بنایا۔ ملک کے اندر پرولتاری تحریک کو ہوا دی اور خود بورژوا بن گئے۔ جس ادب کا یہ مقصد ہو وہ منفی اثرات ہی ڈالے گا۔ کم از کم منفی اثر یہ ڈالا کہ نئے لکھنے والوں کو گومگو کے عالم میں ڈال دیا۔ مولانا صلاح الدین احمد اور پھر ڈاکٹر وزیر آغا نے بڑی جرأت مندی کا ثبوت دیا۔ ادبی دنیا کے جانشین ''اوراق'' نے دائیں بازو کے ادیبوں کو چھتری مہیا کی اور انہیں غلط کاروں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑا۔ ''ادبی دنیا'' اور ''اوراق'' ادب کے نجات دہندہ ثابت ہوئے ہیں۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ڈاکٹر انور سدید سے جری اور زبردست قلمکار ڈاکٹر وزیر آغا کے بازوئے شمشیر زن بن گئے اور انہوں نے سومنات ڈھا دیا۔ کیا ستم ہے کہ ماسکو وسطی ایشیائی ریاستوں کے مسلمانوں کو اندھا دھند سائبیریا کے اذیت خانوں میں پھینک رہا تھا، بے گناہوں کی گردنیں مروڑ رہا تھا، عبادت گاہیں گرا رہا تھا۔ دینی تعلیم اور فروغ کے دروازے بند کر رہا تھا، مظلوم و مقہور انسانوں کا لہو نچوڑ کر کیمونزم کے چراغ جلا رہا تھا اور ہمارے برخود غلط بھائی...... ترقی پسند...... قاتلوں اور ظالموں کو سلام کر رہے تھے۔ اردو غزل کو راگ درباری، ادب کو فرسودہ قدر اور اسلام کو رجعت پسند قرار دینے والے ہمیں گروہ بندی کی راہ پر ڈال رہے تھے۔ ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات و رسائل پر قبضہ جما رہے تھے۔ جانے یہ لال آندھی کب تک چلتی کہ افغانی شیر سامنے آگیا اور اس نے ریچھ کی کھال ادھیڑ دی اور ان گرگٹوں نے اپنے مفادات محفوظ کرنے کی خاطر نعت اور حمد کا سہارہ لے لیا۔ اس سے زیادہ منافقت اور کیا ہوگی۔

انور سدید: اردو افسانے پر ترقی پسندوں کے مثبت اثرات کیا ہیں؟

رحمان مذنب: ترقی پسند تحریک کا بڑا احسان ہے کہ اس نے اشتراکیت کا شور مچا کر لوگو کو جگایا۔ دائیں بازو حرکت میں آ گئے اور حلقۂ اربابِ ذوق نے زیادہ تندی اور تن دہی سے اپنی صفیں مضبوط کیں۔ حضرت علامہ اقبال نے جو حیرت خیز ذہنی انقلاب برپا کیا اور قوم کی سوچ کو صحیح ڈگر پر ڈالا تھا، دائیں بازو کا قلعہ ثابت ہوئے۔ اشتراکیوں نے ان کے اشعار سے فائدہ اٹھایا اور دہقان کو خوشہ گندم جلانے پر اکسایا۔ انہوں نے اسے لال درانتی تھامنے کو کہا۔ اشتراکی ادیب اور افسانہ نگار اسی دھن پر گاتے اور ناچتے رہے۔ حفیظ جالندھری ''شاہنامہ اسلام'' لے کر پہلے ہی سے میدان میں اترے ہوئی تھے، ان کے ساتھ دوسرے ہمنوا بھی شامل ہو گئے۔ افسانہ نگاروں کی خاصی بڑی تعداد حلقۂ اربابِ ذوق کے اندر اور باہر اشتراکی سیاست کو مضرِ صحت سمجھتے ہوئے اپنے راستے پر چلتے رہے۔ ترقی پسند تحریک نے ان کا بال بیکا نہ کیا۔ مثبت اثرات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمام بڑے افسانے یا آپ بیتی لکھتے لکھتے اچانک اشتراکیت کا نعرہ داغ دیتا تو اپنی تحریر کا ذائقہ خراب کر دیتا۔ ترقی پسند افسانہ نگار پروپیگنڈہ کرتے تھے۔ سیاست بگھارتے تھے۔ افسانہ پروپیگنڈے کی چیز نہیں اور سیاست پوری زندگی، پوری قومی سوچ اور پورے نظامِ معاشرت پر محیط نہیں۔ بندے کو قدرت نے بے شمار غیر سیاسی افکار، معاشرتی اقدار، روزمرہ کے اشغال، جذبات، محسوسات اور تجربات سے نوازا ہے۔ سیاست کی فراوانی ہلاکت خیز ہوتی ہے، جیسا کہ آج کل ہے۔ کمیونزم کا طریقۂ واردات جارحانہ تھا اور اسی نے اسے غارت کیا۔ ترقی پسندوں کے جو بھی اثرات تھے وہ ان کے اندر ہی رہے، ان کے اپنے ہی گروہ پر پڑے۔ غیر اشتراکی افسانہ نگاران اثرات سے بچے رہے۔

انور سدید: اس کی کیا وجہ ہے کہ آزادی سے پہلے کے ترقی پسندوں میں جب کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد عباس، اوپندر ناتھ اشک جیسے ترقی پسند افسانہ نگاروں کا ذکر آتا ہے تو احمد ندیم قاسمی جیسے ترقی پسند کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے؟

رحمان مذنب: احمد ندیم قاسمی ملی جلی شخصیت کے مالک ہیں، کیا عجب کہ ان سے اوپر کے لوگ جو تحریک کے کرتا دھرتا تھے اور زیادہ بڑے پیمانے پر اپنے آقاؤں...... روس کے حکمرانوں سے زیادہ گہرے تعلقات رکھتے ہوں۔ ان کی نظروں میں احمد ندیم قاسمی کی وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان نہ ہو۔ احمد ندیم قاسمی نعتیں بھی تو لکھتے تھے اور لکھتے ہیں۔ جامعہ ملی کے شعبہ اردو کے سربراہ

اردو کے بہت بڑے نقاد اور معتبر و نامور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی ضخیم کتاب اردو افسانہ...... روایت اور مسائل میں بھی احمد ندیم قاسمی کا ذکر نہیں۔ اب میں کیا کہوں؟

انور سدید: احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری کے بارے میں آپ کی بے لاگ اور منصفانہ رائے کیا ہے؟

رحمان مذنب: احمد ندیم قاسمی اچھے افسانہ نگار ہیں لیکن ''فنون''، مجلس ترقی ادب اور ترقی پسند ادب کی لیڈری نے ان کی شخصیت کو چار چاند لگا دیئے۔ ان کا مقام افسانہ نگاروں کی قطار میں کھڑا کر کے لگایا جائے تو میری نظر میں منٹو، ممتاز مفتی اور اشفاق احمد تک ان کا قد نہیں پہنچتا۔ میں نے جب ان کا طویل افسانہ ''کنجری'' پڑھا تو اس کی طوالت غیر ضروری لگی۔ میں طویل افسانہ خود لکھتا ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ طوالت کا جواز کیونکر پیدا ہوتا ہے۔ جواز پیدا نہیں کیا جاتا، یہ تو افسانے، افسانے کے کرداروں اور اس کے ماحول کے قدرتی اور فنی تقاضے ہوتے ہیں۔ میرا افسانہ ''بالا خانہ'' 75 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ''کوباں کی جنت'' 53 صفحات پر مشتمل ہے۔ ''باسی گلی'' کی ضخامت 69 صفحات ہے۔ ''کنجری'' کے مقابل ''گنڈاسہ'' بہت جچا تلا افسانہ ہے۔ تکنیکی لحاظ سے ''کنجری'' سے بہتر افسانہ ہے۔ لفظی فضول خرچی افسانے ہی میں نہیں، دیگر اصناف ادب میں بھی روا نہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی گراں مایہ تالیف ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' میں منٹو کی جو رائے سلیم اختر کے حوالے سے نقل کی ہے۔ اس میں بھی احمد ندیم قاسمی کی بے جا طوالت کی شکایت کی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے پاس گاؤں کی زندگی کا خاصا تجربہ ہے۔ ''گنڈاسہ'' کی تکنیک پر عمل کرے تو کئی اور اچھے افسانے لکھ سکتا ہے۔ وقاص احمد نے ان کے افسانے ''کنجری اور رئیس خانہ'' کی زبان پر اعتراض کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ کرداروں کو اپنی زبان بولنے کو دیتے ہیں جو شہری تکلفات سے مملو ہوتی ہے اور افسانے کے Natural flow پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ وقاص احمد نے اسی سلسلے میں پریم چند کا حوالہ دیا ہے۔ پریم چند کے کردار اور کرداروں کی زبان بالکل نیچرل ہوتی ہے۔ بہر حال یہ بات درست ہے۔ افسانہ اپنی برادری کی دیگر اصناف...... رپوتاژ، آنکھوں دیکھا حال، آپ بیتی اور سفر نامے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ کرشن چندر جیسا عظیم قلمکار دیگر اصناف میں جو جادو جگاتا ہے اس کے افسانے میں وہ جادو نہیں ملتا۔ ''بالکنی'' آنکھوں دیکھا حال یا آپ بیتی جو چاہو کہو، ایک قابل رشک تحریر ہے۔ اس میں جو

توانائی اور دلآویزی ہے وہ "سانجھے کا مردہ" میں نظر نہیں آتی۔ اس موضوع...... مردہ ٹھکانے لگانے کے مسئلے پر ہیرا آنند سوز کا افسانہ، کرشن سے کہیں بہتر ہے۔ اور پھر پریم چند کا "کفن" تو کلاسیک ہو کر رہ گیا ہے۔ گھیسو اپنی بیوی کی لاش ٹھکانے لگانے میں جس طور نا کام ہوا وہ پریم چند کا کمال ہے۔ بہرحال بات احمد ندیم قاسمی سے چلی تھی، خاصی دور نکل گئی...... احمد ندیم قاسمی اپنے مقابل کسی ہمعصر کا آنا پسند نہیں کرتے۔ وہ Complex میں مبتلا ہے۔

انور سدید: ادب کی موجودہ زوال آمادہ صورت حال کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے، کیا واقعی ادب زوال آمادہ ہے، زوال آمادگی کی وجوہات کیا ہیں۔؟

رحمان مذنب: ادب کی موجودہ صورتحال کے بارے میں عرض کروں گا کہ ادیب پیدا ہو رہے ہیں لیکن قارئین کی تعداد بہت کم ہے۔ بزرگ نسل کے ادیب خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ وہ رہنمائی کے لئے تیار بھی ہیں لیکن نئے ادیب ان سے کتراتے ہیں۔ ادھر ڈائجسٹوں نے مشاعرہ لوٹ لیا ہے۔ ایک ایک ڈائجسٹ ہزاروں کی تعداد میں چھپ رہا ہے۔ ادبی رسالوں کا برا حال ہے۔ کوئی رسالہ ایک ہزار سے زیادہ نہیں چھپتا اور منافع کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ڈائجسٹوں کو بکثرت اشتہار مل جاتے ہیں چنانچہ وہ سستے بھی ہوتے ہیں اور ان کی ضخامت بھی خاصی ہوتی ہے۔ بعض ڈائجسٹ دیو مالائی، جاسوسی اور مہماتی کہانیوں کے ساتھ دو چار افسانے بھی چھاپ دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ادب تو کیا، تمام علوم و فنون تباہ حال ہیں۔ سرکار نے متعدد ادبی اور سائنسی ادارے قائم کئے ہیں لیکن وہاں ادب کی ترویج و ترقی کا کام برائے نام ہوتا ہے۔ ان کے سرپرست پارٹی سسٹم اور ذاتی پسند کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ ریوڑیاں بانٹی جا رہی ہیں، انعامات دیئے جا رہے ہیں لیکن میرٹ کا کوئی سوال ہی نہیں۔ ادبی بوجھ بجھکر لوٹ مار میں لگے ہیں۔ ادھر پبلشر حضرات بھی ادب کے فروغ سے زیادہ ذاتی فروغ میں لگے ہیں، جس کتاب کی لاگت 25 روپے ہو اس کی قیمت 150 روپے رکھ دیتے ہیں، تاجرانہ نرخ پچاس فیصد ہے، کتاب میلوں میں بعض دفعہ اس سے بھی زیادہ کمیشن دیتے ہیں، ادیب / مصنف کو ڈیڑھ سو روپے کی کتاب پر ایک ہزار روپے سے لے کر تین چار ہزار روپے معاوضہ / بخشیش عطا فرماتے ہیں (سنگِ میل، فیروز سنز اور جنگ پبلشرز کے معاوضے معقول ہیں)۔ مقبول اکیڈمی کے معاوضے نیم تسلی بخش ہیں۔ معاوضے لاگت میں شامل

ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب حسن اشرف نے پتلی جان شائع کی تو میرے مشورے سے طے کیا کہ قیمت ایک سو روپے ہو گی لیکن جب ان کے کاروباری ہم عصروں کو پتہ چلا تو انہوں نے کہا ''بازار کا ریٹ مت بگاڑو'' چنانچہ پتلی جان کی قیمت ڈیڑھ سو روپے کر دی گئی۔ بہر حال مہنگی کتب بھی وجہ زوالِ ادب ہیں۔ ادھر تعلیم کی کمی ہے۔ یہی نہیں کہ ملک میں بھانت بھانت کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ تعلیمی انتشار ہولناک ہے۔ پچاس سال سے حکمران تعلیم کا بھٹہ بٹھانے میں لگے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگ انہیں اچھے نہیں لگتے۔ ملک جتنا ان پڑھ ہو گا سیاستدانوں کا اتنا ہی بھلا ہو گا۔ کاغذ، کاپی، قلم دوات گراں سے گراں تر ہوتے جا رہے ہیں۔ پرائیویٹ تعلیمی درسگاہیں مال بنا رہی ہیں۔ فیسیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ کتابوں اور کاپیوں کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہے۔ پانچ پانچ چھ چھ سال کے بچوں کو دس دس بیس بیس سیر کا بوجھ اٹھانا پڑتا۔ یہ پانڈی بچے مبتلائے عذاب ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ علم و ادب ہی زوال پذیر نہیں خود انسان...... پورے کا پورا انسان اور معاشرہ زوال پذیر ہے۔ کرپشن کی ہوا ایسی چلی ہے کہ ہم سب اس کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔ انسان مر گیا ہے۔ ضمیر اندھی ہو گئی ہے۔ پیسہ حاکم بن گیا ہے۔ پیسہ اس غرض سے ایجاد ہوا تھا کہ بارٹر سسٹم کی مشکلات دور کرے۔ اس نے مالک و مختار بن کر قذاق پیدا کر دیئے ہیں جو اپنا ہی گھر لوٹ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہی دیس، اپنی ہی جنت کو جہنم بنا دیا ہے۔ پاکستان جو نعمتِ عظمٰی تھا وہ بڑی بے دردی سے تباہ ہو رہا ہے۔ جان کے لالے پڑے ہیں۔ آزادی کا ثمر خواب بن گیا ہے۔ مدرسہ ہو، کوئی انتظامی ادارہ ہو، ادبی مرکز ہو، لوٹ مار ہو رہی ہے۔ اصل کام نہیں ہو رہا۔

انور سدید: دیہات کے افسانہ نگاروں میں سے پریم چند، احمد ندیم قاسمی، غلام الثقلین نقوی اور جمیلہ ہاشمی کے بارے میں رائے دیجئے؟

رحمان مذنب: یہ چاروں فنکار الگ الگ مقام رکھتے ہیں۔ جہاں تک پریم چند کا تعلق ہے وہ Pioneer ہیں۔ انہوں نے اپنے ہمعصروں اور بعد کی نسل کے افسانہ نگاروں کی رہنمائی کی۔ ان کا افسانہ ''کفن'' لازوال ہے۔ اس افسانے نے تو مجھ میں نئی روح پھونک دی اور چراغ راہ بن گیا۔ ان کا مقام بوجوہ سب سے بلند ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اس ماحول کے بارے میں اچھے افسانے لکھے ہیں۔ غلام الثقلین نقوی دیہی ماحول کے جادوگر ہیں۔ افسانے تو وہ لکھتے ہی ہیں،

بلند پایہ افسانہ نگار ہیں لیکن ناول نگاری میں اس وقت ان کا کوئی مقابل نہیں۔ ''میرا گاؤں'' ان کا لازوال ناول ہے، جس نے گاؤں نہیں دیکھا اور اعلیٰ ادب کا طلبگار ہے وہ ''میرا گاؤں'' ضرور پڑھے۔ گاؤں اجڑ رہے ہیں، مر رہے ہیں۔ شہر کا قُرب اور مغربی کلچر کی یلغار ان کا حلیہ بگاڑ رہی ہے۔ ''میرا گاؤں'' شگفتہ اور جاندار انداز بیاں، سچے اور دلآویز واقعات، سادہ اور جیتے کرداروں کا بہت ہی دلآویز مجموعہ ہے۔ ''میرا گاؤں'' اور بیلز یک کے افسانے پڑھتا رہتا ہوں۔ دونوں کی تازگی اور شگفتہ بیانی مجھے مرغوب ہے۔ غلام الثقلین پختہ قلم ادیب ہیں۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے چھپے ہیں لیکن میرا گاؤں ان سب پر بھاری ہے۔ آخری نام جمیلہ ہاشمی کا ہے، یہ بڑی ذی شعور اور مخلص افسانہ نگار ہیں، افسوس نقادوں نے ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ ان کا کام ناقابلِ فراموش ہے۔ فرصت ملی تو میں ان کے فن اور خوبصورت افسانوں پر ایک مبسوط مقالہ قلم بند کروں گا۔ ان کا نام اول درجے کے فنکاروں میں آتا ہے۔

انور سدید: آپ نے ادب میں طویل زندگی گزاری ہے، کیا کبھی یہ محسوس کیا کہ تخلیق کار کو نقاد کی ضرورت نہیں ہوتی؟

رحمان مذنب: میں **1932**ء سے لکھ رہا ہوں۔ نقاد اور ادیب میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ نقاد بھی اتنا ہی وقیع ہوتا ہے جتنا ادیب ہوتا ہے۔ میں ٹکا ٹوکری نقادوں کی بات نہیں کر رہا۔ مولانا صلاح الدین، خواجہ مشفق، خواجہ زکریا، سہیل احمد خاں، ڈاکٹر انور سدید، غلام جیلانی اصغر، مرزا حامد بیگ، ثروت علی، ڈاکٹر غلام علی، پروفیسر سلیم الرحمان، اعجاز بٹالوی، ریاض احمد ایسے نقادوں کی بات کر رہا ہوں جو ادب کا صحیح شعور رکھتے ہیں، جو فن کی گہرائیوں اور وسعتوں کو جانتے ہیں۔ نقاد...... بڑا نقاد نہ صرف تخلیق کار کا رتبہ اور منصب متعین کرتا، قارئین کو اس کے صحیح مقام سے متعارف کرواتا، اس کے ادب پاروں کے محاسن و معائب کی نشاندہی کرتا بلکہ قاری کے مذاق کو بھی سنوارتا ہے۔ اس کے شعور کو جلا بخشتا ہے۔ جب ادبی تخلیق کار کی پذیرائی ہوتی ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ اسے کام کا معاوضہ مل گیا ہے، وہ مسرور ہوتا ہے۔ تخلیق کار کا خون بڑھتا ہے۔ اس کی قدر و منزلت معلوم کرنا ضروری ہے۔ یہ فطری ضرورت ہے۔ کسی کو سراہنا جائز طور پر سراہنا اسے خراج دینا ہے، اسے نامور کرنا ہے۔

انور سدید: نئی نسل کے لکھنے والوں سے آپ کیا توقعات وابستہ کرتے ہیں؟

رحمان مذنب: آج ہزار کا نوٹ چھوٹا نوٹ ہے۔ پہلے فراغت تھی، فرصت تھی، اب دوڑ دھوپ ہی دوڑ دھوپ ہے۔ تب بے فکری تھی، اب ڈپریشن ہے، ٹینشن ہے۔ معاشرتی و معاشی سرگرمیوں نے (بندے سے اس کا) ایک ایک لمحہ چھین لیا ہے۔ تفریحی اور ثقافتی سرگرمیاں گھر میں، پڑوس میں، یہاں وہاں ہر کہیں ملتی ہیں۔ ڈش نے رت جگا عام کر دیا ہے۔ افسانہ نگار ان تمام مرحلوں سے گزرتا ہے۔ اچھا ہے لیکن اسے لکھنے کا حسبِ ضرورت وقت نہیں ملتا۔ مطالعہ زیادہ، بہت زیادہ درکار ہوتا ہے لیکن کتابیں بہت گراں ہیں۔ لائبریریاں کم ہیں اور وہ بھی کوسوں دور۔ پنجاب پبلک لائبریری میرے گھر سے پانچ میل پر ہے۔ اقبال ٹاؤن میں لائبریری کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ لکھنے کا سلیقہ تو مطالعے ہی سے آتا ہے۔ بے پناہ مطالعہ اور بے پناہ ذہانت کے بغیر کچھ نہیں آتا۔ حلقۂ اربابِ ذوق کبھی عبادت گاہ کا درجہ رکھتا تھا۔ اب خلوص اور سنجیدگی کم ہو گئی ہے۔ اسے قائم رہنا چاہیے۔ یہ نئے اور پرانے ادیبوں، دونوں ہی کے لئے مفید ہے۔ نئی نسل کے ادیبوں کو یاد رہے کہ یہ کام انتہائی دشوار ہے۔ وہ ان بزرگوں سے ہوشیار رہیں جو اپنی لابی کی نفری بڑھانے کے لئے انہیں اتنی داد دیتے اور انہیں اتنا بڑھاتے چڑھاتے ہیں کہ ان کا دماغ بگڑ جاتا ہے۔ میری آرزو ہے کہ نئی نسل کے ادیب آپس میں لڑیں بھڑیں نہیں، گروہ بندی میں حصہ نہ لیں، ایک دوسرے کی ٹانگ نہ کھینچیں۔ ادب بڑا مقدس شعبہ ہے۔ قلم فروشی نہ کریں، قلم سے وفا کریں۔ پاکستان کے ادیب اور دیگر فنونِ لطیفہ سے وابستہ لوگ بڑے بہادر، محنتی، جفاکش اور حوصلہ مند ہیں۔ اگر ترقی یافتہ ممالک کے رائٹر دو چار سال ہمارے ہاں رہ کر، ہمارے حالات میں شریک ہو کر، ہماری طرح مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے ہم جیسا، ہمارے معیار کا ادب پیدا کریں تو میں انہیں سلام کروں گا۔ فی الحال میں اپنے یہاں کے ادیبوں اور فن کاروں کو سلام کرتا ہوں جو رکاوٹوں اور مصیبتوں سے مقابلہ کر رہے، کام کئے جا رہے ہیں۔ نئے لکھنے والوں سے ثابت قدمی کی توقع ہے۔ امید ہے کہ وہ آندھیوں اور بحرانوں کا پامردی سے مقابلہ کریں گے۔

O

حصّہ پنجم

احباب کے خطوط

(انتخاب)

ہمایوں لاہور
27.8.39
محترمی السلام علیکم آپ کا خط ملا۔ غنیمت ہے؟ آپ کو اندازہ

محترمی اسلام وعلیکم۔ آپ کا خط ملا۔ غنیمت ہے، آپ کو اندازہ ہو گیا ہے؟ آپ ایک عرصے سے ہمایوں کو بھلائے ہوئے ہیں۔ بہر حال میں تو آپ کی صحت کے خیال سے یاددہانی کی جرأت بھی نہ کرتا تھا۔ خون کے دباو کا بڑھ جانا واقعی اچھا نہیں، احتیاط کرنی چاہیے، اور کچھ نہیں تو غذا وغیرہ کی احتیاط ہی کیجئے۔ ''ہمایوں'' کے لئے طویل مضامین کی اتنی ضرورت نہیں جتنی ویسے ڈراموں کی جیسے آپ پہلے بھیجتے رہے ہیں۔ اس میں آپ کو بھی نقل کرنے کی زیادہ دقت نہ ہوگی۔ آپ دو تین ویسے ڈرامے بھیج دیں تو آپ کو سال بھر کی چھٹی مل سکتی ہے۔ اگر آپ زیادہ بھیج دیں تو در کار خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست۔ ثواب ہی ثواب ہے۔ آپ کے تاریخی مضمون کا منتظر ہوں۔ ہمایوں کا اصول ہے جب تک پورا مضمون دفتر میں نہ ہو اس کی اشاعت شروع نہ کی جائے۔ طویل مضمون کو آپ نقل کرتے رہیئے، جب پورا نقل ہو جائے، بھیج دیجیے۔ آپ کو مسودے کی نقل کرنے میں جو الجھن ہوتی ہے، بجا ہے۔ آپ کا سا نفیس خط اور صاف مسودہ کسی کا نہیں ہوتا۔ زبان بھی اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں آپ کا کیا شغل ہے اور آپ نے ایسی اچھی زبان کہاں سے سیکھی ہے۔ اپنی صحت کا خیال رکھیے۔ آپ کے خون کا دباؤ کتنا ہے۔ تصور میں آپ کو عمر میں چالیس بیالیس سال سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ تعجب ہے اس عمر میں آپ کو یہ شکایت ہو گئی۔

مولانا حامد علی خاں

(جناب رحمان مذنب کی عمر اس وقت ساڑھے چوبیس برس تھی)

مدیر:-
نور الحسن ہاشمی
ایم۔اے (علیگ)
مکتب ...

نمبر ....
مورخہ ...

جامعہ، دہلی

11.2.1943

محترمی مذنب صاحب۔ اسلام وعلیکم

گرامی نامہ معہ بابِ اوّل ابھی ابھی موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔ ابھی اسے پڑھا نہیں پر دیکھنے کے بعد رائے سے مطلع کروں گا۔

میں آج آپ کو دوبارہ خط لکھنے والا ہی تھا۔ اب آپ پہلے بیورج اسکیم کا قصہ ختم کر ڈالیے۔ اس میں ذیل کی باتیں پیشِ نظر رکھئے۔

اسکیم کیا ہے؟ اس کا منشاومقصد، اسکی اچھائیاں اور خرابیاں۔ شروع میں اسکیم کے مجوزہ بیورج کے کچھ حالاتِ زندگی اور موجودہ پوزیشن۔ ضمناً یہ بھی اب تک اس اسکیم کی کن مدوں پر کام شروع ہوگیا ہے اور کیا ابھی تک اس اسکیم کی وہی قدرومنزلت ہے جو پہلے تھی۔

بیورج کی کتاب 2SR.Gov یہاں کہیں نہیں ملتی۔ میں نے خوب تلاش کر لیا ہے۔ بعض جگہ اس اسکیم پر دوسری کتابیں تھیں لیکن وہ فروخت ہوگئیں۔ میں نے بیورج کے متعلق جن دو کتابوں کا ذکر کیا تھا وہ جامعہ میں نہیں بلکہ اسٹیٹس مینز کے سنڈے ایڈیشن میں نکلی تھیں، غالباً اسٹیٹس مینز کے بجائے میں غلطی سے جامعہ لکھ گیا۔ اکتوبر یا نومبر کے اسٹیٹس مینز (سنڈے ایڈیشنوں) میں آپ کو یہ مل جائے گی۔ یہ سب کتابیں آپ ہی بمبئی سے منگالیں تو زیادہ آسانی رہے گی۔ ہاں ایک بات اور ۸ یا ۹ فروری کا اسٹیٹس مین ضرور دیکھ لیں اسکے آڈیٹوریل میں اس اسکیم کی موجودہ حالت کے بارے میں کچھ لکھا ہے۔

آپ نے انجمن ترقی اردو کی حالتِ زار کا حال سنایا، سن کر افسوس ہوا۔ ریاست میں

سوائے اسکے آپ جیسے علمی لوگوں کو کیا حاصل ہو سکتا ہے لیکن خیر افسوس کی کوئی بات نہیں وہاں تو امید ہی یہی رکھنا چاہیے تھی۔ آپ کا کیا گیا، مضمون کہیں اور کام آجائے گا۔

دسمبر کا جامعہ پریس میں ہے عنقریب پہنچ جائے گا۔ ہمدرد صحت اور پیامِ تعلیم کے پرچے اگر تلاش سے مل گئے تو ضرور حاضر کروں گا۔

میری زندگی فی الحال ذرا مصروفیت کی زیادہ ہو گئی ہے۔ مئی سے تعطیلات ہونگی تب حواس درست ہوں گے، پھر سال بھر کا کام ان تین چار مہینوں میں ختم کرنا پڑ رہا ہے۔ فی الحال بورڈنگ میں ہوں۔ یہاں آج کل یہ حال ہو رہا ہے، نوکری آسانی سے مل جاتی ہے لیکن مکان بدقت بھی نہیں ملتا۔

جواب میں یہ ضرور لکھیے گا کہ آپ بیورج والی کتاب یا کتابچہ کب تک لکھ کر بھیج رہے ہیں۔ میں نے اوپر Synrposis لکھدی اس کے علاوہ اگر آپ کے ذہن میں کوئی اور ہو تو اس سے مطلع کیجئے۔

والسلام ڈاکٹر محمد

ویکلی ٹائمز، دہلی
۲۳/۱

محترمی مذنب صاحب، اسلام وعلیکم

آپ میرے خط کے انتظار میں ہوں گے۔ قصہ یہ ہے کہ آپ کی مطلوبہ کتاب Two Shilling Govt Refer ابھی تک حاصل نہیں ہوئی بلکہ اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ نئی دہلی جا کر اسے تلاش کرتا۔ لیکن تلاش ضرور کروں گا اور اسی ہفتے میں آپ کو مطلع کر دوں گا۔ مگر یہ بات اپنی جگہ بالکل طے ہے کہ آپ کی یہ کتاب ضرور چھپے گی۔ اب آپ اسے مضمون کی صورت میں نہ رکھیے بلکہ کتاب کی صورت دے دیجئے۔ رسالہ جامعہ جیسا کہ خیال تھا اب عاقل صاحب کے سپرد کر دیا گیا ہے اور میری نئی مصروفیتوں کو دیکھتے ہوئے نسبتاً ہلکا کام مکتبہ سے میرے سپرد ہوا ہے یعنی آپ جیسے اربابِ قلم سے کتابیں لکھوانے کا۔

اسلئے سلسلہ بدستور باقی رہے گا۔ اکتوبر یا نومبر میں بیورج اسکیم پر دو کتابیں بعدہ تبصرہ کے نکلی تھیں۔ ان کا شاید میں نے آپ سے ذکر بھی کیا تھا، ان کے نام و پتے آپ کو دارلمطالعہ سے بھجوائیں تو انہیں بھی منگوا لیجئے۔ فقط امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور حلقۂ احباب کی صحبتیں گرم ہوتی ہوں گی۔

دالسلام نورالحسن

نورالحسن ہاشمی

از لاہور

دفتر نیرنگ خیال

مکرمی و محترمی بندہ تسلیم

آپ کا خط ملا، سوم رس ایک طویل ڈراما تھا اور میں ۴ دن لاہور سے باہر بھی رہا۔ بہر حال اسے پڑھنے کے لئے وقت نکالا۔ یہ بہت ہی بلند پایہ اور شاندار چیز ہے۔ میں اس کے مطالعہ سے بہت خوش ہوا ہوں۔ یہ پہلے ڈرامہ سے بھی بہتر ہے۔ ایسی اچھی چیز صرف سالنامہ میں چھپنی چاہیئے۔ چنانچہ میں اس کو سالنامہ ۴۷ کے لئے محفوظ کر رہا ہوں اور اتنی طویل چیز درج بھی سالنامہ میں ہو سکتی ہے۔

اس سے پہلے ڈراما نرتکی عید نمبر کی زینت ہوگا۔ نرتکی کتابت کے لئے دے دیا ہے۔ اس طرح سے آپ کی یہ دونوں مرسلہ چیزیں دو خاص نمبروں کی زینت ہوں گی۔

والسلام

24-6-46

حکیم یوسف حسن

TELE. ZAMINDAR. PHONE. 3289

THE DAILY
ZAMINDAR
THE VIOCE OF PAKISTAN
ESTD 1903 PAKISTANS OLDEST DAILY WITH ADMITTEDLY LARGEST CIRCULATION

Lahore (PAKISTAN) 22/8 1949

حضرت المحترم رحمان مذنب صاحب

اسلام وعلیکم۔ روزنامہ زمیندار کا ''قائداعظم'' نمبر زیرِ ترتیب ہے۔ اس اشاعت کو حضرت قائداعظم مرحوم ومغفور کی شان کے شایان بنانے کے لئے ادارہ زمیندار آپ کے تعاون کا خواستگار ہے۔ ازراہ نوازش یکم ستمبر ۴۹ء تک کوئی تازہ مقالہ، افسانہ یا نظم ارسال فرما دیجئے تاکہ بروقت شریکِ اشاعت ہو سکے۔ یہ ضروری نہیں کہ نظم ونثر قائداعظم یا مسلم لیگ کے ہی متعلق ہو بلکہ آپ اپنی پسند کے مطابق کسی بھی علمی، ادبی یا تنقیدی، تحقیقی موضوع کو منتخب فرما سکتے ہیں۔

آپ کی خدمت میں مضمون چھپنے پر زمیندار کی مقررہ شرح کے مطابق مناسب معاوضہ بھی پیش کیا جائے گا۔ گنجائش چونکہ محدود ہے اس لئے ازراہ کرمائی اس بات کا خیال رہے کہ مضمون یا افسانہ اندازۃً دو کالم (ڈیڑھ ہزار الفاظ) ہو۔

امید ہے آپ جلد سے جلد توجہ فرمائیں گے اور نہ صرف قائداعظم نمبر کے لئے بلکہ سنڈے ایڈیشن کی قسمت علمی وادبی کے لئے بھی مضامین نظم ونثر بھجوا دیں گے۔

نیازکیش
عبدالرحیم شبلی
مدیر سنڈے ایڈیشن

حضرت مکرم، سلام مسنون

لاہور میں آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اس کا افسوس ہے۔ صبوحی صاحب نے مجھے آپ کا نادیدہ گرویدہ کر دیا۔ اکتوبر کے آخر یا نومبر کے شروع میں لاہور آنے کا ارادہ ہے۔ انشاءاللہ ضرور ملاقات ہوگی۔

ساقی کی یہ بڑی حق تلفی ہے کہ آپ حضرات اسکی طرف توجہ نہ فرمائیں۔ توقع تھی کہ آپ جوبلی نمبر کی رسید سے مطلع فرمائیں سو اس سے بھی محروم رہا۔ اس قدر تو مجھے اور ساقی کو نظر انداز نہ فرمایئے! مجھے فروری سے اب تک یہی معلوم نہ ہو سکا کہ ساقی آپ کو پہنچ بھی رہا ہے یا نہیں۔ دیال سنگھ کالج کے پتہ سے بھیجا جاتا ہے۔

صبوحی صاحب نے لکھا ہے کہ آپ نے انگریزی کے کسی عمدہ افسانے کا ترجمہ کیا ہے۔ ساقی کا ایک خاص نمبر زیرِ ترتیب ہے جس میں دنیا کے بہترین افسانوں کے تراجم شامل کئے جائیں گے۔ یہ ذرا بڑا کام ہے اور اس میں کچھ وقت لگے گا۔ اس لئے ابھی اس کی تاریخِ اشاعت کا تعین نہیں کیا ہے۔ تاہم امید ہے کہ چھ مہینے میں متوقع افسانے ترجمہ ہو کر جمع ہو جائیں گے۔ یہاں کتابیں نہیں ملتیں کہ افسانے تراش کر مترجمین کو بھیج دیئے جائیں۔ آپ اپنا ترجمہ تو عنایت کر دیں۔ پرچہ (۶۰۰—۷۰۰) صفحے کا ہوگا، اس لئے اسکی کتابت ایک مہینے بعد شروع کرا دوں گا۔

اچھا صاحب، ایک بات کا تو پتہ چلا دیجئے:

میں نے پرنسپل عابد علی صاحب کو ایک مختصر افسانے کا تراشہ رجسٹری سے کالج کے پتہ سے بھیجا تھا۔ اس کے دس بارہ دن بعد قیوم نظر صاحب سے ان کے گھر کا پتہ معلوم کر کے بھی ایک

خط لکھا تھا جس کا جواب نہیں ملا۔ کیا آپ زحمت فرما کر مجھے معلوم کر دیں گے کہ وہ افسانہ عابد علی صاحب کو ترجمہ کرنے کے لئے پسند آ گیا یا نہیں؟ اور اگر پسند آ گیا ہے تو کب تک اس کا ترجمہ مجھے بھیج دیں گے؟ یہ افسانہ بھی اسی خاص نمبر کے سلسلے کا ہے جس کا تذکرہ میں کر چکا ہوں۔

دسمبر کے آخر میں حسب دستور ساقی کا سالنامہ ۶۵ء شائع کرنا ہے۔ اس کے لئے آپ کیا عنایت فرمائیں گے،

مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں؟

ازراہ کرم مفصل خط لکھئے۔

بنر

شاہد احمد دہلوی

Telegram : SERAJCO

GUL-I-KHANDAN

A MONTHLY LITERARY JOURNAL WITH A DIFFERENCE

Publishers
M. SIRAJ-UD-DIN & SONS
Phone : 2069

KASHMIRI BAZAR, LAHORE

Ref. ________

Dated ________

محترمی رحمان مذنب صاحب

سلام مسنون! ماہنامہ گل خنداں کا تازہ شمارہ یعنی جدید غزل نمبر ارسال خدمت ہے۔ فیصلہ کیا گیا ہے کہ سال میں خاص بارہ نمبر شائع کئے جائیں۔ ان کی تفصیل علیحدہ کتابچہ میں درج ہے۔ کتابچہ بھی ارسال خدمت کیا جارہا ہے۔ آپ سے قلمی معاونت کی توقع ہے۔

امید ہے کہ اس نوازش سے دریغ نہیں فرمائیں گے۔ یہ ہم پر احسان بھی ہوگا اور اردو کی خدمت بھی!

ایڈیٹر

سید عابد علی عابد

51-B گلبرگ II، لاہور

30/8/93

برادر بجان برابر! آپ پر رحمت سلامت

آج ایک عرصہ کے بعد جواب لکھنے بیٹھا ہوں، وجہ اس کی یہ تھی کہ آپ کا گرامی نامہ کاغذات میں کہیں کھو گیا تھا اور آپ کا پتہ مجھے یاد نہ تھا، پھر بوجہ Food Poisioning بیمار پڑ گیا۔ داخل ہسپتال رہا۔ 2، 3 ماہ حال کو آیا۔ ابھی تک Conralescent ہوں۔

آج کاغذات میں آپ ہی آپ آپ کا گرامی نامہ اور اس پر آپ کا پتہ دستیاب ہوا چنانچہ جھٹ پٹ خط لکھنے بیٹھ گیا کہ کہیں پھر کوئی روک نہ آ جائے۔

یقین کیجئے میں آپ کا دیرینہ چاہنے والا ہوں۔ زبان و بیان آپ کے عظیم خانوادہ کی خصوصیت ہے۔ شمس العلماء پروفیسر مولانا عبداللہ ٹونکی کا نام نامی ہی آپ کے لئے بہت بڑی سعادت اور امتیازی سند ہے۔ آپ کا سدا بہار قلم خوب سے خوب تر کی تلاش میں "گل نئے، گلبدن نئے سے نئے" کا عکاس ہے۔ فی الحقیقت مجھے تو ہمہ وقت ایک انجانا خوف سا دامن گیر رہتا ہے کہ اپنی بے بساعتی کے باعث آپ سے یارائے سخن نہیں۔

ہمارے ادب میں آپ کا مقام ہے اور جس موضوع کو بھی آپ اپناتے ہیں اسے کماحقہ نبھاتے ہیں۔

امید ہے آپ بخیر ہوں گے اور نئی علمی فتوحات میں شب و روز منہمک ہوں گے۔ میری حالت اس پنساری کی سی ہے جس کے پاس نہ تو مال ہے اور نہ ہی وہ وقت پر دکان کھولتا ہے، ایسے میں یافت معلوم!

عزیزان کو دعائیں، بھاوجہ صاحبہ کو تسلیمات و آداب

نیازکیش

عنبر رحمانی؟

فون ۲۰۷۳

یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

ڈاکٹر سید عبداللہ

ایم اے، ایم او ایل، ڈی لٹ

پرنسپل و یونیورسٹی پروفیسر (اردو)

صدر شعبہ اردو و عربی

سپرنگ فیلڈ ایبٹ آباد

سپرنگ فیلڈ ایبٹ آباد

۲۷ جولائی ۱۹۶۴ء

مکرمی و محترمی اسلام وعلیکم

برقاب برابر مل رہا ہے اور ہر بار پہلے سے بہتر آب وتاب کے ساتھ منظرِ عام پر آتا ہے۔ میں نے مناسب خیال کیا کہ آپ کو اور آپ کے عملے کو اپنے احساسات سے آگاہ کروں۔ آپ نے یہ پرچہ اردو میں نکال کر بہت بڑی خدمت کی ہے۔ اس سے عام آدمیوں کو ان سرگرمیوں کا علم ہو جاتا ہے جو ترقیات کے سلسلے میں انجام دی جا رہی ہے۔

بہرحال مبارکباد قبول کریں۔

والسلام

نیازمند

سید عبداللہ

ڈاکٹر وزیر آغا

از وزیر کوٹ۔ سرگودھا

۱۶ اپریل ۵۷ء

برادرم

آپ کا خط ملا۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس روز آپ نے یہ خط لکھا، میں لاہور ہی میں تھا لیکن چونکہ مجھے آپ کی قیام گاہ کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا اور ان ایام میں کوئی ایسی ادبی نشست کا بھی اہتمام نہیں تھا جہاں آپ آتے، اس لئے ملاقات نہ ہو سکی۔ دل بہت چاہتا تھا اور اب بھی چاہتا ہے کہ کوئی صورت نکل آئے لیکن آپ نے یہ لکھ کر مایوس کر دیا ہے کہ آپ نے وزیر کوٹ آنے کا پروگرام بھی منسوخ کر دیا ہے۔ میں خود غالباً مئی کے آغاز میں لاہور آؤں گا۔ اس سے قبل اگر پروگرام بن گیا تو آپ کو مطلع کر دوں گا لیکن اگر اس دوران میں آپ یہاں آسکیں تو کیا بات ہے۔ میرا مطلب ہے اگر آپ کو اکیلے بھی آنا پڑے تو کوشش کیجئے! یہاں پہنچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ لاہور سرگودھا بس پر سوار ہو کر لالیاں سے تین میل آگے اڈہ چک ۴۶ پر اتریئے جہاں سے وزیر کوٹ کے لئے تانگے مل سکتے ہیں۔ اگر آپ اپنی آمد کی اطلاع بذریعہ تار دیں تو میں یہاں سے سواری بھجوا دوں گا، بہر حال کوئی مجبوری نہیں۔ اپنی آسانی اور فرصت کو ملحوظ رکھ کر کوئی پروگرام تشکیل دیجئے۔

آپ کا خط مجھے سات روز کے بعد ملا ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ آپ نے لفافے پر ''براستہ لالیاں'' لکھ دیا تھا۔ اس طرح یہ خط پہلے جھنگ چلا گیا اور وہاں سے سرگودھا آیا۔ میرا پتہ پوسٹ آفس وزیر کوٹ ضلع سرگودھا کافی ہے۔

کہیئے آپ نے اس دوران میں کیا کچھ پڑھا اور کیا کچھ لکھا؟ میں نے تو ایک مقالہ لکھا ہے جو ادبِ لطیف کے مئی کے شمارے میں شائع ہوگا۔ اس کے علاوہ دو ایک نظمیں لکھی ہیں۔ اب لکھنے کو جی چاہ رہا ہے۔ کچھ فرصت بھی ہے۔ انشاء اللہ اب کام شروع کر دوں گا۔ میری کتاب

''اردو ادب میں طنز و مزاح'' کتابت کے مراحل طے کر چکی ہے۔ امید ہے جون میں چھپ جائے گی۔ البتہ شمس آغا کی کتاب ''اندھیرے کے جگنو'' چھپ چکی ہے۔ میرے پاس ابھی کچھ نسخے نہیں پہنچے۔ جب پہنچ گئے تو آپ کی کاپی ملحوظ رکھوں گا۔

سرگودھا میں میاں محمد شفیع ڈپٹی کمشنر نے ''سرگودھا اکیڈمی'' قائم کی ہے جس کے پاس تقریباً بیس ہزار روپے کا سرمایہ ہے اور جس کا مقصد ملک کے کلچر، آرٹ اور لٹریچر کی خدمت ہے۔ اس کے زیرِ اہتمام تنقیدی مجالس بھی منعقد ہوں گی اور باہر سے مقالہ نگاروں کو بھی بلایا جائے گا جو بعض خصوصی اجلاس میں اپنے مقالے پڑھا کریں گے۔ کسی روز آپ کو بھی تکلیف دیں گے۔ بہر حال آپ اس نئے سلسلے کو پسند کریں گے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ معمولی سے معمولی اقدام جو اردو ادب، زبان کی ترویج و ارتقاء کے لئے مفید ہو، قابلِ تحسین ہے کیونکہ اس وقت حکومت کی بے اعتنائی کے باعث اردو زبان اور ادب کو چند بڑے خطرات کا سامنا ہے اور اس وقت انفرادی کوششوں سے ہی ہم کچھ کر سکتے ہیں۔

آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ ایسی باتیں جو صرف آپ ہی سے کی جاسکتی ہیں۔ فی زمانہ لوگ باگ محض سطحی اور سیاسی قسم کی باتوں میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ آپ کے پاس بیٹھ کر اور باتیں کہہ سن کر سیرابی کا احساس ہوتا ہے اور روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔

فقط والسلام

مخلص

وزیر آغا

مکان نمبر ۲۲، گلی نمبر ۳۲، ایف ۶/۱،

اسلام آباد

مورخہ ۶ مارچ

رحمان مذنب، آج تمہارا خط ملا تو میں حیران رہ گیا، یہ کیسے ہوا۔

دراصل میں تمہارا پرانا مداح ہوں۔ کئی بار سوچا کہ تمہیں لکھوں، لوگوں سے پتہ پوچھتا رہا، کسی نے نہ بتایا۔ آخر کار منشا یاد نے اکتا کر کہا، لکھو "رحمان مذنب، لاہور" خط مل جائے گا۔

ایک دن ضیاء نے کہا رحمان مذنب کو اردو ڈائجسٹ کی معرفت لکھو۔ مجھے یہ بات پسند نہ آئی، رحمان مذنب اور اردو ڈائجسٹ میں (میرے نزدیک) کوئی قدر مشترک نہ تھی۔

پھر ایک دن خیال آیا سدید کو ضرور پتہ ہوگا۔ لکھنے کے لئے کچھ تھا نہیں، صرف تجھے سلام کرنا تھا سو کر دیا۔ اس بات کو کئی ایک مہینے گزر گئے۔ میں بھول گیا کہ سدید کی معرفت سلام بھیجا تھا۔ آج تمہارا خط دیکھ کر حیران رہ گیا، خوشی بھی ہوئی۔

اللہ تیرے قلم کو مزید رنگ عطا کرے، تو ہمیشہ خوش رہے۔

ممتاز مفتی

میرزا ادیب

فون: ۲۱۳۵۴۸

کاشانۂ صحرا، چتران روڈ۔ اسلام پورہ۔ لاہور

میرے پیارے بھائی

سلام محبت آپ کی خدمت میں

آپ کا خط میرے سامنے پڑا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔

دل کی گہرائیوں سے شکرگزار ہوں۔ کالم دے دیا ہے، دیکھئے کب چھپتا ہے۔ میں آپ پر تفصیلی مضمون لکھنے کا آرزومند ہوں۔ کم از کم آپ کے افسانوں کے حوالے سے یہ سمجھتا ہوں کہ پورے اردو ادب میں آپ پہلے شخص ہیں جس نے تیسری جنس پر اس قدر گہرے مشاہدات کے ساتھ لکھا ہے۔ آغا بابر تو بعد میں آئے ہیں مگر سچی بات یہ ہے کہ آپ کے مشاہدات آپ ہی کے مشاہدات ہیں اور پھر آپ کے کرداروں کا تو جواب ہی نہیں۔

خدایا آپ اپنے افسانوں کو کتابی صورت میں لایئے، کسی روز گزارش کروں گا کہ اپنے افسانوں کی فوٹو کاپیاں عنایت فرمائیں

تمہارا

میرزا ادیب

۳۱.۱۰.۸۹ء

عرضِ مدیر

مجیب الرحمٰن شامی

ہمیں خوشی ہے کہ قومی ڈائجسٹ کا پندرھواں سالنامہ جو "بہترین افسانہ نمبر" کی صورت میں شائع ہوا۔ قارئین نے بہت پسند کیا اور ہمیں اپنی آراء سے مطلع فرمایا۔ چند خطوط اوپر پیش کئے گئے ہیں۔

قومی ڈائجسٹ شمارہ جون کے سروے کے بموجب قارئین کے پسندیدہ ترین افسانے بالترتیب درج ذیل ہیں:۔

محبت کے تیور (رحمان مذنب)	اول
بخت مارے (انتظار حسین)	دوم
چبھن (احمد ندیم قاسمی)	سوم

شیش محل کتب گھر۔ شیش محل روڈ۔ لاہور

برادرم السلام وعلیکم

یہ جو اتنے سارے بکھیڑے میں نے پھیلا رکھے ہیں، سب دوستوں کے سہارے ہیں، مگر جب آپ جیسے پرانے دوست بھی میرے ساتھ یہ سلوک کریں گے تو میری ناکامی یقینی ہے۔

اب براہ کرم یہ رقعہ دیکھتے ہی فوراً اپنا گراں قدر مضمون عنایت کیجئے۔ رسالے کی کتابت شروع ہو چکی ہے۔ دس تاریخ کو پریس چلا جائے گا۔ پہلے شمارے کے اشتہار میں آپ کا نام دیا جا چکا ہے۔

ممکن ہو تو ابھی ایک روز کی چھٹی لے کر گھر چلے جایئے۔ موسم اچھا ہے، فائلوں میں گھرے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اٹھیئے، قلم کاغذ سنبھالئے اور اپنے خیالات خوبصورت لفظوں میں مقید کیجئے۔

افضل پرویز

K/180 کمیٹی محلہ راولپنڈی

5/5/87

خاں صاحب

اسلام وعلیکم ۔ ہن ای ''پنجابی ادب'' ملیا اے۔ اہدے نال ای رحمان مذنب صاحب میرے کول آ گئے نیں ۔ تسی اوہناں نوں جاندے ای او۔ بڑے سینئر ادیب، محقق تے کہانی کار نیں پر درویش بندے نیں۔ بڑی مشکل نال ٹی وی والیاں نے اوہناں نوں راضی کر کے پنجابی ڈرامے لکھوائے نیں۔ پنجابی دے سیوا وی اوہناں نے بڑی کیتی اے۔ اینہاں نوں قابو کرو۔ بورڈ لئی وی کجھ لکھن۔ میرے بڑے ای گوڑھے بیلی نیں۔ اینہاں نوں بورڈ دیاں کتاباں وی (کہندا سائیں سنے) دے دیو۔

تہاڈا افضل پرویز

(جناب افضل پرویز کا ایک مکتوب پنجابی ادبی بورڈ کے نام)

مکان نمبر 28۔ ہمایوں اسٹریٹ نمبر 100
کرشن نگر (اسلام پورہ)، لاہور
12/2/92

محترمی رحمان مذنب صاحب، سلام مسنون۔

آپ کو یقیناً میرا خط دیکھ کر تھوڑی بہت حیرانی ہوگی کیونکہ آپ کے نام یہ میرا پہلا خط ہے۔ اصل میں ہوا یوں کہ میں نے حال ہی میں آپ کے افسانوں کے دونوں مجموعوں ''رام پیاری'' اور ''بالا خانہ'' کا مطالعہ کیا ہے۔ ویسے تو آپ کی کہانیاں پہلے ہی پڑھ چکا ہوں۔ بہر حال کتابی صورت میں ان سب افسانوں کا مطالعہ بھی پہلی بار کیا۔ ''بالا خانہ'' میں آپ نے ''میری بات'' کے حوالے سے جو پس منظر بیان کیا ہے وہ میرے لئے بالکل نئی معلومات ہے۔ اس سے آپ کے فن کی صداقت کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔ میں آپ پر کچھ لکھنے کا پختہ قصد کر چکا ہوں۔ ''تیلی جان'' میں نے کچھ عرصہ پہلے پڑھا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک مکمل فن پارہ ہے۔ آپ کو زحمت یہ دینا چاہتا ہوں کہ مجھے ''تیلی جان'' کے بارے میں بتائیں کہ اس کی نقل کہاں سے مل سکتی ہے۔ اگر یہ اس سے پہلے کسی افسانوں کے مجموعے میں شائع ہوا ہے تو مجھے افسانوں کے مجموعے کا نام اور ناشر کا نام لکھ بھیجیں، میں حاصل کر لوں گا۔ اگر مجھے ''تیلی جان'' اور طوائف کے موضوع پر اپنے دیگر افسانوں کی فوٹوسٹیٹ فراہم کر دیں تو میں بے حد شکر گزار ہوں گا۔

امید ہے آپ مجھے جواب سے نوازیں گے۔

والسلام
ستار طاہر

ستار طاہر

Government of India
ALL INDIA RADIO, DELHI.

No. 9/WC/X-2 Dated.
DEC 7

Rahman Muznib Esq.,
Khoaspura,
Shahjahan Abad,
Bhopal.

Dear Sir,

We are glad to inform you that we intend scheduling your play "Muqaddas Pyala" in our Women's Programme in the second fortnight of January.

Kindly let us know by the 15th December, 1942 if a Royalty of Rs.15/- is acceptable to you for it.

Yours faithfully,

S. N. Ch...

~~DIRECTOR OF PROGRAMMES.~~
FOR STATION DIRECTOR.

S.A.7/12

ALL INDIA RADIO
GOVERNMENT OF INDIA

TELEGRAMS AIRVOICE
TELEPHONE 11131 (4 lines)

Queen's Road
BOMBAY

Ref No T-4(CD)/10764

Date 9 AUG 1944

A.Rahman Muznib Esqr.,
M.D.Meat Factory,
DELHI CANTT.

Dear Sir,

Kindly refer to your letter of the 16th instant. Herewith we enclose a copy of your play "Omar - i - Khyyam" We have no objection to its publication in a periodical - provided due acknowledgement is made to the effect that the play has been broadcast from the Bombay Station of All India Radio and is being published with the permission of the - Station Director.

Yours faithfully,

Vishwa Mitra
For Station Director.

Encl: 1

DRM/8.8.44

Bahari Naghma.

ALL INDIA RADIO
GOVERNMENT OF INDIA

TELEGRAMS AIRVOICE
TELEPHONE 31031 (4 lines)

Queen's Road
BOMBAY

Ref No PBT G-23(a)/2967

Date 25 MAY 1943

Mr. A.Rahman Muznib
Khawaspura
Shah Jehanbad
Bhopal.

Dear Sir,

With reference to your letter dated the 10th May '43, we have to thank you for your permitting us to broadcast your songs. Please sign and return the accompanying form at your earliest convinience.

Regarding your suggestion to broadcast these songs in a bunch and in one sitting, we regret it would not be possible to do so. We will however arrange the songs in pairs and get them sung by our artists in the usual way.

The date, time and the name of the artist will be intimated to you in due course.

Yours faithfully,

Shah
for Director

enclosure:-
AIR 98.

RDG.24.5.

Government of India.,
All India Radio, Delhi.

No. 6/D/K Dated. 28-10-42

A. Rehman Muznib Esq.,
Khavaspura,
Shajahanabad,
Bhopal.

Dear Sir,

Your kind letter of the 16th instant.

We are grateful to you for giving us the opportunity of seeing your script entitled "Muqaddas Piyala" which has received due consideration.

We are glad to inform you that we may include it in our programmes provided you are agreeable to certain modification which are necessary to make it suitable for the microphone.

May we request you kindly to send us a copy of the original play in English of which this is an adaptation.

Yours faithfully,

L. N. Chopra

DIRECTOR OF PROGRAMMES
FOR STATION DIRECTOR.

Mehra. 28-10.

express Delivery

(13)

OFFICE OF THE STATION DIRECTOR
ALL INDIA RADIO, LAHORE.
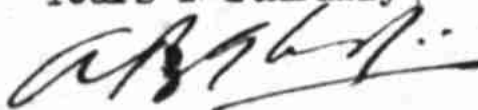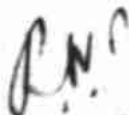
NO. 4862. 25 AUG 1943 27-8

A,Rehman Muznib Esq,
Khawaspura Shahjahanabad,
Bohpal.

Dear Sir,

This is to inform you that we are broa-dcasting your play""Qmar Khayyam" on 28th Augus 1943, at 9.45.p.m.

Yours faithfully

Director of Programmes
for STATION DIRECTOR.

رحمان مُذنب کے چند خوابیدہ خطوط

(ڈاکٹر انور سدید کے نام)

رحمان مذنب سے میری شناسائی اس زمانے سے ہے جب ہم دونوں مظہر انصاری دہلوی کے دورِ ادارت میں ''ہمایوں'' میں افسانے لکھتے تھے، ان سے قربت کا شرف اس وقت حاصل ہوا جب سرگودھا سے ''اردو زبان'' جاری کیا گیا اور کچھ عرصے کے لئے عملی طور پر اس کا بارِ ادارت مجھ پر ڈال دیا گیا۔ یہ **1967**ء کا زمانہ تھا۔ اب **1992**ء جا رہا ہے لیکن اس ربع صدی میں ہمارے تعلق خاطر میں کمی کبھی نہیں آئی۔ سرگودھا، فیصل آباد اور کوٹ ادو کے قیام کے دوران رحمان مذنب نے مجھے متعدد خطوط لکھے۔ یہ خطوط نہیں ادبی مقالے ہیں اور ان میں رحمان مذنب کا منفرد نقطۂ نظر ہی موجود نہیں اس دور کی تاریخ بھی سما گئی ہے۔ رحمان صاحب طویل خطوط لکھتے ہیں۔ میں نے ''اوراق'' کے لئے ان کے صرف تین خطوط منتخب کئے ہیں۔

....

لاہور، **21** فروری **1973**ء

برادرم انور سدید، سلام مسنون۔

مزاج گرامی؟ آپ کا خط ملا، اردو زبان کا شمارہ ملا۔ خط اور رسالہ دونوں میں آپ ہی براجمان ہیں۔ رسالے کے ضمن میں آپ نے میری رائے طلب کی ہے۔ صاحب! اردو زبان میں آپ جس مشن کی تکمیل میں یکاوتنہا مصروف ہیں اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ

لاریب تاریخی کردار ادا اور حریفانِ نکتہ شناس کا قبلہ درست کر رہے ہیں۔ یہ کام کٹھن بھی ہے اور آپ کی طبیعت کے خلاف بھی لیکن ضروری اور اہم ہے۔ آپ تو جنگی سطح پر کام کر رہے ہیں۔ اگر ادبی محاذ گالی گلوچ سے پاک رہے اور علمی وفنی جہت سے گفتگو ہو تو یہ کارِ خیر ہوگا اور نئی پود کی خدمت بھی ہوگی۔ سانڈوں کی لڑائی نہیں ہونی چاہیے جس سے کھیت کھلیان اجڑ جائیں۔ فاؤل کھیل سے تو صرف بدمزگی اور نفرت پیدا ہوگی۔

بزرگانِ علم وادب میں پہلے بھی جنگیں ہوئی ہیں۔ تیس کی دہائی کے اوائل میں دلی اور لاہور کا زبردست ٹاکرا ہوا۔ نیرنگ خیال اور ساقی محاذ بنے۔ بات امتیاز علی تاج کے ڈرامے ''انارکلی'' سے چھڑی۔ ابتداء فنی تنازع سے ہوئی۔ دونوں طرف پارٹیاں بن گئیں۔ لاہور میں امتیاز علی تاج، ڈاکٹر تاثیر، سالک اور چند بلند پایہ لوگ یکجا ہوئے اور انہوں نے ''نیامیدان لاہور'' کی طرح رکھی۔ اسی طرح ''ساقی'' کے فنکار بھی اکٹھے ہوگئے۔ ابتدا میں علمی بحثیں ہوئیں۔ بڑے بڑے نکات اور حوالے پیش کیئے گئے۔ پہلے تو یہی مسئلہ تھا کہ ڈراما نگار کو مغل بادشاہ اکبر کے حوالے سے تاریخ کو کہاں تک مسخ کرنے اور نظریۂ ضرورت کے تحت اسے توڑنے اور مروڑنے کا اختیار ہے، پھر بتدریج بدمزگی پیدا ہونے لگی۔ جب لاہور کے کوچبانوں اور لکھنؤ کی بھٹیارنوں کی زبان استعمال ہونے لگی تو بحث بند کردی گئی۔

اس ادبی وعلمی معرکے سے اہلِ ذوق نے حظ بھی اٹھایا اور بہت کچھ سیکھا بھی۔

میری آرزو ہے کہ لاہور اور سرگودھا کے درمیان جھگڑا علم وادب کا ہو، ذاتی نہیں، دھڑے بندی شخصی مفادات کی غرض سے ہو تو اس سے کسی کا بھلا نہیں ہوتا۔ ادب کے طالبِ علم کو اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔ لڑنے جھگڑنے سے ہار جیت کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو اپنا قد اونچا کرنا ہو تو اسے اپنی تخلیقی صلاحیت اور اپنی تخلیقات ہی کا سہارا لینا پڑے گا۔ آنے والے مورخ اور اپنے عصر کے نقاد علم وادب کی Yard Stick سے قد ناپتے ہیں، دوسرا کوئی ذریعہ نہیں۔ زور آزمائی تو ہوتی ہے لیکن لٹھ سے نہیں، قلم سے، علم سے، دلیل سے۔

آپ کی کنٹری بیوشن کا قابلِ قدر پہلو یہ ہے کہ وہ ادیب اور شاعر جو دھڑے بندی اور عصبیت کے باعث نمایاں ہونے سے رہ گئے ہیں، آپ نے انہیں پہچانا، انہیں لائم لائٹ میں

لا رہے ہیں۔ کتنے ہی ایسے ادیب اور شاعر ہیں جنہیں نظر انداز کیا جا رہا تھا، آپ نے ان پر مضامین لکھے، آپ کی وساطت سے انہیں وہ مقام ملا جسے دوسرے دھڑے کے لوگ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بلیک آؤٹ کر رہے تھے۔ بلیک آؤٹ کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔

''اردو زبان'' کا وجود غنیمت ہے، جن کی حق تلفی ہوئی یا ہو رہی ہے ان کی تلافی ہو رہی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے ہمنواؤں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔

بزرگوں کا یہ فرض ہے کہ نوجوانوں کی تربیت کریں۔ ان کے سامنے اچھی مثال پیش کریں، اچھی روایت قائم کریں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو یہ ہمارے حق میں برا ہوگا۔ تاریخ کا فیصلہ ہمارے خلاف جائے گا۔

آپ کا اپنا

رحمان مذنب

....

لاہور...... 11 دسمبر 1975ء

برادرم انور سدید، سلام مسنون،

مزاجِ گرامی؟ خاصی مدت سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی نہ نصف ملاقات۔ میری طرف سے ملاقات کی کوشش اور خواہش کا قصور نہیں۔ انجینئرز ایسوسی ایشن کے صدر صاحب نے مجھے ایک کتابچے کے ترجمے کا کام سونپا تھا۔ آپ کو اس ضمن میں یاد کرتے تھے لیکن فوری طور پر پتہ نہ چل سکا کہ آپ کہاں تعینات ہیں؟ آپ ٹھہرے سیلانی، چلتی پھرتی ملازمت ہے۔ چار کھونٹ کا دورہ ہے۔ آپ کو کون پکڑے۔

سنا ہے، آپ ''اردو ادب کی تحریکیں'' پر کام کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کام اعلیٰ پائے کا ہوگا اور علم و ادب کا ڈھیر سارا سرمایہ ایک جگہ اکٹھا ہو جائے گا۔ امید واثق ہے کہ ''حلقہ اربابِ ذوق'' کا مفصل ذکر ضبطِ تحریر میں آئے گا جس سے بہتوں کا بھلا ہوا۔ حلقہ اربابِ ذوق مجھ ایسے کتنے ہی دیوانوں کی کمزوری ہے کیونکہ یہ کئی عشروں تک ہماری توانائی کا ذریعہ چلا آ رہا ہے۔ اس کا ذکر ہو تو

یوں لگتا ہے جیسے درخشاں سحر طلوع ہوئی ہے اور تازہ پھولوں کی خوشبو کا دھارا پھوٹ پڑا ہے۔

نصف صدی سے زائد مدت کی بات ہے تب موری دروازے سے باہر جہاں نہاری کی دکان ہے وہاں باغ تھا۔ پہلو میں سرکلر روڈ تھی۔ یہیں چوک میں ایس۔ پی کے۔ایس ہال کی سرخ عمارت تھی۔ ہر اتوار کی صبح اس میں حلقہ اربابِ ذوق کا جلسہ ہوتا۔ ایک روز میں ادھر سے گزرا تو اربابِ حلقہ اجلاس سے فارغ ہو کر ہال سے باہر آ رہے تھے۔ اس میں شیر محمد اختر بھی شامل تھے۔ مجھے گزرتے دیکھ کر میری جانب آئے، سلام سے نوازا اور روک لیا۔ بولے ''کدھر کے ارادے ہیں؟''

''چوک تک جا رہا ہوں، ساقی خریدنا ہے۔''

''تو چلیے، چار قدم آپ کے ساتھ بھی چلتا ہوں۔''

میرے ساتھ چل پڑے، راستے میں حلقہ ارباب ذوق کی مدح سرائی کرتے رہے، پھر بولے ''اتوار کے دو تین گھنٹے خوب گزر جاتے ہیں، آپ بھی آیا کریں۔''

''سنا ہے یہاں ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچی جاتی ہے۔''

''یہ خبر کسی ایسے بندے نے اڑائی ہے جس کی ٹانگ ہی نہیں۔ کبھی کبھار کسی نے کوئی یبوست توڑ جملہ کس دیا تو اور بات، ورنہ کھنچائی والی بات غلط ہے۔''

اس دعوت کا مجھ پر کچھ اثر تو ہوا لیکن فرصت کا ایک ایک لمحہ لکھنے پڑھنے اور زندگی کا مطالعہ کرنے میں صرف ہوتا۔ باقاعدہ شرکت کا دور 1950ء کے لگ بھگ شروع ہوا۔ اس مرتبہ انجم رومانی کی تحریک و ترغیب شامل تھی۔ شرکت میں بے پایاں لطف ملا۔ باور کیجئے کہ حلقے میں شریک ہونا بڑے اعزاز کی بات تھی۔ میں اس کا فعال رکن تھا جسے کبھی کبھی مجلسِ عاملہ میں بھی شامل کیا گیا۔

اتوار کو دوپہر کھانے کے بعد بھول کر بھی چارپائی پر نہ لیٹتا مبادا نیند آ جائے اور اجلاس میں شریک ہونے سے رہ جاؤں۔ مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی یارانِ طریقت ٹی ہاؤس میں پہنچ جاتے۔ اجلاس کی سیر حاصل گفت و شنید کے بعد بورڈ روم (وائی ایم سی اے) کی گول میز سے اٹھ کر دوبارہ ٹی ہاؤس میں آ کر ڈیرہ جماتے۔ ہر فرد ایک ایک روپیہ دیتا جس کے عوض ٹی ہاؤس سے ایک ایک چانپ اور ایک پیالی چائے ملتی...... حلقے کے دولخت ہونے تک میرا یہی معمول رہا۔ یہی حلقے کے عروج کا زمانہ تھا۔ حلقہ تو اب بھی قائم ہے، قائم رہے گا، لیکن وہ دور شائد پھر نہ آئے۔

کیا بات تھی حلقے کی! حلقہ ادیبوں کا کلب بھی تھا، نوجوانوں کی درسگاہ اور بزرگانِ ادب کا تدریسی و تعلیمی مرکز بھی۔ مولانا صلاح الدین احمد، عابد علی عابد، عبدالعزیز خالد، حمید احمد خاں، ڈاکٹر سعید اللہ، مختار صدیقی، یوسف ظفر، شوکت تھانوی، پروفیسر محمد عثمان، ملک بشیر الرحمن، حافظ لدھیانوی، احسان دانش، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ڈاکٹر وحید قریشی، صدیق کلیم، مرزا ادیب، ڈاکٹر وزیر آغا، انجم رومانی، امجد اسلام امجد، امجد الطاف، عارف عبدالمتین، سعادت حسن منٹو، غلام عباس، رضی ترمذی، اعجاز بٹالوی، شاد امرتسری، نسیم محمود، شیر محمد اختر، ضیاء جالندھری، محمود نظامی، ریاض احمد، شہزاد احمد، احمد مشتاق، انتظار حسین، اشفاق احمد، عبادت بریلوی، وقار عظیم، ڈاکٹر یامین، صلاح الدین اکبر، غلام رسول ازہر، وجیہ الدین احمد، طفیل دارا، شیخ سعید، باقر رضوی...... کس کس کا نام لوں۔ ستاروں کی کیسی درخشاں کہکشاں جلوہ گر ہوتی تھی۔ سبھی نے حلقے کے جلسوں سے استفادہ کیا۔ یہاں ہر ایک کے لئے علاج تنگیٔ داماں تھا۔ مجھ پر حلقے کا بڑا احسان ہے جب بھی نئے دو ماہی پروگرام کے لئے یارانِ نکتہ داں کو صلائے عام دی جاتی، میں ضرور افسانے، ڈرامے یا مقالے کے لئے نام لکھواتا، اگر یہ کہوں کہ حلقے کے دولخت ہونے سے قبل میری کنٹری بیوشن سب سے زیادہ تھی تو اس میں مبالغہ نہ ہوگا۔ شروع ہی سے علم و ادب میرا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ پابندیٔ وقت سے لکھتا پڑھتا رہتا ہوں، یہی معمول تھا، یہی معمول ہے۔

کھنچائی تو کبھی نہیں ہوئی بخل کی شکایت ضرور رہی۔ میری کسی سے چشمک تو نہ تھی، پھر بھی مرنجاں مرنج ہونے اور دھڑہ بندی سے الگ تھلگ رہنے پر میرے افسانوی، ڈراموں اور مقالوں پر یار لوگ بڑے نپے تلے انداز میں تعریف کرتے۔ پھر جب اکیلے میں ملتے تو کھل کر تعریف کرتے۔

میرا تو سارا سرمایہ حلقے کی نذر تھا۔ اس کے جلسوں میں میں نے تپلی جان، گشتی، خلاء، جبرو (ڈراما)، ڈرامے کی ابتداء، سوفوکلیز، یونان کا تھیٹر، اولمپک کھیل، بالا خانہ، یونان کا عہدِ جاہلیت اور دیو مالا کا ارتقاء...... سبھی کچھ یہیں پڑھا۔ کس قدر مہذب، علم پرور اور بردبار تھے سامعین! میری بعض بعض چیزیں ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے کی ہوتیں۔ حلقے کے پروگرام میں یہ ہدایت معمولاً درج ہوتی کہ مقالہ پینتالیس منٹ سے زائد کا نہ ہو، اربابِ ذوق بڑا حوصلہ رکھتے۔ خاموشی سے میری طویل تحریریں سنتے۔

اہلِ حلقہ یقیناً مہذب اور کلچرڈ تھے لیکن کبھی کبھار گرمی محفل کا سامان پیدا ہو جاتا۔ ایک مرتبہ شرکائے جلسہ بحث کر رہے تھے۔ غلام رسول ازہر نے بھی اظہار خیال کیا۔ بات الجھ گئی۔ ازہر نے کہیں کہہ دیا............

I DON'T BELONG TO YOUR CLASS

اس پر سب کے کان کھڑے ہوئے۔ سیاق وسباق کے بغیر جملہ واضح تھا۔ ضیاء جالندھری جلال میں آگئے۔ انہوں نے خاصی لمبی تقریر جھاڑ دی۔ ازہر نے ازراہِ وضاحت کہا کہ ان کے جملے کا غلط مطلب لیا گیا، وہ تو صرف یہ جتا رہے تھے کہ وہ ہمہ وقتی ادیب نہیں۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ادب سے رجوع کرتے ہیں۔ ان کا پیشہ عدالتی سرگرمی ہے۔

یہ بات درست تھی۔ ان کی ملازمت اور مصروفیت میں ادبی مشغلے کے لئے گنجائش ہی نہ تھی تاہم بعدازاں وہ اعلیٰ پائے کے شاعر اور نثر نگار کے طور پر میدانِ ادب میں رونما ہوئے۔

اسی طرح منیر نیازی اور شاد امرتسری بھی اپنے اپنے کسی حریف سے الجھے۔

بہرحال یہ اکادکا واقعات حلقے کے ادب پرور ماحول اور رویے پر چنداں اثرانداز نہ ہوئے۔

ہم نے حلقے میں رہ کر جو ادبی ایکسرسائز کی اس سے ہم میں اعتماد راسخ ہوا۔ تنقید کا سلیقہ آیا اور علمی وفنی معلومات میں اضافہ ہوا۔ ہم پر حلقے کا قرض ہے جسے ہمیں بطور فرض ادا کرنا ہے۔ ہم آخر دم تک محنت اور ریاضت کریں۔ ادب کو ایک زندہ و پائندہ قدر کے طور پر اپنائیں، اسے زندگی سے وابستہ رکھیں اور کتب و رسائل کے ذریعے صحیح راہ اختیار کریں۔

وزیر آغا لاہور آتے رہتے ہیں۔ آپ کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ آپ حضرات نے پل پاٹ دیا ہے لاہور اور سرگودھا کے درمیان۔ مجھے تو وزیر آغا اور آپ لاہوری لگتے ہیں۔ ان سے سلام کہیے! لاہور آیئے اور جلد آیئے! غیر حاضری خاصی طویل ہوگئی ہے۔

والسلام

خیر طلب

رحمان مذنب

....

لاہور...... 13 اگست 1982ء

برادرم انور سدید، سلام مسنون!

مزاج گرامی!

آپ کو تو لاہور آنے کی فرصت ہی نہیں، ہم ہیں کہ ہر وقت اس انتظار میں رہتے ہیں کہ آپ آئیں، آپ سے باتیں ہوں، علم و ادب کی اور ساتھ ساتھ بے شک انہار کی باتیں ہوں۔ واپڈا کے تعلق سے مجھے انہار، دریا، سمندر اور ہر نوع کی آبی شاہراہوں سے دلچسپی ہے۔ ماہنامہ ''برقاب'' کی ادارت سے مجھے آبیات (ہائیڈرولوجی)، آب رواں (ہائیڈرالکس)، کوہستانی بند، میدانی بند اور کتنے ہی دیگر امور سے شناسائی بلکہ گہرے شغف کا موقع ملا ہے۔ ہم میں ادب کے پہلو بہ پہلو انہار کا موضوع بھی قدر مشترک ہے۔

لاہور کی فضا میں خاصی گرمی یعنی سرگرمی نظر آنے لگی ہے، قیوم نظر اور امجد الطاف کے ہاتھوں میں چپو ہیں اور کشتی بڑی خوش اسلوبی سے چل رہی ہے۔ میں حسب معمول پورے خلوص اور باقاعدگی سے اس کے ہفت روزہ جلسوں میں حصہ لے رہا ہوں۔ صورت وہی وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے بورڈ روم والی ہے۔ عید ہو، بقر عید ہو، روزے ہوں، حلقے کا جلسہ MISS نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا مقالہ کلچر ہیرو نہایت پر مغز تھا۔ کچھ لوگ ان کے خلاف ہیں۔ شائد یہ خائف ہیں، وزیر آغا کام کرتے ہیں، پڑھتے ہیں، لکھتے ہیں۔ یہ لوگ پڑھتے اور لکھتے کم ہیں، شور بہت مچاتے ہیں، لابی بنا کر آتے ہیں، میری صدارت تھی، میں نے پوری طرح انہیں بپھرنے سے روکا۔ سراج منیر کو کچھ زیادہ ہی بولنے کی لت پڑی ہے۔ انہوں نے بلاوجہ ٹانگ اڑائی حالانکہ انہیں سوشل انتھروپولوجی سے کوئی واسطہ نہیں، حافظہ عمدہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیال سنگھ پبلک لائبریری میں کتابوں کی جو فہرستیں اور تنقیدی رسالے آتے ہیں، انہیں پڑھتے رہتے ہیں اور کتابوں کے نام ذہن میں رکھ لیتے ہیں۔ پھر بحث میں شریک ہو کر ان کا حوالہ بے تکان دیتے ہیں، موضوع سے تعلق ہو نہ ہو، وہ اپنا کام کرتے جاتے ہیں۔ وزیر آغا کے مقالے کے سلسلے میں بھی انہوں نے یہی کچھ کیا۔ درجن بھر کتابوں کے نام لے دیئے۔

انہوں نے جب ارون گھوش کی کتاب The Danceing of Shiva کا حوالہ دیا تو میں نے انہیں پکڑ لیا۔ یہ کتاب میں نے پڑھی تھی، چنانچہ صدارتی تقریر میں میں نے بالتفصیل بتایا کہ ارون گھوش کی کتاب کا نام صرف The Dancing of Shiva نہیں بلکہ And Tales of India بھی ہے۔ لفظ Tales سے کتاب کا موضوع واضح ہے۔ سراج منیر نے کتاب پڑھی ہوتی تو یہاں اس کا ذکر نہ کرتے۔ اس کتاب کا حوالہ دے کر انہوں نے اپنے باقی حوالے بھی مشکوک کر دیئے ہیں۔ محولہ بالا کتاب میں بھارت کی دیو مالا، مہاتما بدھ، اکبر اور بیر بل کی کہانیاں یکجا کی گئی ہیں، لوک کہانیاں بھی دی گئی ہیں۔ یہ کوئی تحقیقی کام نہیں۔ یہ کہانیاں لوگوں کو لطف اندوز ہونے لئے لکھی گئی ہیں۔ گھوش نے کلچر ہیرو کے تصور پر مقالہ نہیں لکھا۔ کہانیاں ہلکے پھلکے انداز کی ہیں۔ شطرنج کی ایجاد کا فسانہ بھی شاملِ کتاب ہے۔ اکبر جسے Great Mughal Emperor کہا ہے، اس کا بھی مذاق اڑایا ہے اور بیر بل کو دانشور ثابت کیا ہے۔ کلچر ہیرو کے باب میں اس کتاب کا نام لینا، ایک بھونڈا مذاق تھا۔ سراج منیر ہمہ دانی کا شوق پورا کرنے کی نیت سے غلط سلط حوالے دیا کرتے ہیں۔ پکڑے بھی جاتے ہیں لیکن اپنی اصلاح کرتے ہیں نہ رویہ بدلتے ہیں۔ قبل ازیں ایک اور موقع پر جب میں نے ڈاکٹر جے۔ این فرکوہر کی کتاب The Religious Quest of India کے کسی بات کا حوالہ دیا تو انہوں نے کتاب کے بارے میں کچھ نہ کہا کیونکہ میں نے یہ کتاب پڑھی تھی۔ انہیں کتاب تو کیا، ڈاکٹر فرکوہر کے بارے میں بھی کچھ علم نہ تھا۔ فوراً بول اٹھے، ڈاکٹر کوئی معروف اور معتبر رائٹر نہیں۔ کیسے کیسے لوگ علم وادب کی دکان چمکانے، اپنا امیج بنانے اور شہرت پانے کے لئے کیسے کیسے حربے برتتے ہیں۔ میں جب ڈاکٹر وزیر آغا کا موازنہ ان لوگوں سے کرتا ہوں تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا رواں صدی کے بلند پایہ سکالر، شاعر اور ادیب ہیں۔ مجھے خوب علم ہے کہ وہ پوری سنجیدگی سے کام کرتے ہیں اور ان اصول وضوابط کے پوری طرح پابند ہیں جو اعلیٰ درجے کی تحقیق اور تخلیق کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ وہ بکثرت مطالعہ کرتے ہیں، بکثرت سوچتے ہیں اور بکثرت لکھتے ہیں، بے پر

کی نہیں اڑاتے۔ جھوٹی شہرت کی تمنا نہیں رکھتے۔ یہ طرزِ عمل نہایت دشوار ہے۔ بڑا پتہ مارنا پڑتا ہے۔ پودا خونِ جگر مانتا ہے۔ اسی سے سینچیں تو پودا تناور ہوتا اور اچھا پھل دیتا ہے۔ یہ کام ہلاکت آفریں ہے۔

آپ کیا کررہے ہیں، افسانہ نویسی کا شوق کس نہج پر ہے؟

خیر طلب

رحمان مذنب

....

(رحمان مذنب بنام نورالحسن ہاشمی)

پرانا قلعہ، بھوپال

محترمی ہاشمی صاحب! سلام مسنون،

بھوپال سے جانے کے بعد آپ کا کوئی خیریت نامہ موصول نہیں ہوا، اور افسوس کہ اب تک میں بھی خط بھیجنے سے معذور رہا۔ میں نے آپ کے جانے کے فوراً بعد ترجمہ کے لئے وہ اخبارات تلاش کئے جن میں 'بیورج کا تعمیر یہ' شائع ہوا تھا اور جنھیں میں نے بڑی حفاظت سے کہیں رکھا تھا، لیکن مجھے ان کا نشان تک نہ ملا اور تین بار کوشش کرنے کے باوجود میں ناکام رہا۔ مجبوراً میں نے دارالمطالعہ کا رخ کیا، کسی قدر وقت سے پرچے دستیاب ہو گئے اور 'شکر الحمدللہ' ترجمہ بھی ہو گیا۔ آپ جب چاہیں، طلب کر سکتے ہیں۔ میں آج اسے صاف کر رہا ہوں، امید ہے کل تک ختم ہو جائے گا۔ اس کے لئے مجھے دو روز کی تعطیل لینی پڑی۔ خیر، کام تمام ہوا۔ اگر بیورج کی رپورٹ دہلی کے کسی کتب فروش سے دستیاب ہو سکے تو مجھے بہ صیغہ فوری بھیج دیجئے۔ میں ضروری حواشی لکھ سکوں گا۔ رپورٹ کا نام ''2SR.Gov'' ہے۔

آپ کے پروگرام کا صفحہ ۱۲: ترجمہ Sher Shah؛ تاریخ ہند ۔ مسلمانوں کا زمانہ

آپ کے پروگرام کا صفحہ ۱۴: پانچوں ترجمے بالخصوص Fascism اوسط استعداد کی کتابیں (۱) اشتراکیت، (۵) فایت

آپ کے پروگرام کا صفحہ ۱۸: قیمتوں کا اتار چڑھاؤ

آپ کے پروگرام کا صفحہ ۱۹: ترجمہ Emile؛ ترجمہ Democracy & Education

آپ کے پروگرام کا صفحہ ۲۰: مدرسے کا انتظام

آپ کے پروگرام کا صفحہ ۲۴/۲۳: بچوں کے لئے ڈرامے۔؛ انتخاب نظم ونثر؛ تاریخ ہند

آپ کے پروگرام کا صفحہ ۲۶/۲۷: ہمارا جسم؛ ہماری صحت؛ معلوماتِ عامہ؛ درسی کتابیں

براہ کرم اپنی رائے سے آگاہ کیجئے کہ میں اس خاکے کو کس حد تک عمل میں لاسکتا ہوں اور کیا یہ کلی یا جزئی طور سے ہنوز عمل میں تو نہیں لایا گیا؟ آپ کی رائے اور آپ کے مشورے کے بعد میں چاہوں گا کہ وقت کا تعین کیا جائے اور اس خاکے کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری مجھے سونپی جائے۔ اگر باہم میں کسی طرح کی شرائط کی تکمیل واجبی ہو تو وہ بھی صائب ہے، میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔

''بیورج کا تعمیر یہ'' چھپنے کے بعد میں جامعہ کے لئے یا تو جمہوریت کے متعلق کچھ لکھوں گا اور یا پھر چین کے وزیرِ خارجہ ڈاکٹر ٹی۔ وی۔ سونگ کے تازہ لندنی نشریے کا ترجمہ پیش کروں گا جس کا عنوان 'چین کا تعمیر یہ اور جنگ'' ہو سکتا ہے۔

کیا آپ عنقریب بھوپال آرہے ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو نیچے لکھی ہوئی چند کتابیں ہمراہ لے آئیے گا، ورنہ بہ صورت دیگر ڈاک سے بھجوا دیجئے گا۔ شکریہ ہوگا:

معاہدہ عمرانی۔ محکومیتِ نسواں۔ مبادی سیاسیات۔ یورپ کی حکومتیں۔ بنیادی قومی تعلیم کا نصاب۔ مسلمانوں کی آئندہ تعلیم، حیاتِ حافظ، اسلام اور موجودہ مدنی مسائل۔

حضرت سہا کا مالوہ نمبر ہنوز منظرِ عام پر نہیں آیا۔ مکرم مزمل صاحب کی نظمیں جوں کی توں رکھی ہیں۔ غالباً یہ نمبر فروری میں شائع ہوگا۔ حضرت سہا سے پچھلی مرتبہ کی ملاقات سے یہی مترشح ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ بھی جامعہ کا کوئی اسی شکل کا نمبر نکالیں۔ یہ مروجہ نمبرات کافی مفید اور مقبول ہوتے ہیں۔ جامعہ کے مقاصد کے اعتبار سے اقتصادی نمبر، جنگی نمبر، تعلیمی نمبر،

اشتراکی نمبر، جمہوری نمبر وغیرہ تجویز کرتا ہوں۔ اگر آپ صاد کریں تو میں اسے کامیاب بنانے کے لئے کافی طور سے قلمی معاونت کا اقرار کرتا ہوں۔

اپنی خیریت سے بواپسی ڈاک مطلع فرمائیے!

اپنی خیریت سے بواپسی ڈاک مطلع فرمائیے!

فوری جواب کا طالب

اور

آپ کا خیر طلب

رحمن مذنب

۲۰ دسمبر ۱۹۴۳ء

........................o........................

مطبوعاتِ رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ

شائع شدہ

خوشبودار عورتیں	(افسانے)	رحمان مذنب
پتلی جان	(افسانے)	"
بالاخانہ	(افسانے)	"
پنجرے کے پنچھی	(افسانے)	"
رام پیاری	(افسانے)	"
باسی گلی	(ناول)	"
گلبدن	(ناول)	"
تجھے ہم ولی سمجھتے (رحمان مذنب۔ شخصیت وفن)	ترتیب: ڈاکٹر انور سدید	
مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے	(ترجمہ) انعام یافتہ	رحمان مذنب
دینِ ساحری، دیو مالا اور اسلام		"
جادو اور جادو کی رسمیں (دینِ ساحری)		"
ڈرامے اور تھیٹر کی عالمی تاریخ	(مقالے)	"

زیر اشاعت

محمد ﷺ	(سیرتِ رسولؐ)	رحمان مذنب
بلالؓ	(ترجمہ وتحشیہ)	"
گوری گلاباں	(ناول)	"
بوطیقا	(پنجابی ترجمہ)	"
بلھے شاہ اور اس کا نظریۂ تصوف		"
کانچ کے پتلے	(ڈرامے)	"
شعری مجموعہ		"

حصہ پنجم

THEY ARE TURNING LITERATURE INTO WASTELAND

SAY'S "REHMAN MUZNIB"

(Interview by Saeed Badar)

S.B. Mr. Rehman Muznib: You belong to a family of religious scholars like Shams Ul Ulema Prof. Muftee Muhammad Abdullah Tonki of Oriental College, Muftee Anwarul Haq, compiler of Nuskha-i-Hamidia and Muftee Muhammad Abdus Sattar. Muftee of Shahi Mosque. Well, how is it that you discarded your family traditions and chose to write short stories. So much so that you based most of these stories on the lewd life of prostitutes and "Putlijan", "Gashti", "Balouri Bulbul" and "Bala Khana" are glaring examples in this respect. Could you justify your behaviour and give the causes of the revolt.

R.M. Well! Call it a revolt, if you so like but it was something natural. Look at the environments of my habitat. In the close vicinity was the most flourishing trade centre of the prostitutes. The society had been kind enough to develop and preserve it. Isn't it a joke that HEERA MANDI was and still is surrounded by one dozen mosques including the most famous Shahi Masjid alongwith two "Mazars" and a pretty old institute of Theology known as "Madrasa Numania". How could I shut my eyes from what happened day and night before me so glaringly? Everything went on unchecked: the dazzling light of the bazaar attracted dare devils from far and near. The pious and the God fearing would do nothing to solve the problem facing them. In order to save their skins they would pass through the sex charged streets with their heads bowed down. So I was obliged to expose what I saw

and brought into light the environments that prevailed there. The smiling "BALA KHANAS" of gay girls and the dark dungeons of "TAKYA-EES" opened my eyes. This wonderful world laid a few paces from my house. So I gained first hand knowledge so important and unique from a creative writer's viewpoint. I was recklessly thrown into this fatherless sea. These environments led me naturally to write short stories based on the most realistic experience and thus compiled a literary history of prostitutes at work during a span of 75 years. Won't you give me credit for this venture? I added a new dimension to fiction powerfully and completely. I must mention here that prostitutes are a dominant feature of my stories but that is not all. I brought others too within the orbit of my observation and experience. "Phool Sa-een", "Phirkee", "Ram Pyaree" and "Qaisran" are some of the examples to enrich the balance sheet. Moreover my third collection entitled "Ram Pyaree" is devoted to most inspiring adventure of 'Mujahideen'.

S.B. That is all as far as fiction is concerned. You have yet to tell why didn't you acquire your elders' knowledge, which was so easily and conveniently available and accessible to you?

R.M. You may call it my negligence but I frankly tell you that I was destined to fall victim to the enchantress circle which was dancing and singing day and night in the pious vicinity of my home. Thus I was disturbed and became restless particularly after the death of my father in 1937. Yet his guiding spirit lived with me and is still alive. The knowledge I acquired in his company is still my valuable asset. I started studing Social Anthropology right from 1954 to-date and tried to make up the loss. I planned to write few

books on the subject of Islam and pre-Islamic religions for comparative study. Two of my books "Deen-i-Sahiree" and "Islam Aur Jadugari" are there in the market. The former has been republished.

S.B. That will do. Let me take another point. You have given rise to a controversy by declaring that you are greater than manto as a short story writer. How do you justify your claim?

R.M. It is not a bluff. It is a well thought and well considered declaration based on realities. It is not only due to the novel experience gained from the gay girls society but due to a number of other artistic features and values that go to make more than a dozen of my short stories greater than our story writers' masterpieces including Manto. Is it not roguish that a section of critics has been purposely ignoring me or criticizing me baselessly. They are money gatherers and belong to a party meant for selfish ends. THEY ARE TURNING LITERATURE INTO WASTELAND. These bogus critics have their own axe to grined and are striving to build a SHEESH MAHAL for themselves and their stooges. They have their own pygmies to boost. My position is clear beyond doubt. My books are there in the market. Why don't these Lilliputians read "Pulti Jan", "Ram Pyaree" and "Bala Khana" and stop making sweeping and foolish statements with their eyes blindfolded. Unfortunately, they are devoid of creative genius, vision and sense of justice. Nobody can become a critic without these qualities. Let there be no trade unionism and party politics in the field of literature. Posterity will give no credit to horse traders. A real great writer cares for lasting gains and artistic values. He is never short-sighted.

S.B. Do you think that Manto was short-sighted and didn't care for lasting gains and left nothing for posterity?

R.M. Manto's case is complicated. He was the bitter most satirist. Some of his short stories particularly, "Thanda Gosht" and "Khol Do" were censoriously critical. Surfacial or limited experience would do in his case. He could be inspired even by a news item found in a paper or a rumour heard from someone. He was in hurry to write a short story and get remuneration. The ill-fated Manto when came of age and had the chances of going up to sublimity he madly worshipped the Dionysian cup and been in that in the most ruinous manner without enjoying the Baochic Frenzy. The cup cruelly destroyed the lives of so many important persons like Akhtar Sheerani, Haji Luk Luk, Abid Ali Abid, Shad Ameritsari and Iqbal Sajid disallowing them to complete their literary career. Manto wasn't an exception to the rule. The time became hard and Manto had to bear hard-ships. He had to spend a good deal of time in procuring money for a bottle of liquor and then suffering meaningless ecstasy. He neither became a mystic nor a lover of an enchantress and thus failed to gather invaluable material catering to the need of his artistic talent. The caustic "Lazzat-i-Sang" changed into "Lazzat-i-Marg". This was extremely tragic. Money hunt for the Dionysian creed made his life bitter and cut short his successful career.

S.B. What difference do you find between yourself and the young story-writers of this age?

R.M. There is a great difference rather an unbridgeable generation gap between the seniors and the juniors __ so valuable young blood of the present times. The shape of

things and the viewers angle both have changed thereby social and moral values alongwith sensibilities have been horribly affected. Old ecology has been cleverly and cunningly displaced by the internal and external forces of the present age. The environmental conditions now are unhealthy and have become a hurdle in the way of our young writers. During the hey day of my life, some fifty or sixty years ago when part from the curse of slavery, the things were so calm and quiet that a writer could find a lot of time to devote in reading and writing. Education was essential and had an intrinsic value. I could easily spend long hours sitting on a rough mat surrounded by the gracious Muses. Everyone spent his life in the sphere evolved by his fate. Lust for money was rare. There was no gold rush. Writers, generally speaking were not after money. They enjoyed peace of mind and had to be content with their limited economic resources. It was dominantly the age of DERVISHES following ambitiously their literary pursuits. Stalwarts could be found in all walks of life. Allama Iqbal, a unique intellectual, a thinker and the most enlightened revivalist of this age was found speaking most courageously against colonialism, rotten traditions and misled society. There is an other range of writers and scholars like Shams-ul-Ulema Prof. Muftee Muhammad Abdullah Tonki, Moulvi Muhammad Shafi, Prof Mahmood Sheerani, Moulana Tajwar Najeeb Abadi, Professor Abid Ali Abid, Saiyid Talha, Dr Saiyid Abdullah. Pjrof S.A. Bukhari, Abdur Rahman Chughtai, Hameed Nizami, Hamid Jalal, Dr. M.D. Taseer, Faiz Ahmed Faiz, Meem Sheen Late Muhammad Shafi, Prof Dil Muhammad, Maulana Salahud Din Ahmed, Prof Ilmud Din Malik, Maulana Abdul Majid Salik, Moulana Ghulam Rasool Mehr, Maulana Zafar Ali Khan and a galaxy of a large number of other eminent writers and scholors of the old school which no more exists.

Some eminent writers of the old school like Abdul Aziz Khalid. Dr. Waheed Qureshi, Ghulam Rasool Azhar and Meem Sheen are still alive (may they live long). And affluent stream of knowledge, art and literature flew freely day and night. The shops and stalls were laiden with books on all subjects. Prices were low and even people with meager means like me could buy looks of their choice. Some forty years back Gorky, Hardy, Galsworthy, Maupassant, Balzac, Marlow, Moore, Tchekhov, Swift, Gilbert, Huxley, Webster Hutton, Sheldon Cheney and so many others were easily accessible to the students of art and science. Can you imagine that even in 1954 the illustrious Webster Dictionary comprising 1209 pages was priced at Rs.37/8. Frazer's Golden Bough at Rs. 20/-. Dr. Budge's "Book of the Dead" containing hundreds of rare illustrations taken from the Papyrus rolls at Rs. 30/-. Even the great anthropologist of [illegible] century Miss Jane Ellen Harrison's 13 years research work without a parallel in Social Anthropology entitled "Prolegomena to the Sfudy of Greek Religion" comprising hundreds of pages and most profusely illustrated was priced at about Rs.20/- Dr. Budge's 'OSIRIS' at Rs. 75/-. You would be astonished to see the size and the finances of this luxurious book so lavishly ornamented with illustrations. Its rare illustrations were also taken like 'The Book of the Dead' from the papyrus rolls. The work of the Greek giants like, Ayschylus, Aristophanes, Homer, Sophocles and Heradotus could be had for less than Rs 5/- each. Dr. Hittl's translation of Baladhuri comprising more than 500 pages of thick craft paper for Rs.10/50 and then look at Daniel Jones "English Pronouncing Dictionary" comprising about 500 pages priced at Rs.6/-. This all happened in a dreamland which has vanished. We are now marching towards the 21st century and Ibn-e-Batuta's Travels in Asia and Africa contained in

337 pages cost us Rs.150/- The book has no illustrations accept one on the title page.

The new age affluent with dollars and Americanism has wiped off the old society with it's healthy ecology and good traditions, fine tastes and liking. A writer of today, generally speaking hardly finds good looks and time for reading and writing. During the last four decades our social values deteriorated a great deal and has given rise to undesirable mentality with the result that book mania exists no more. Everyone is running after money. A brutal stamped is killing the new generation morally and socially. I admit that we are not devoid of genuine artists particularly writers but the time is less favourable to them than it was before. No doubt a few writers of the new generation like Saleem Agha (a really brilliant short story writer among the juniors), who are well placed and are free from financial anxieties can devote time to serve the cause of literature if they work hard. I would be the last man to blame the writers for their lack of interest in reading and writing. The real culprit is the prevalent mode of democracy which gives free hand to the Westernized type of Industrial Revolution with all its alien trappings and sexy showbiz aided by the WADERAISM which goes on with dirty game rules. The rulers who have made our life miserable and meaningless hate the spread of education and enlightenment. They prefer that we should be thrown into the Dark Ages (pre-renaissance period of Europe).

S.B. Some of your plays were published in the defunct magzine "Humanyun" there during your early career. You continued writing plays but during the forties you began to write short stories. Was this diversion due to artistic reasons?

R. M.   My literary career would show that I started with poetry and prose writing. Play writing was added after sometime. During the later forties my mental attitude compelled me to write short stories. But it was at the expense of poetry. I emerged as prose writer in 1931 when I was ninth class student in the Central Model School. I practiced the art of essay writing (Jawab Mazmoon) for full two years under the beneficent guidance of our kind and conscientious teacher Maulvi Imam ud Din. The valuable practice gave me practically command over expression and helped me shape my style. Alongwith this my intellectual base was formed dexterity under the invaluable guidance of my worthy father Muftee Muhammad Abdus Sattar of the Shahi Masjid. In 1932 I started writing regularly poetry, drama and film reviews for various magazines. In 1934 my drama entitled "Jahan Ara" was enacted on the stage of Aziz Theatre now known as 'Pakistan Talkies! In 1938 my play 'Sipahee' appeared in the monthly "Humayun" financed by Mian Bashir Ahmad and edited with dexterity by Hamid Ali Khan . It was Hamid Ali Khan who encouraged me and appreciated my literary efforts and gave me impetus for play writing. I found my way to All India Radio in about 1940. I had been content with my contribution to magazines and Radio. Then occurred a great revolution in the electronic media. T.V appeared as threat to Radio and Film. My vast experience of play writing for Radio helped me in writing for the T.V. My first play on the T.V. was "Gunjal" in Punjabi. Thereafter I was called upon to write a series for children entitled Alaf Laila. It was a successful attempt with about 16 or 17 plays to my credit. The series was followed by a very popular serial "Pattan" in Punjabi with 26 episodes. Pattan was recommended for 3 awards for the writer, the producer and the actor. Thereafter I wrote two more serials entitled

"Tikone" in Urdu and "Vehra" in Punjabi. Vehra was adjudged the best Punjabi serial of the year by the Graduates Award Organization. In the meantime I was advised by one of my dear most friends Ahmed Shujah Pasha to pay heed to my manuscripts lying un-published in the cupboards. I accepted the advice and directed my attention to get my neglected manuscripts published. Maqbool Academy and Mah-e-Adab of Urdu Bazar and "Jung Publishers" came to my rescue. In the span of a few months "Putli Jan", "Ram Pyari", "Bala Khan", "Deen-e-Sahree", "Lawrence Sey Mata Hari Tak", "Islam Aur Jadugari" and "Islam Aur Tahzeeb-u-Tamuddun", saw their way from my dusty shelves to the clean book stalls. I am now engaged in compiling two volumes of my short stories entitled "Farangan" and "Khushboodar Auratain". Hundreds of my plays, poems, travelogues, novels, and an autobiography lie un-edited. Huge work lies ahead. I humbly implore the Almighty God's help. I am nothing, nothing at all. He is the sole fountain of life and energy. His Prophet Muhammad (PBUH) is also the great source of inspiration and beneficiation. May Allah and His Prophet bestow beneficence on me and enable me to accomplish my un-finished work.

S. B. Would it not be appropriate if you tell me out your achievements during the last sixty years in the field of literature and knowledge?

R.M. I am a humble man. What-ever I have achieved or done in the field of literature and knowledge is entirely due to the grace of God. I once again say I am nothing, nothing at all. My early twenty-two years of life were dominated and engineered by my grandfather, the great Muftee Muhammad Abdullah Tonki and my father. I have two qualities by nature;

I am impatient in the pursuit of knowledge and patient in reaching the point of satiability. Thereafter comes the most difficult task of transferring it to others. I spent a number of years in studying Social Anthropology with reference to Magic with its branches (Mythology, Solar and Fertility cults, Ritual, Shaman's practices, charms, amulets and incantations) and evaluating its impact on the social, cultural and scientific aspects of human life. After studying the subject to my satisfaction or capacity I found myself very impatient to impart my knowledge to others. It was not only a pretty lengthy but a very difficult job due to accuracy and punctiliousness it demanded. I had to be patient and meticulous. Slowly and steadily I discharged my duties and wrote about a dozen articles on the subject covering only a small portion of it. Magic is a vast subject and is difficult to grasp. It spread it's tentacles over ten thousand years in the past. In order to estimate the vastness and difficulties of the subject, just take the example of the great Anthropologist Miss Jane Ellen Harrison who took thirteen years working day and night in discovering the ancient Greece of pre Akaen era. Before writing her masterpiece "Prolegomena to the Study of Greek Religion" she had been regularly reading, writing and teaching the subject most zealously and seriously. I started my magical journey in 1954, I am still on my way to an endless goal. During this period I wrote research articles in Urdu like "Dawn of Drama" (published in the quarterly 'Iqbal' dated Oct 57), "The Age of Ignorance In Greece" and the "Development of Mythology" (Iqbal, dated Oct 57). My two books "Islam and Jadugari", published by Maqbool Academy and "Deen-i-Sahree" published by "Mah-i-Adb", Urdu Bazar, are available in the market. Another subject which struck my fancy is Ecology. My article "Wadi-i-Sindh Aur Us Ka Mahaul" won the first prize in an

open competition held by the Pakistan Science Foundation. I also wrote a few articles from the ecological viewpoint . elaborating the Quranic verse for different magazines.

Besides Magic and Ecology I am interested in drama and its history. I translated Aristotle's Poetics in Punjabi published by the Punjabi Adabi Board, wrote articles on "Sophocles" and "Yunan Ka Theatre" published in the Quarterly 'Iqbal' dated Oct 1959 and 60 respectively. The life of the Holy Prophet (PBUH) regains supreme in my study. I have a well thought plan to write on one of the most important and fascinating aspects of his life. My two articles in this respect (Ghazwa-e-Badr and Ghazwa-e-Tabook) already appeared in two magazines. I fervently seek God's help in the completion of this so important and dear most work of mine. I have written so far over 50 books on various subjects including literature. Some books are meant for children too. A book covering 78 years of my life spent in Lahore, my birthplace is also included in my future ventures. A few articles relating to this subject have already appeared in different magazines. Another voluminous book is also in my view. Besides containing articles on different subjects it will deal with the dispute between Mantoo and myself touching my claim of supremacy over the former. The manuscripts of three novels also need revision before I hand them over to my publisher. Once again I pray to the Almighty Allah to extend help to his humble ___ servant Rehman Muznib___ Allah Ka Gunahgar Banda as translated by Ghulam-us-Saqlain Naqvi.

Published in daily "Pakistan Times" January 7, 1994

نام.......... مفتی عزیز الرحمان قلمی نام.......... رحمان مذنب

پیدائش.......... لاہور، ۱۵ جنوری ۱۹۱۵ء علماء کے گھرانے میں شاہی مسجد اور شاہی محلے کی حدود میں شعور کی آنکھ کھولی، ہوش سنبھالا، زندگی کا بیشتر حصہ یہیں گزارا اور سیاہ سفید کے جلوے یہاں دیکھے۔

ابتدائی تعلیم.......... ابتدائی تعلیم لاہور میں پائی۔ میٹرک سنٹرل ماڈل ہائی سکول لاہور سے ۱۹۳۳ء میں کیا۔ انٹر اسلامیہ کالج، سول لائنز لاہور سے کر کے دیال سنگھ کالج میں بی اے میں داخلہ لے لیا لیکن تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور اپنے والد مفتی عبدالستار کے زیرِ نگرانی بادشاہی مسجد لاہور کے دار الفتاویٰ میں دینی تعلیم حاصل کرتے رہے۔

مختصر حالاتِ زندگی.......... رحمان مذنب کی جائے پیدائش لاہور کے ٹکسالی دروازہ کی اونچی مسجد سے ملحقہ مکان تھا۔ آپ کے والد شاہی مسجد لاہور کے دار الفتاویٰ کے مفتی تھے اور لاہور میں ان کا فتویٰ چلتا تھا۔ مفتی عبدالستار کا بیشتر وقت فقہی کتب کے مطالعہ، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزرتا۔ رحمان مذنب کے نانا شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی بہت بڑے عالم اور اورینٹل کالج میں عربی ادبیات کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تھے اور ۱۹۰۲ء میں لگ بھگ تیس سال پڑھانے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی چلے گئے۔

کام.......... رحمان مذنب نے اردو ادب کو اعلیٰ پائے کے افسانے، ڈرامے اور مقالے دیئے۔ پنجابی میں بھی بہت کچھ لکھا۔ ''بوطیقا'' کو پنجابی میں منتقل کیا۔ تین درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

موضوعات.......... قرآنیات، سیرت رسولِ مقبول، افسانہ، ڈرامہ، ڈرامے اور تھیٹر کی تاریخ، جنسیات، مصریات، یونانیات، تصوف، شاعری، ماحولیات (اکالوجی) سوشل انتھروپولوجی..........

وفات.......... جب تک حیات رہے، قلم دوات، کتاب اور اللہ کے بندوں سے یارانہ رہا۔ چلتے پھرتے، لوگوں سے ملتے جلتے اور ان کے دلوں میں گھر کرتے رہے۔ ۱۶ فروری ۲۰۰۰ء گھر کے صحن میں بیٹھے لکھ رہے تھے کہ اچانک داعیٔ اجل نے صدا دی جس پر لبیک کہا اور اس دارِ فانی کو چھوڑ کر دار البقاء کی جانب چل دیے۔

رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ

ISBN No. 969-8694-18-8